فریب
صالح الوردانی
الحق مع علی و علی مع الحق
من کنت مولاه فهذا علی مولاه

ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی کے بعد شیعہ ہونیوالے مصری دانشور

صالح الوردانی ـــــــــ کی چشم کشا کتاب

فریب

ترجمہ: محمد حسن جعفری

نظرثانی: رضا حسین رضوانی

مجمع علمی اسلامی پاکستان

خُطبۃُ الکتاب

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ. اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ. اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ. وَصَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ. اَلَّذِیْ اَرْسَلْتَہٗ رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ. وَاَنْزَلْتَ عَلَیْہِ کِتَابًا لَّا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ وَسَلِّمْ عَلٰی اَھْلِ بَیْتِہِ الْمُطَھَّرِیْنَ اَلَّذِیْنَ جَعَلْتَ صِرَاطَھُمْ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ.

عناوین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرض مترجم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
وَ اَھْلِ بَیْتِہِ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ○
اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ فِیْ کِتَابِہِ الْمُبِیْنِ وَھُوَ اَصْدَقُ الْقَائِلِیْنَ
اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ. وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا
جَاءَ ھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا بَیْنَھُمْ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیَاتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ○

خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ دین، اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے اور اہل کتاب نے علم آنے کے بعد ہی جھگڑا شروع کیا صرف آپس کی شرارتوں کی بنا پر اور جو بھی آیات الٰہی کا انکار کرے گا تو خدا بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔

قرآن مجید کی یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اصل دین اطاعت الٰہی ہے اور سارے انبیاؑ نے یہی پیغام دیا ہے لہذا سب کا دین اسلام ہے جیسا کہ ایک اور مقام پر فرمان باری تعالیٰ ہے:

شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْھُمْ اِلَیْہِ اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ○ (سورۂ شوریٰ: آیت ۱۳)

اس نے تمہارے لئے دین میں وہ راستا مقرر کیا ہے جس کی نصیحت نوحؑ کو کی ہے اور جس کی وحی پیغمبر تمہاری طرف بھی کی ہے اور جس کی نصیحت ابراہیمؑ، موسیٰ اور عیسیٰؑ کو بھی کی ہے کہ دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ہونے پائے۔ مشرکین کو وہ بات سخت گراں گزرتی ہے جس کی طرف تم انہیں دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جس کو چاہتا ہے تقرب کے لئے چن لیتا ہے۔ جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے وہ اسے اپنی طرف ہدایت دیتا ہے۔

دین اس آخری منزل کا نام ہے جس تک ہر انسان کو پہنچنا چاہئے اور یہ ان بنیادی اصولوں کا نام ہے جن پر سزا و جزا کا فیصلہ رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد اس منزل تک پہنچنے کے لئے مختلف راستے مقرر کئے گئے ہیں جنہیں شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جن کی تعداد پانچ ہے یعنی شریعت نوح، شریعت ابراہیم، شریعت موسیٰ، شریعت عیسیٰ اور شریعت حضرت محمد مصطفیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ان قوانین کے باہمی اختلاف کا فلسفہ یہ ہے کہ زمانے کے تغیر و تبدل اور ارتقاء کے ساتھ جزوی طور پر قوانین کی تبدیلی ناگزیر ہے ورنہ قانون جامد اور بے جان بن کر رہ جائے گا اور زندگی کے مختلف ادوار میں کارآمد نہ رہ سکے گا۔

ہمارے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شریعت ایک گھاٹ کا نام ہے جو دریا کے مدوجزر اور اتار چڑھاؤ کے ساتھ بدلتا رہا ہے ورنہ دین کے بنیادی اصولوں میں نہ توحید میں کوئی فرق آسکتا ہے اور نہ قیامت میں۔ صرف نبوت ہے جس کی تعداد میں دور آدمؑ سے مسلسل اضافہ ہوتا چلا آرہا تھا اور اسی اضافے کی بنیاد پر حالات زمانہ کے تحت جزوی قوانین میں تغیر و تبدل ہوتا رہا۔ دور نوحؑ کی شریعت اور تھی اور مرسل اعظمؐ کا قانون اور ہے۔ مقصد کے اعتبار سے سب متحد ہیں لیکن طریقہ کار کے اعتبار سے اختلاف و تغیر ناگزیر ہے۔

اب یہ ایک مصلحت الٰہی ہے کہ اس نے چار شریعتوں کو لفظ ''وصیت'' سے تعبیر کیا ہے اور شریعت مصطفوی کو لفظ ''وحی'' سے تعبیر کیا ہے جس سے انبیاءؑ کے فرق مراتب پر بھی روشنی پڑتی ہے اور شریعت پیغمبر اسلام کی عمومیت اور جامعیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

الغرض وہ دین جسے تمام انبیاءؑ لائے تھے، وہ حضرت خاتم الانبیاءؐ کے دور مبارک میں کامل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے تکمیل دین کی سند نازل فرمائی اور اس پر اپنی رضا کی مہر ثبت فرمائی۔

رسول اکرمؐ نور نبوت سے جانتے تھے کہ ان کے ماننے والوں میں کئی فرقے اور مذاہب جنم لیں گے اور آپ نے امت اسلامیہ کو انحرافی راستوں سے بچانے کے لئے قرآن و اہلبیت کو اپنا گراں قدر سرمایہ بنا کر چھوڑا اور تمام امت کے افراد کو خبردار کرتے ہوئے فرمایا:

اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَ عِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ. ''میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں اور وہ ہیں اللہ کی کتاب اور میری عترت اہلبیت۔ جب تک تم ان سے وابستہ رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے۔''

نبیؐ محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امت اسلامیہ کی اکثریت نے رکن دوم یعنی اہلبیت سے انحراف کر لیا اور رکن اول میں ایسی من مانی تاویلات کیں کہ قرآن مجید ایک چیستان سا دکھائی دینے لگا اور یوں امت میں تقسیم در تقسیم کا عمل شروع ہوا جو کہ صدیوں سے جاری ہے اور ابھی تک اس پر عمل ہو رہا ہے۔

افراد امت کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ خود ساختہ مذاہب کے پیروکاروں نے رشد و ہدایت کو صرف اپنے فرقے تک محدود کر لیا اور اپنے علاوہ تمام اسلامی فرقوں کو گمراہ اور بدعتی کہا اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ بہتر (۷۲) گروہ تمام تر باہمی اختلافات و تنازعات کے باوجود حریم اہلبیت سے وابستہ رہنے والے گروہ پر شدید نکتہ چینی کرتے ہیں اور انہیں مخالف دین، بدعتی، گمراہ بلکہ کافر تک کہنے سے گریز نہیں کرتے جبکہ اس گروہ کا جرم صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کو کتاب ہدایت اور آل محمدؐ کو وارثان کتاب اور امت کا رہنما تصور کرتے ہیں۔

آپ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ پڑھیں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ ان کے خون سے مقتل رنگین کئے گئے اور ہر دور میں ان سے بدترین سلوک کیا گیا اور اس گروہ کے ائمہ کو قتل کیا گیا۔ زندانوں میں ڈالا گیا اور انہیں زہر سے شہید کیا گیا۔

ان تمام تر مظالم کے باوجود مسلک آل محمدؐ کی پیروی کا سلسلہ نہ تو رکا اور نہ ہی تھما بلکہ ہر دور میں بہت سے صاحبان علم نے گہرے مطالعے اور تحقیق کے بعد اسی مسلک کی حقانیت کو تسلیم کیا۔ موجودہ دور جسے مذہبی تعصب کا بدترین دور کہا جا سکتا ہے، اس پرآشوب دور میں بھی بہت سے خوش نصیب افراد نے اپنی اخروی نجات کے لئے مذہب آل محمدؐ کو قبول کیا جن میں بڑے دانشور اور محقق قسم کے افراد شامل ہیں۔ زیادہ دور نہ جائیں ہم ماضی قریب کے بہت سے

محققین کو جانتے ہیں جنہوں نے اپنے آبائی عقائد کو چھوڑ کر مذہب اہلبیت سے تمسک کا اعلان کیا ان میں محمد تیجانی سماوی تیونسی اور صالح الوردانی مصری کا نام سرفہرست ہے۔

ڈاکٹر تیجانی نے گہری تحقیق کے بعد مسلک اہلبیت کو قبول کیا اور انہوں نے اپنے سفر تشیع کی تفصیل اپنی مشہور کتاب **ثُمَّ اهْتَدَيْتُ** (اردو ترجمہ تجلی) اور **لأكُونَنَّ مَعَ الصَّادِقِينَ** (اردو ترجمہ حکم اذاں) نیز اپنی دوسری کتابوں میں بیان کی اور ہمیں یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ان کی تمام کتابوں کا ترجمہ اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں منظر عام پر آچکا ہے۔

جناب صالح الوردانی مصر کے مشہور شہر قاہرہ میں پیدا ہوئے اور قاہرہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھتے رہے نیز وہ وہاں کی اسلامی تنظیموں سے وابستہ رہے اور اس دوران انہوں نے بہت سی تنظیموں کو بنتے اور ٹوٹتے دیکھا اور ان تنظیموں سے وابستگی کی وجہ سے ان کے دل میں تلاش حق کی جستجو پیدا ہوئی اور اس جستجو میں انہوں نے بہت سی زحمتیں اٹھائیں اور کئی مقامات پر پاؤں میں آبلے پڑے لیکن وہ حضرت سلمان فارسیؓ کی طرح سے تلاش حق میں ثابت قدم رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا کرم کیا اور انہیں حق کا سیدھا راستا مل گیا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا...... (سورۂ عنکبوت: آیت ۱۹) "اور جو ہمارے متعلق جدوجہد کریں گے ہم ضرور انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے۔

چنانچہ صالح الوردانی کے تشیع سے اللہ تعالیٰ کا مذکورہ وعدہ پورا ہوا۔ محترم صالح الوردانی نے اپنے سفر تشیع پر کئی کتابیں تالیف کیں ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

موصوف کی کتاب **خدع** کا ترجمہ جناب جواد مُہری نے فارسی زبان میں فریب کے نام سے کیا ہے اور اس وقت ہم آپ کے سامنے اسی کتاب کا ترجمہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی شان کریمی سے ہمارے ان بے ربط کلمات کو قبول و منظور فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس کتاب سے استفادہ کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ **آمین بجاہ محمد وآلہ الطیبین الطاہرین**

محمد حسن جعفری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

قارئین کرام! میں نے ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی کی بہت سی کتابوں کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے اور انہیں قریب سے بھی دیکھا ہے۔ جب میں ان کی کتاب **ثُمَّ اهْتَدَيْتُ** کا ترجمہ کر رہا تھا اسی دوران میری ان سے ملاقات ہوئی اور میں نے خود ان کی زبانی ان کے سفر تشیع کی داستان سنی۔ مگر کتاب ہذا کے مؤلف جناب صالح الوردانی سے ابھی تک میری کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں نے صرف ان کی چند کتابیں پڑھی ہیں جس میں انہوں نے "مکتب امامت" قبول کرنے کے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اس وقت تک میں انہیں صرف ان کی کتابوں کے حوالے سے ہی جانتا ہوں۔

محترم صالح الوردانی بھی ان ہزاروں خوش نصیب افراد میں سے ہیں جنہوں نے تلاش حق کے لئے بڑی زحمتیں اٹھائیں اور اس کے لئے انہیں ہفتوں اور مہینوں کی بجائے سالہاسال کا طویل سفر کرنا پڑا۔ اس دوران انہوں نے مختلف العقیدہ افراد سے ملاقاتیں کیں اور مختلف قسم کے "ازموں" نے انہیں ساتھ شامل کرنا چاہا مگر وہ اس کے ساتھ تلاش حقیقت میں سرگرداں رہے۔ آخر اللہ تعالیٰ کی عنایت سے وہ جماعت صادقین کے ساتھ وابستہ ہونے میں کامیاب ہوگئے اور یوں حقیقی "اہلسنت" بن گئے۔

محترم صالح الوردانی پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام ہوا جس کی وجہ سے وہ جیسوں

انحرافی راستوں سے گزر کر صراط مستقیم تک آ پہنچے۔ جستجوئے حق کے لئے انہیں کئی بار زندانوں میں بھی جانا پڑا مگر وہاں بھی ان کی شورش کم نہ ہوسکی اور ایک طویل آبلہ پائی کے بعد دوسرے پیروان ولایت کی طرح سے **عروۃ الوثقیٰ** سے متمسک ہونے میں کامیاب ہوگئے اور انحرافی راستوں کو چھوڑ کر قرآن و اہلبیت کے دامن عصمت سے وابستہ ہوگئے جن کے متعلق رسول خداؐ نے خبر دی تھی کہ تم جب تک قرآن و اہلبیت سے تمسک رکھو گے ہرگز گمراہ نہیں ہوگے اور جب انہوں نے قرآن و اہلبیت سے وابستگی اختیار کی تو انہیں اپنے قلب میں اطمینان محسوس ہوا کہ وہ اب گمراہی سے بچ گئے ہیں۔

کتاب ہذا کا مؤلف بیدار دل اور پاک طینت کا حامل ہے اور اس نے حضرت ابوبکر کی زبانی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان دل کی گہرائیوں سے سنا ہے: **لا یجوز احد الصراط الا من کتب له عليٌّ الجواز**. "اس وقت تک کوئی بھی شخص پل صراط سے نہیں گزرے گا جب تک حضرت علی مرتضیٰؑ اس کو پروانہ لکھ کر نہ دیں۔" (صواعق محرقہ: ابن حجر)

جی ہاں! ملک جنت میں جانے کے لئے "جواز" یعنی پاسپورٹ کی ضرورت ہے۔ اس دنیا میں تو بعض اوقات تیز و طرار قسم کے لوگ غیر قانونی طریقے سے ایک ملک کی سرحد عبور کر کے دوسرے ملک میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن جنت ایک "ملک کبیر" ہے اور اس کا مالک وہ ہے جو صرف رحمن و رحیم ہی نہیں بلکہ قہار و جبار، ملک الملوک اور حاکم مطلق ہے۔ اس ملک میں داخل ہونے کی بس ایک ہی شرط ہے کہ علیؑ کا جاری کردہ پاسپورٹ ساتھ ہونا چاہئے اور اگر کسی کے پاس علیؑ کا جاری کردہ پاسپورٹ نہیں ہوگا تو اسے جنت جیسے "ملک کبیر" میں داخلہ نہیں ملے گا اور اس صورت میں دوزخ جانا پڑے گا۔ خداوند عالم ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

کیا کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ علیؑ کا جاری کردہ پاسپورٹ کیسا ہوگا؟

قارئین کرام! حضرت علی علیہ السلام چند اوراق پر مشتمل ظاہری پاسپورٹ جاری نہیں

کرتے۔ آپ کے پاسپورٹ سے مراد یہ ہے کہ دل و جان سے آپ کی پیروی کی جائے اور آپ ہی کو امام ہدایت تسلیم کیا جائے اور آپ کی امامت کو ماننا اور تسلیم کرنا اتنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ کہہ دیا تھا..... **وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ**..... اور اگر آپ نے اس مسئلہ کا اعلان نہ کیا تو آپ نے خدا کی رسالت کی تبلیغ ہی نہیں کی۔ آیت کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ آنحضرتؐ کی تمام تر تبلیغ رسالت کا انحصار اسی ایک مسئلے کے بیان پر موقوف تھا اور آپ کی تمام تر کاوشیں اس شکل میں قابل قبول قرار پائیں گی جب آپ اس مسئلے کی تبلیغ کریں گے۔

چنانچہ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کے اس فرمان پر حجۃ الوداع سے واپسی پر مقام غدیر خم پر پالانوں کا منبر نصب کر کے اور حضرت علیؑ کا بازو کو پکڑ کر بلند آواز سے فرمایا تھا: **مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ**. "جس جس کا میں مولا ہوں اُس اُس کا یہ علیؑ مولا ہے۔" آپ کے اس اعلان کے بعد اللہ تعالیٰ نے تکمیل دین کی سند عنایت فرمائی ورنہ اس سے قبل دین نامکمل تھا۔

جناب صالح الوردانی نے اس حقیقت کو جان لیا تھا کہ دنیا ایک فانی اور چند روزہ سرائے ہے۔ **وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ**. اسی حقیقت کو جاننے کے بعد انہوں نے آخرت کے پاسپورٹ کو تلاش کرنا شروع کیا اور آخرکار انہیں اپنا مطلوبہ پاسپورٹ درِ آل محمدؐ سے مل گیا۔

قارئین محترم! اگر خدانخواستہ ابھی تک آپ اس پاسپورٹ سے محروم ہیں تو دیر نہ کریں اور بہت جلدی سے حضرت علیؑ کے آستانہ قدس سے یہ پاسپورٹ حاصل کریں اور اگر آپ کے پاس ان کا جاری کردہ پاسپورٹ نہ ہوا تو آپ کو دنیا و آخرت کا خسارہ اٹھانا پڑے گا جو کہ بہت بڑا خسارہ ہے۔ **خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِکَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ** (سورۂ حج: آیت ۱۱) لہٰذا اپنے آپ کو اس عظیم خسارے سے بچائیں اور علیؑ و اولاد علیؑ سے

جنت کا پاسپورٹ حاصل کریں۔

کہنے کو باتیں تو بہت سی ہیں لیکن میں آپ کے اور اس ایمان آفریں کتاب کے درمیان حائل رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ محترم صائغ اوردانی کی باتیں پڑھ کر محظوظ ہوں گے البتہ رخصت ہونے سے قبل فضائل آل محمدؐ کے بحر بیکراں میں سے ایک جام آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت ضرور حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

یہ جام ایک حدیث کی صورت میں ہے جسے امام احمد بن حنبل نے اپنی کتاب مسند میں نقل کیا ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ مسند احمد بن حنبل کو اہلسنت کی اہم ترین کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ حدیث اس نیت پر نقل کر رہا ہوں کہ شاید اس کی برکت سے میرے گناہوں کا بوجھ کچھ ہلکا ہو سکے۔

احمد بن حنبل اپنی مسند میں عمرو بن میمون کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ اس نے کہا:

"ایک دن میں ابن عباسؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اس اثنا میں نو افراد آئے اور انہوں نے ابن عباسؓ سے کہا: آپ ہمارے ساتھ باہر تشریف لائیں یا اپنے ساتھیوں کو یہاں سے ہٹادیں تاکہ ہم تنہائی میں کچھ بات کر سکیں۔

ابن عباسؓ اس وقت تک نابینا نہیں ہوئے تھے، انہوں نے ان سے کہا: میں خود تمہارے پاس آتا ہوں۔ پھر ابن عباسؓ ہماری بزم سے اٹھ کر ان کے پاس چلے گئے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں مگر جب وہ واپس آئے تو غصے کی وجہ سے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہہ رہے تھے: ان پر افسوس، ان پر افسوس، وہ اس شخص کی توہین کرتے ہیں جس کے بارے میں خدا کے رسولؐ نے فرمایا تھا کہ "میں کل اسے روانہ کروں گا جسے خدا کبھی ذلیل نہیں کرے گا۔ وہ خدا اور رسولؐ سے محبت کرتا ہوگا۔" تمام افراد نے اس تمنا میں اپنی گردنیں بلند کیں کہ شاید رسول خداؐ ان میں سے کسی کا تعارف ان الفاظ سے کرائیں گے لیکن پیغمبر اکرمؐ نے پکار کر کہا: "علیؑ کہاں ہیں؟" کہا گیا کہ وہ گندم کا آٹا پیس رہے ہیں۔ یہ سن کر

رسول خداؐ ناراض ہوئے اور فرمایا: "تم میں سے کسی اور شخص نے یہ کام کیوں نہ کیا؟"

بہرنوع حضرت علیؑ کو خبر دی گئی تو وہ اس حال میں رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ انہیں آشوب چشم لاحق تھا اور وہ اچھی طرح دیکھنے سے قاصر تھے۔ رسول خداؐ نے علیؑ کی آنکھوں پر اپنے دہن مبارک کا لعاب لگایا۔ رسول اللہ کے دہن مبارک کا لعاب لگتے ہی ان کی آنکھیں اچھی ہوگئیں۔ رسول خداؐ نے تین بار پرچم کو حرکت دی اور پھر علیؑ کے سپرد کیا۔

اور اسی طرح سے رسول خداؐ نے فلاں کو سورۂ توبہ دے کر روانہ کیا۔ پھر آپ نے اچانک علیؑ کو حکم دیا کہ وہ جائیں اور اس سے سورت لے لیں اور اسی وقت آپ نے فرمایا: "اس سورت کو وہی لے جاسکتا ہے جو مجھ سے ہو اور میں اس سے ہوں۔"

اسی طرح سے رسول خداؐ نے اپنے چچازاد بھائیوں سے کہا تھا: "تم میں سے کون ہے جو دنیا اور آخرت میں میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے؟" اس وقت علیؑ، رسول خداؐ کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ آپ کے رشتہ داروں میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو اس وقت علیؑ نے کہا: میں دنیا اور آخرت میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ رسول خداؐ نے فرمایا: "ہاں! تم دنیا وآخرت میں میرے ساتھی اور میرے پیروکار ہوگے۔" پھر آپ نے علیؑ کو چھوڑ کر دوسرے رشتے داروں سے فرمایا: تم میں کوئی ہے جو دنیا اور آخرت میں میرے ساتھ رہنے کا خواہش مند ہو؟ اس بار بھی سب خاموش رہے مگر علیؑ نے کہا: یارسول اللہ! میں دنیا اور آخرت میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ہاں! تم دنیا اور آخرت میں میرے ساتھ ہوگے۔

پھر ابن عباسؓ نے کہا: خدیجہؓ کے بعد علیؑ ہی وہ پہلے فرد تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔

اسی طرح سے رسول خداؐ نے اپنی چادر کو علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ پر ڈال کر فرمایا:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا "بس اللہ کا ارادہ یہ ہے اے اہلبیت کہ تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جس طرح پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔" (سورۂ احزاب: آیت ۳۳)

اسی طرح سے غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت علیؑ نے رسول خداؐ سے عرض کی تھی کہ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ رسول خداؐ نے فرمایا تھا کہ نہیں۔ (یہ سن کر) علیؑ رو دیے۔ اچانک رسول خداؐ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ "تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور میرے لئے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ میں چلا جاؤں اور تم میرے جانشین نہ ہو۔" اسی طرح رسول خداؐ نے فرمایا تھا: میرے بعد تم ہر مومن کے ولی اور سرپرست ہو۔ نیز سرکار رسالت پناہ نے فرمایا: علیؑ کے گھر کے دروازے کے علاوہ مسجد میں کھلنے والے سارے دروازے بند کر دو۔

اسی طرح سے رسول اکرمؐ نے فرمایا: مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ "جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے۔" [1]

آخر میں، میں اس کتاب کے ترجمے کا ثواب اپنے مربی و معلم مرحوم آیت اللہ حاج سید عباس مہری کہ جنہوں نے مجھے راہ اہلبیتؑ سے آشنا کرایا اور اپنی والدہ مرحومہ کی روح پُرفتوح کی نذر کرتا ہوں جنہوں نے مجھے قرآن مجید کی تعلیم دی تھی اور قرآن و اہلبیتؑ سے میرا اٹوٹ رشتہ جوڑا تھا۔

سید محمد جواد مہری

۳ر محرم ۱۴۱۷ھ

۱۔ [illegible]

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حرف آغاز

مختلف قسم کی حدیثوں، روایتوں، فتووں اور تاریخی داستانوں میں سے حقیقی اسلام کی جستجو کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے لے کر آج تک اسلام کے تابناک چہرے پر بہت سا خس و خاشاک چسپاں ہو چکا ہے جس کی وجہ سے یوں دکھائی دیتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے اسلام کے جس رخ زیبا سے مسلمانوں کو متعارف کرایا تھا آج کا اسلام اس کا ایک دھندلا سا پرتو ہے اور بعض اوقات تو اسلام کی حقیقی تفسیر و تعبیر کے لئے کسی نئے پیغمبر کی ضرورت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ مصر جیسے اسلامی ملک میں بیس سال تک بحث و مطالعے اور تجربات کی بھٹی سے گزرنے کے بعد کم از کم میں تو اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔

مصر میں بہت سی اسلامی جماعتیں اور تحریکیں موجود ہیں اور ان جماعتوں اور تحریکوں کے ساتھ رابطے کی وجہ سے مجھ میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ میں اسلام کی میراث گم گشتہ کو تلاش کروں کیونکہ مصر کی تمام جماعتیں اسلام کو ہی اپنا نجات دہندہ اور حقیقی سرچشمہ تسلیم کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان جماعتوں کے خیالات میں بہت زیادہ تفاوت ہے۔ پس میں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ان جماعتوں کی بجائے خود سے حقیقت اسلام کی جستجو کی جائے اور ایک طویل جستجو اور مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان جماعتوں کے اختلافات کا تعلق حال کی بجائے ماضی سے ہے اور ان کے اختلافات کی بنیادوں کو معروضی حالات کی بجائے ماضی

کے اوراق میں تلاش کرنا چاہئے اور پھر صدیوں کی "عقیدت" حقیقت حال کو تسلیم کرنے میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے اور اگر ماضی کے مطالعے سے استفادہ کرنا ہو تو اس کے لئے ایک بنیادی شرط کی ضرورت ہے جس سے پہلے میں خود بھی محروم تھا اور وہ شرط یہ ہے کہ جب آپ تحقیق کرنے بیٹھیں تو اپنے ذہن سے "افراد کے تقدس" کو دور رکھیں۔

سادہ لفظوں میں یوں سمجھ لیں کہ تحقیق کی پہلی شرط یہ ہے کہ آپ کسی بھی شخصیت سے مرعوب نہ ہوں اور ہر طرح کی عقیدت سے خالی ہو کر شخصیت کے کردار کا جائزہ لیں اور جب آپ ایسا کریں گے تو بہت سے حقائق آپ پر آشکار ہو جائیں گے۔

ابتدائے تحقیق میں میں اس بنیادی نکتے سے محروم تھا اور عقیدتوں میں اس قدر گرفتار تھا کہ صحابہ تو رہے اپنی جگہ پر میں کسی فقیہ کے خلاف بھی ایک لفظ تک سننے کا ہرگز روادار نہ تھا اور جب اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہوا اور میں اس خود ساختہ ہالے سے آزاد ہوا تو حقیقت اسلام میرے سامنے نکھر کر عیاں ہونے لگی اور ایک طویل بحث و مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سابقہ امتوں کی بدبختی نے مسلمانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا ہے یعنی امت "شخصیات" کے سحر میں ایسی گرفتار ہوئی کہ اس نے "شخصیات" کو نصوص پیغمبرؐ پر ترجیح دی اور انہوں نے دین کو نصوص پیغمبرؐ سے حاصل کرنے کی بجائے اسے شخصیات سے حاصل کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حقیقت اسلام پس پردہ چلی گئی اور شخصیات کی عقیدت نے دین میں راہ پائی۔

یہ المیہ امت مرحوم میں ہی پیش نہیں آیا بلکہ اس سے قبل امت موسیٰ و عیسیٰ میں بھی یہی المیہ پیش آ چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کی بنیادی غلطی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا: اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ "انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو خدا کے علاوہ اپنا رب مان لیا۔" (سورۂ توبہ: آیت ۳۱)

چنانچہ بفضلہ تعالیٰ جب سے میں نے اس نکتے کو اپنے لئے حرز جان بنایا اور شخصیات کے تقدس کو ذہن سے کھرچ کر نصوص و متون اسلامی کا جائزہ لینا شروع کیا تو میں حقیقت تک

پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ جی ہاں! میں نے اپنے لئے وہی روش اختیار کی جس کی طرف شاطبی نے اپنی کتاب الاعتصام میں اشارہ کیا تھا کہ "کیا لوگوں کو "حق" کے ذریعے سے پہچانا جائے یا "حق" کو لوگوں کے ذریعے سے پہچانا جائے؟"

اور اس سوال کا جواب بھی مجھے معلوم ہے۔ تمام فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ حق کے ذریعے سے لوگوں کو پہچانا جائے اور لوگوں کی وجہ سے حق کو نہیں پہچاننا چاہئے۔ یعنی حق اپنی حقانیت کے لئے شخصیات کا محتاج نہیں ہے بلکہ اشخاص اپنی عظمت کے لئے حق کے محتاج ہیں۔

فقہائے اسلام کا یہ جواب بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ یہ سب زبانی جمع خرچ ہے۔ عملی طور پر اس کا مظاہرہ نہ تو پہلے بھی ہوا ہے اور نہ آج ہو رہا ہے اور تاریخ کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہر دور میں لوگوں نے حق کی بجائے شخصیات کی پیروی کی ہے اور انہیں کو حق و باطل کا معیار گردانا ہے۔ جب سے میں نے خالی الذہن ہو کر غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہے مجھے حقیقت اسلام کو سمجھنے میں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی اور اگر خدانخواستہ میں شخصیات کے سحر میں گرفتار رہتا اور نصوص کے مقابلے میں ان شخصیات کی آراء اور تاویلات پر انحصار کئے رہتا تو کبھی بھی وہم کے دائرے سے نکل کر حقیقت کی سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ شخصیات کے اقوال سے حقیقت کی بجائے سیاست کی بو آتی ہے۔

میں نے رحلت رسولؐ کے بعد رونما ہونے والے حالات کا کھلے ذہن سے مطالعہ کیا اور واقعات کا از سر نو جائزہ لیا تو ایک طویل سرگردانی کے بعد مجھ پر آسمان ہدایت سے حقیقتوں کا نزول ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ تاریخ اسلام اور حقیقت مسلمین کا ایک بڑا حصہ جو پہلے مجھ پر مخفی تھا کھل کر میرے سامنے آ گیا اور جب مخفی حقائق مجھ پر آشکار ہوئے تو مجھے "حق" کا راستا مل گیا اور میری بے قرار طبیعت کو قرار آ گیا۔

جب سے نور اہلبیتؑ کی تجلی ہوئی ہے ظلمت کے پردے یکے بعد دیگرے کافور ہوتے چلے گئے اور صراط مستقیم بالکل واضح اور صاف ہو کر میرے سامنے آ گیا اور میں نے اپنے آپ کو حقیقی اسلام کے دائرے میں محسوس کیا۔

میں نے اس کتاب میں اپنے ذاتی تجربات کی بجائے حقائق کو پیش کرنے کی سعی کی ہے اور بعض استدلالات کی تردید کی ہے اور کچھ ایسے حقائق بیان کرنے کی جرأت کی ہے جو عام مسلمانوں سے مخفی رکھے گئے ہیں۔ اس نعمت ہدایت کے حصول پر میں اہل ایمان کے یہ الفاظ دہراتا ہوں جسے قرآن مجید نے ان الفاظ میں یوں بیان کیا گیا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ''تمام تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جس نے ہمیں یہاں تک آنے کا راستا بتادیا اور اگر اس کی ہدایت شامل حال نہ ہوتی تو ہم یہاں تک آنے کا راستا نہیں پاسکتے تھے۔'' (اعراف: آیت ۴۳)

صالح وردانی

قاہرہ، مصر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آغاز سفر

میں نے پندرہ برس سے زیادہ کا عرصہ مصر کے انقلابی مسلمانوں کے ساتھ گزارا ہے۔ میرا یہ سفر ۱۹۷۰ء کی دہائی سے شروع ہوا اور ۱۹۸۰ء کی دہائی تک جاری رہا۔ اس دوران میں نے کئی تحریکوں کو اٹھتے اور دم توڑتے ہوئے دیکھا ہے اور ان تحریکوں کے رہنماؤں کو بھی انتہائی قریب سے دیکھا ہے مگر یہ تحریکیں مجھے کچھ خاص متاثر نہ کرسکیں۔

مصر کی تحریکوں میں سے **اخوان المسلمین**، **حزب التکفیر** اور **حرکۃ الجہاد** نے مجھے کچھ متاثر کیا تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ میں ان تحریکوں کے لئے ان کا ممبر بنے بغیر کام کروں جبکہ مذکورہ تحریکیں یہ چاہتی تھیں کہ میں ان کا ایک مستقل ممبر بن کر ان کے ساتھ کام کروں۔ میرا ''آزاد'' ہونا انہیں پسند نہیں تھا اس لئے میرا تعاون **اخوان المسلمین** اور **حرکۃ الجہاد** سے آگے نہ بڑھ سکا کیونکہ دیگر جماعتیں ممبر بننے پر اصرار کرتی تھیں۔

بہر حال میں نے مصر کی تمام اسلامی تحریکوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور یہ محسوس کیا کہ تمام تحریکیں ''ماضی کی فقہ'' نافذ کرنا چاہتی ہیں اور ان کی نظر میں دور حاضر کی کوئی اہمیت نہیں اس لئے مجھے ان تحریکوں کے منشور سے اتفاق نہیں تھا اور میں ان پر تنقید کیا کرتا تھا جس کی وجہ سے یہ جماعتیں مجھ سے ناراض ہوگئیں اور انہوں نے مجھ سے لاتعلقی کا اظہار کردیا۔ بعض تنظیموں نے تو مجھ ناچیز پر کفر و الحاد کے فتوے بھی صادر فرمائے اور لطف یہ ہے کہ مجھ پر یہ تمام تر ''شفقتیں'' اس وقت کی گئیں جب میں سنی کہلاتا تھا۔

مذکورہ دینی جماعتوں کے اس ناروا سلوک نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ:

۱۔ کیا اس طرح کا فیصلہ اندھے تعصب پر مبنی نہیں ہے؟

۲۔ کیا اس طرح کے فیصلے کی بنیاد کسی شرعی اصول کے مطابق ہے؟

۳۔ کیا ان جماعتوں پر تنقید کرنے سے میں دائرۂ اسلام سے خارج ہو سکتا ہوں؟

اور جس دن سے میرے ذہن میں ان سوالات نے جنم لیا اسی دن سے میں نے حقیقت اسلام کی جستجو شروع کر دی جس کے نتیجے میں مجھے بفضلہ تعالیٰ کتب اہلبیتؑ سے آگاہی حاصل ہوئی۔

تلاش حق

۱۹۷۰ء کی دہائی کے اوائل میں جب جمال عبدالناصر کی حکومت تھی ہمارے ملک میں تصوف پر مبنی کئی انجمنیں قائم تھیں لیکن بعد میں وہ انجمنیں آہستہ آہستہ اپنا اثر و رسوخ کھوتی گئیں اور صرف دو تنظیمیں باقی رہ گئی تھیں کیونکہ عوام کو تصوف سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی [۱] چنانچہ جو نوجوان اسلامی فکر سے متاثر ہوتے تھے وہ ان دو تنظیموں میں سے کسی ایک میں شامل ہو جاتے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام **انصار السنة المحمدیه** اور دوسری کا **منظمة الشرع** تھا۔ ان میں سے اول الذکر کو نوجوانوں میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی کیونکہ یہ تنظیم توحید اور نفاذ اسلام کا نعرہ لگاتی تھی جبکہ دوسری تنظیم صرف عبادات اور تزکیۂ نفس پر زور دیتی تھی اور سیاست سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہ تنظیم تصفیۂ قلب پر زیادہ زور دیتی تھی اور اس کی سرگرمیوں کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ حکومتی مساجد سے بھی ان کی مساجد کی تعداد زیادہ تھی۔

انصار السنة المحمدیه کے اعصاب پر تو وہابیت سوار تھی۔ وہ نوجوانوں میں وہابی افکار و نظریات کا پرچار کرتی تھی کیونکہ یہی اس کا نصب العین اور مقصد تخلیق تھا۔

۱۔ وہابیت نے جوانوں کو تصوف اور صوفیاء کے خلاف ورغلانے میں اہم کردار ادا کیا اور یہاں ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ مصر میں اسی سے زیادہ تصوف کے خانوادے ہیں جن میں سے بعض کو حکومت بھی تسلیم کرتی ہے۔

انور السادات نے برسر اقتدار آ کر اعلان کیا کہ تمام سیاسی اور مذہبی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔ اس اعلان کے ساتھ مدت سے جیلوں میں بند سیاسی اور مذہبی کارکن باہر نکل آئے اور ان کے باہر آتے ہی تین مزید جماعتیں یعنی **اخوان المسلمین**، **حزب التکفیر** اور **قطبی** مصر کے سیاسی اور مذہبی منظر پر نمودار ہوئیں۔

اخوان المسلمین نے بہت سے نوجوانوں کو متاثر کیا تھا۔ میں اس وقت یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ میری طرح سے بہت سے طالب علم **اخوان المسلمین** کی طلباء تنظیم سے وابستہ ہو گئے۔ تعلیمی اداروں میں اسے پہلے "دینی جماعت" کہا جاتا تھا لیکن بعد میں اس کا نام بدل کر "اسلامی جماعت" رکھ دیا گیا۔

حزب التکفیر کو اگرچہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی پھر بھی اس نے اچھے خاصے نوجوانوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ تعلیمی اداروں میں اور تعلیمی اداروں سے باہر **اخوان المسلمین** نے اس کی رقابت شروع ہو گئی اور وزیر اوقاف شیخ ذہبی کے قتل کی وجہ سے **حزب التکفیر** کی قوت میں کافی کمی واقع ہوئی۔[۱]

ان دو جماعتوں کے برعکس قطبی جماعت خفیہ تبلیغات میں مصروف رہی جس کی وجہ سے اس کی تعلیمات منظر عام پر نہ آ سکیں اور **اخوان المسلمین** اور **حزب التکفیر** کی طرح اسے عوام میں پذیرائی نہ مل سکی اور ۱۹۸۱ء میں اس جماعت کا شیرازہ بکھر گیا۔

۱۹۷۴ء میں پہلی بار مصر میں صالح سریہ کی زیر قیادت ایک جہادی گروپ منظر عام پر آیا اور اس گروپ نے اس وقت کی حکومت سے کھل کر اختلاف کیا۔ یہ گروپ **الحرکة الاسلامیه** کے نام سے قائم ہوا اور بعدازاں **حزب الجهاد** کا سرچشمہ ثابت ہوا۔

ان تمام گروپوں کی موجودگی میں سرکاری سرپرستی میں بھی ایک گروپ کام کر رہا تھا جس کے ارکان ازہر یونیورسٹی اور محکمۂ اوقاف میں ملازم تھے لیکن یہ گروپ عوام کی توجہ حاصل کرنے میں بری طرح سے ناکام رہا اسی لئے انور السادات کو انتہا پسند اسلامی تنظیموں کے

۱۔ وزیر اوقاف شیخ ذہبی کے قتل کا مقدمہ حزب التکفیر کے پانچ سرکردہ افراد پر چلایا گیا۔ عدالتی فیصلے کے مطابق ان پانچوں افراد کو پھانسی دے دی گئی ان میں حزب التکفیر کے بانی شکری مصطفیٰ بھی شامل تھے

مقابلے کے لئے اخوان المسلمین جیسی جماعتوں سے مدد حاصل کرنا پڑی اور وہ اخوان المسلمین پر کافی حد تک انحصار کرتا تھا۔

بہر حال ان مختلف اسلامی تنظیموں میں اختلافات نے سر اٹھایا اور ان کا ایک دوسرے سے شدید ٹکراؤ ہوا جو تعلیمی اداروں میں قائم ان کی ذیلی تنظیموں تک ہی محدود نہ رہا بلکہ عوام میں بھی اس کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگی کیونکہ ان جہادی تنظیموں کے ارکان اخوان المسلمین کے ارکان پر بہت زیادتیاں کر رہے تھے۔ پھر اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی اور اس میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب حزب التکفیر نے اپنے تمام مخالفین سے کھلم کھلا اعلان جنگ کردیا۔

اس وقت تعلیمی اداروں میں جمال عبدالناصر کے حامیوں کی تنظیم ''ناصریہ'' اور کمیونسٹوں کی مارکسسٹ پارٹی بھی موجود تھی۔ ان دونوں تنظیموں کے افراد اسلامی نظریات رکھنے والی پارٹیوں کے افراد پر شدید تنقید کرتے تھے۔ ناصریہ اور مارکسسٹ پارٹی کے حامی اسلامی تنظیموں کے حامیوں پر حکومت کی حمایت کا الزام عائد کرتے تھے اور اسلامی تنظیمیں ان پر کفر و الحاد کا الزام عائد کرتی تھیں۔

چنانچہ ان حالات میں میری ذاتی پوزیشن کچھ عجیب سی تھی۔ میں دل و جان سے اسلام کا شیدائی تھا لیکن اسلامی جماعتوں کے رویے سے سخت مایوس اور نالاں تھا۔ میں عقل پر زیادہ زور دیتا تھا جبکہ اسلامی جماعتیں ''ماضی کی شخصیات'' کی کورکورانہ تقلید پر زور دیتی تھیں۔ میں جدید مسائل کے حل کی گفتگو کرتا تھا تو اسلامی جماعتیں پتھر کے دور کی باتیں کرتی تھیں۔ اس فکری بُعد کے باوجود میں نے اسلامی جماعتوں کے ارکان سے مل کر پورے مصر کا دورہ کیا۔ ہم مصر کے کئی چھوٹے بڑے شہروں اور قابل ذکر دیہاتوں میں گئے جہاں ہم مساجد میں تقریریں کرتے، نوجوانوں سے ملاقاتیں کرتے اور مختلف گروپوں سے تبادلۂ خیال کرتے تھے۔

اس زمانے میں میری شکل وصورت بھی باقی اسلامی جماعتوں کے ارکان جیسی ہوتی تھی۔ میں اس دور میں لمبی داڑھی رکھا کرتا تھا اور عربی لباس پہنا کرتا تھا۔

اس تمام تر وابستگی اور اسلامی جماعتوں کے مبلغین سے مذاکرات کے باوجود میں کسی

نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب نہ ہوسکا کیونکہ یہ جماعتیں عقل کی حیثیت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھیں اور اسلاف کی لائن سے معمولی سے انحراف کو بھی جائز نہیں سمجھتی تھیں جبکہ ان پر تنقید کرنا تو دور کی بات ہے۔ البتہ ان تمام جماعتوں میں سے حزب التکفیر قدرے بہتر جماعت تھی کیونکہ یہ اسلاف کی غلطیوں پر تنقید کو جائز سمجھتی تھی اور کسی کو بھی نص سے بالاتر ماننے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس جماعت نے حضرت عمرؓ پر بھی تنقید کی تھی کہ انہوں نے نص پیغمبرؐ کے مقابلے میں اجتہاد سے کام لیا تھا۔

حزب التکفیر والے اگرچہ یہ ساری باتیں کھلے بندوں نہیں کرتے تھے البتہ جب وہ نوجوانوں کو نظریاتی تعلیم دیتے تو وہ ان باتوں کا کھل کر اظہار کرتے تھے اور ہمیشہ اس بات کا پرچار کرتے تھے کہ جس نے بھی تقلید کی اس نے کفر کیا اور ان کے ان ہی نظریات کی وجہ سے بہت سے افراد کو اسلاف کی اندھی تقلید اور بہری عقیدت سے آزادی نصیب ہوئی اور ان کی ان ہی تبلیغات نے مجھے بھی نصوص کی طرف متوجہ کیا جس کی وجہ سے میں آل محمدؐ کے در پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

اخلاق

اخوان المسلمین کے علاوہ باقی جتنی بھی اسلامی جماعتیں مصر میں سرگرم عمل ہیں ان کی قیادت ناتجربہ کار اور خام ذہن رکھنے والے جوان کر رہے ہیں۔ ان جماعتوں کے قائدین میں اکثریت ایسے افراد کی ہے جنہوں نے بڑی مشکل سے وہابیت کی چند کتابیں پڑھی ہیں اور یہ نوجوان وہابیت کی صرف تبلیغ ہی نہیں کرتے بلکہ وہ اخلاق وہابیت کے بھی مجسمے ہیں یعنی جہاں وہ خشونت اور تعصب سے بھرے ہوئے ہیں وہیں اپنے مخالفین کو قتل کرنا واجب جانتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مذکورہ تنظیموں یا جماعتوں کے باہمی اختلاف کے وقت ان میں یوں دنگا فساد پھوٹ پڑتا ہے جیسا کہ زمانہ جاہلیت کی قبائلی جنگوں میں پھوٹا کرتا تھا اور ان کی باہمی لڑائیوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۷ء تک جب میں پس زندان تھا تو اس وقت ان تنظیموں کی باہمی لڑائیاں عروج پر ہوتی تھیں اور ان کے کارکن زندان پہنچائے جاتے تھے اور میں ان کے اس کردار سے انتہائی ناخوش ہوتا تھا اسی لئے میں ان سے کافی فاصلہ رکھتا تھا اور ان کی صحبت کی

بجائے میں زندان کے کمرے میں تنہائی کو پسند کرتا تھا یا دوسرے قیدیوں سے گپ شپ کیا کرتا تھا اور یہ حقیقت بیان کرنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ دوسرے قیدیوں کے ساتھ بیٹھ کر مجھے وہ سکون ملتا تھا جو کہ مذہبی قیدیوں سے ملنا محال تھا۔ (مذاکرات معتقل سیاسی طبع قاہرہ)

بہرنوع میں اپنی اسیری کے دوران مذہبی جنونیوں سے دور رہتا تھا اسی لئے مذہبی انتہاپسند بھی مجھے ناپسند کرتے تھے اور ہمیشہ میرے مقابلے کے لئے تیار رہتے تھے۔

مذہبی جنونی اپنے آپ کو دوسرے قیدیوں سے بہتر سمجھتے تھے اور وہ احساس برتری میں مبتلا تھے اور دوسروں کو مسلمان تو کجا انسان سمجھنے پر بھی آمادہ نہیں تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی اس روش کی وجہ سے لوگوں کی اکثریت ان سے نفرت کرتی ہے اور ان سے دور رہنے میں ہی عافیت سمجھتی ہے۔ مذہبی جنونیوں کے ناشائستہ اور غیر مہذبانہ رویے نے دوسرے قیدیوں کو نہ صرف ان سے دور رکھا بلکہ دوسرے قیدی ان کے غیر مہذبانہ رویے کی وجہ سے اسلام سے بھی دور ہو گئے کیونکہ بدخلقی اور غیر شائستہ رویے سے کوئی کسی کو قائل نہیں کرسکتا۔

اور میں نے حرکۃ الجہاد کے قیدیوں میں باہمی مار پیٹ کے دلخراش مناظر بھی دیکھے کیونکہ حرکۃ الجہاد میں دو گروہ پائے جاتے تھے۔ دیہی گروہ کی قیادت عمر عبدالرحمٰن کرتے تھے اور شہری گروہ کی قیادت عبود الزمر کے ہاتھوں میں تھی۔ دونوں گروہ بعض اوقات آپس میں لڑ پڑتے تھے جس کی وجہ سے پولیس انہیں گرفتار کر لیتی تھی لیکن ان کی شورش زندان میں بھی کم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ زندان میں بھی ان میں خوب لڑائیاں ہوتی تھیں اور دونوں گروہ لوہے کی سلاخوں اور بیت الخلاء کے پانی کے پائپوں سے مسلح ہو کر آپس میں ٹکرا جاتے تھے اور ایک دوسرے کو مغلظات بکتے تھے۔

جب ایک ہی تنظیم کے افراد کی آپس میں اس قدر سر پھٹول ہوتی ہو تو خدا جانے دوسری تنظیموں سے ان کا رویہ کیا ہوگا؟ غرضیکہ اسلامی جماعتوں کے اس رویے کو دیکھ کر میرے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھتا تھا کہ ان کی بداخلاقی اور درشت خوئی کی وجہ صرف ان کی خود سازی نہ ہونے کی وجہ سے ہے یا اس کے پس منظر میں کوئی دوسرے اسباب بھی کارفرما ہیں؟

ایک مدت تک غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کی درشت خوئی کی واحد وجہ "اخلاق" ہی نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے اور عوامل بھی کارفرما ہیں اور وہی عوامل ان سے اس

طرح کی بداخلاقی کا تقاضا کرتے ہیں۔

میں نے مطالعہ تاریخ کے دوران خوارج کی درشت خوئی کی داستانیں پڑھیں تو مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے ہاں کی نام نہاد اسلامی تنظیموں کا سرچشمہ بھی وہی خوارج ہیں جن کی مذمت میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو ان سے خبردار کیا تھا۔ (مذاکرات معتقل سیاسی طبع قاہرہ)

خوارج بھی اپنے پیروکاروں کو اس درشت خوئی اور بداخلاقی کی تعلیم دیتے تھے اور آج کے جدید دور میں یہ تنظیمیں بھی اس درشت خوئی کی تبلیغ کر رہی ہیں۔ خوارج کے متعلق یہ بات مسلّم ہے کہ وہ لوگ سخت دل اور انتہائی درجے کے درشت خو تھے اور انہوں نے اپنی تلوار سے مسلمانوں کی گردنیں جدا کی تھیں اور مسلمانوں کے اموال اور ناموس کو غارت کیا تھا اور اگر آج کوئی خوارج کی درشت خوئی کو دیکھنا چاہتا ہے تو وہ ان اسلامی تنظیموں کی شکل میں اسے بخوبی دیکھ سکتا ہے۔

ان نام نہاد اسلامی تنظیموں کا موجودہ سرچشمہ وہابیت ہے۔ ہمیں یہی سوال وہابیت سے کرنا چاہئے کہ آخر اس نے سیرت خوارج کو کیوں اپنایا ہوا ہے اور خوارج کی سنگدلی اور درشت خوئی کی میراث کو اس نے اپنے گلے سے کیوں لگا رکھا ہے؟ اور موجودہ وہابیت سیدنا حضرت علیؑ کے دور خلافت میں پیدا ہونے والی خارجیت کی عکاسی کیوں کر رہی ہے؟

خوارج کی طرح موجودہ وہابیت بھی اپنے مخالفین کو مشرک سمجھتی ہے، مخالفین کی اہانت کو اپنا فریضہ سمجھتی ہے، صرف اپنے آپ کو اسلام کی نمائندہ خیال کرتی ہے اور یوں ایک تسلسل سا قائم ہو چکا ہے۔ وہابیت نے یہ نظریات خارجیت سے حاصل کئے اور پھر ان ہی نظریات کو "پٹرو ڈالر" کے بل بوتے پر اپنی ذیلی اسلامی تنظیموں میں رائج کر رہی ہے اور اسی نظریے کی وجہ سے مذکورہ تنظیموں کے افراد اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور باقی تمام مسلمانوں کو اپنے سے کمتر تصور کرتے ہیں۔

جب میں نے ان نام نہاد اسلامی تنظیموں کے اخلاق کے سرچشمے کو متعین کرلیا تو میں نے ان کے ساتھ مزید وابستہ رہنے کو اپنے لئے غلط تصور کیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ اگر میں ان کے ساتھ رہا تو صراط مستقیم سے بہت دور نکل جاؤں گا۔

عراق اور کویت کا سفر

زمانہ طالب علمی میں دیگر عرب ممالک کے طلباء سے بھی میرا رابطہ رہتا تھا جن میں کچھ عراقی شیعہ طلباء بھی تھے۔ عراقی شیعہ طلباء سے میرے رابطوں کی وجہ سے میرے لئے بہت سی مشکلات بھی پیش آئیں اور ان روابط کی وجہ سے اسلامی تنظیموں کے افراد مجھ پر سخت خفا ہوئے اور انہوں نے اخلاق کی تمام حدوں کو پار کرتے ہوئے مجھ پر یہ الزام لگایا کہ میں شیعوں اور مصری خاندانوں کے درمیان نکاح متعہ کراتا رہتا ہوں۔ اس طرح کے بے بنیاد الزامات کی وجہ سے اسلامی تنظیموں سے میرے روابط اچھے نہ رہ سکے لیکن میں ان کی ناراضگی کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتا تھا۔

ان الزامات سے جہاں میری شہرت داغدار ہوئی وہیں مجھے ایک ضمنی فائدہ یہ پہنچا کہ شیعہ افراد سے میری واقفیت کافی بڑھ گئی اور مجھے شیعہ نواز سمجھا جانے لگا۔ ان ہی دنوں میرے ایک عراقی شیعہ دوست ڈاکٹر علی قریش[۱] نے مجھے عراق آنے کی دعوت دی۔ میرا یہ دوست ۱۹۷۷ء میں قاہرہ کی ایک یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کررہا تھا۔

الغرض میں نے اپنے دوست کی دعوت قبول کی اور عراق چلا گیا جہاں میں نے بیس دن تک قیام کیا۔ میرے دوست کا گھرانہ اس کے علاوہ اس کے والدین اور اس کے تین بھائیوں پر مشتمل تھا۔ میرے دوست کے والد گھر کے باغیچے میں ہمیں نماز جماعت پڑھایا کرتے تھے۔ اس دوران ہمارے کچھ دوسرے دوست بھی مصر سے عراق آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ میرے دوست کے والد انتہائی سلیم الطبع، خوش طبیعت اور ہنس مکھ انسان تھے۔ وہ کبھی کبھی شیعہ سنی تنازعہ کو بھی ہلکے پھلکے انداز میں بیان کیا کرتے تھے۔

عراق میں قیام کے دوران میں ائمہ اہلبیت کے مزارات کی زیارت سے بھی مشرف ہوا اور میں مختلف شیعہ مساجد میں بھی گیا جہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا جسے میں نے

۱۔ علی القرش مصر سے ڈاکریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد "الجزیرہ" منتقل ہوگئے ہیں جہاں وہ ایک یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔

پوری توجہ سے سنا اور بہت سے شیعہ دوستوں سے اختلافی مسائل پر بھی گفتگو کی۔

سفر عراق کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے ذہن میں شیعیت کے متعلق جو خود ساختہ اوہام تھے وہ بڑی حد تک دور ہو گئے۔ البتہ مجھے شیعوں کے چند جزوی مسائل سے بھی اختلاف تھا لیکن اس اختلاف کی کوئی حیثیت نہیں تھی کیونکہ کسی بھی مذہب کے متعلق اس کے نظریات کو دیکھا جاتا ہے افراد کے ذاتی کردار کو نہیں۔

سفر عراق کے کچھ دنوں بعد مجھے ایک سنی دوست کی دعوت پر کویت جانا پڑا اور وہاں میری بہت سے مسلمان بھائیوں سے ملاقات ہوئی۔ ان ملاقاتوں سے میں نے وہی نتیجہ اخذ کیا جو میں پہلے مصر میں رہ کر اخذ کرچکا تھا۔ یہاں کویت میں بھی لوگوں پر وہی کچھ گزر رہی تھی جو مصر کے لوگوں پر گزر رہی تھی۔ کویت اور مصر کی اسلامی تنظیموں کا سرچشمہ ایک تھا لہٰذا ان کے طور طریقوں میں بھی یکسانیت پائی جاتی تھی اور دونوں ممالک کی اسلامی تنظیمیں اسلاف کی پیروی پر متفق تھیں۔

سفر کویت کے دوران مجھے جہیمان تمیمی گروپ کے چند افراد سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ ہمارے قارئین کو یاد ہوگا کہ اس گروپ نے ۱۹۷۹ء میں خانہ کعبہ پر قبضہ کیا تھا۔ میں نے اس گروپ کو انتہائی نادان اور سخت خشک پایا۔ یہ گروپ مساجد میں جوتے پہن کر نماز پڑھنے پر اصرار کرتا ہے اور اخباروں اور رسالوں کو پڑھنا تک حرام خیال کرتا ہے کیونکہ ان میں جانداروں کی تصاویر چھپی ہوتی ہیں۔ اس گروپ کی خشکی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ پاسپورٹ، شناختی کارڈ اور کرنسی نوٹوں کو بھی حرام تصور کرتا ہے کیونکہ ان تمام چیزوں پر تصاویر موجود ہوتی ہیں۔ (فقهاء النفط، طبع قاہرہ)

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اس گروپ کے کچھ افراد عمرہ کرنے سعودی عرب کے بارڈر پر گئے جہاں ان کے پاس شناختی کارڈ اور پاسپورٹ قسم کی کوئی چیز نہیں تھی، سعودی حکومت کے سرحدی محافظوں نے انہیں گرفتار کر کے کویت واپس روانہ کردیا تھا۔

ایسے ہی لوگوں کی خشکی اور درشت خوئی نے مجھے ان سے سخت متنفر کردیا اور میں یہ خواہش کرنے لگا کہ میں [illegible] روابط ختم کر کے شیعوں [illegible] روابط قائم کر [illegible]

ابتدا میں تو مجھے شیعیان کویت کا کوئی علم نہ ہوسکا لیکن چند دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ شیعیان کویت نے **جمعیة الثقافة الاجتماعیة** کے نام سے یہاں اپنی ایک انجمن بنا رکھی ہے۔ چنانچہ میں نے مذکورہ انجمن سے رابطہ کیا اور چند کویتی شیعہ جوانوں سے میری ملاقاتیں بھی ہوئیں اور انہوں نے مجھے اپنے مسلک کی بہت سی کتابیں بھی مطالعہ کے لئے دیں جن میں "**کتاب السقیفہ، المراجعات اور عقائد الامامیہ**" سرفہرست تھیں۔

ان دنوں میں کویتی رسالے "ابلاغ" کا خبر نگار تھا۔ چند دنوں بعد میں اس رسالے کو چھوڑ کر "الرسالہ" نامی میگزین میں بطور خبر نگار کام کرنے لگ گیا۔ پھر جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ میگزین عراق کی بعثی حکومت کے زیر اثر ہے تو میں نے اسے بھی خیرباد کہہ دیا۔

جمعیة الثقافة الاجتماعیة کے ایک مرکزی عہدیدار سعید سے میرے گہرے مراسم قائم ہوگئے اور انہوں نے مجھے کویت کی شیعہ شخصیات سے ملاقات کرائی اور ان کے مراکز اور ان کی سرگرمیوں سے روشناس کرایا۔

جہاں شیعیان کویت سے میرے مراسم تھے وہاں کویت کی سنی تنظیموں سے بھی میرے روابط تھے اور ان تنظیموں میں سے **اخوان المسلمین** کے کویتی اور مصری افراد سے بھی میرے اچھے تعلقات تھے۔ **اخوان المسلمین** کے علاوہ اس وقت کویت میں ایک اور تنظیم "**حزب التحریر اسلامی**" بھی کافی فعال تھی۔ میں نے اس تنظیم سے بھی اپنے روابط قائم کئے۔ میں وقتاً فوقتاً **اخوان المسلمین** کے اجلاسوں میں شریک ہوتا تھا جو کہ کویت یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کے گھر پر منعقد ہوتے تھے اور اسی طرح سے **حزب التحریر اسلامی** کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوتا رہتا تھا۔ **حزب التحریر اسلامی** کے اجلاس ان کے ایک پیروکار کے گھر پر منعقد ہوتے تھے۔

ان دونوں تنظیموں کے علاوہ سلفی گروہ کے ارکان سے بھی میری علیک سلیک ہوتی رہتی تھی۔ **حزب التحریر اسلامی** نے مجھے اپنے ساتھ شمولیت کی دعوت دی لیکن چونکہ مجھے ان کے طریقہ کار سے اختلاف تھا، اس لئے میں نے ان سے معذرت کرلی۔ میں نے کویت میں یہ بھی دیکھا کہ ان اسلامی تنظیموں کے درمیان "محبت کی زمزم" بہہ رہی تھی۔ **حزب التحریر**

ہمیشہ **اخوان المسلمین** کے خلاف پرچار کرتی تھی اور **اخوان المسلمین** ہمیشہ **حزب التحریر** کو نشانہ بناتی تھی۔ یہاں آکر میں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ کویتی **اخوان المسلمین** کے ارکان مصری **اخوان المسلمین** سے شدید عداوت رکھتے تھے۔اسی طرح اپنے آپ کو سلفی کہلانے والے افراد بھی ایک دوسرے سے دست وگریباں رہتے تھے اور ان ہی اختلافات کی وجہ سے دو گروہ کھل کر منظر عام پر آگئے اور، یوں **جھیمان** گروپ اور **حرکة الجهاد** جو کہ پہلے زیر زمین تھا اچانک کھل کر سامنے آگیا۔ ان تنظیموں کے منظر عام پر آجانے سے میں نے اپنے آپ کو اختلافات کے گرداب میں اڑتا ہوا محسوس کیا لہٰذا میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ جیسے بھی ممکن ہو اپنے آپ کو اس گرداب کی لپیٹ سے دور رکھوں گا۔

پھر ان دنوں ایران میں اسلامی انقلاب کی ایک لہر اٹھی جس نے دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ کردیں۔ آخرکار اسلامی انقلاب کو کامیابی حاصل ہوئی جس نے مسلمانوں میں ایک زلزلہ سا بپا کردیا اور اس سے مسلک آل محمدؐ دنیا میں متعارف ہوا اور میرے لئے اور مجھ جیسے سیکڑوں طالبان ہدایت کے لئے رشد و ہدایت کے دروازے کھل گئے اور ہمارے لئے تشیع کا سفر آسان ہوگیا۔

ایران کے اسلامی انقلاب نے ان سنی گروپوں، تنظیموں اور جماعتوں پر شدید ضرب لگائی جو مدتوں سے لوگوں کو خلافت کے قیام کی نوید سنا رہے تھے۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی نے مجھے جلدی سے منہاج اہلبیت رسولؐ سے قریب کردیا۔ انقلاب کی کامیابی دراصل تشیع کے اصولوں کی فتح تھی اور تشیع کے اصولوں کی فتح کا مقصد سنی اصولوں کی ناکامی تھا۔[1]

۱۔ میں نے اس زمانے میں انقلاب اسلامی ایران کے متعلق "ابلاغ" میں بہت سے مضامین لکھے تھے جو کہ چھپ چکے ہیں۔

ماضی سے رہائی

عصر حاضر کی اکثر اسلامی تنظیموں نے وہابی اور سلفی مذہب کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور میرے لئے سلفیت ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔

وہابیت عقل دشمن مذہب ہے اور اس کی تعلیمات کسی طور پر بھی انسانی طبیعت سے میل نہیں کھاتیں۔ وہابیت کو قبول کرنے سے مسلمان کی عقل مقفل ہو جاتی ہے اور باطل کے شکنجے میں پھنس کر رہ جاتی ہے کیونکہ اسلامی معاشرہ جن حقائق کو تسلیم کر چکا ہے وہابیت ان سب کی نفی کرتی ہے۔ **(العقل المسلم بين اغلال السلف و اوهام الخلف)**

اسی لئے میں روز اول سے وہابیت کا مخالف تھا اور میری اس مخالفت کے سبب وہابی مجھے ملحد قرار دیتے تھے اور جوانوں کو مجھ سے دور رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ وہ ان جوانوں کو یہ باور کرایا کرتے تھے کہ مجھے کسی تنظیمی عہدے پر فائز نہ کریں۔ میں ان تمام الزامات سے ہرگز خوف زدہ نہیں تھا۔ خدا نے مجھے ثابت قدم رکھا اور میں نے ان الزامات کی کوئی پروا تک نہ کی کیونکہ ان الزامات کے جواب سے زیادہ مجھے اس چیز کی فکر تھی کہ کس طرح سے میں اپنے آپ کو اس دردناک گمراہی سے محفوظ رکھ سکتا ہوں کیونکہ میں اس بات پر دل کی گہرائیوں سے ایمان رکھتا تھا کہ وہابیت اور اس کی کاسہ لیس جماعتوں کے عقائد و نظریات آج کے دور سے مطابقت نہیں رکھتے اور ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آغاز سے اس کے وسط تک میں نے وہابی گری کی دو کتابوں **العقيدة الطحاوية** اور **العواصم من القواصم** مؤلفہ ابن عربی کی کھل کر مخالفت کی تھی کیونکہ وہابیت ہمیشہ ان دونوں کتابوں سے اپنی تبلیغات کا آغاز کرتی ہے اور ان ہی دو کتابوں

سے مسلمانوں کی عقل کو مقفل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور ان ہی کی اساس پر اسلامی تحریکیں اور تنظیمیں تشکیل پاتی ہیں۔[۱]

وہابیت کے پیروکار مذکورہ دو کتابوں کے علاوہ حنبلی مذہب کی بھی بہت سی کتابوں کو رائج کرنے میں پیش پیش ہیں جن میں ابن تیمیہ کی کتابوں کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ مسلمان طلباء کے اذہان کو مسموم کرنے کے لئے ابن تیمیہ کی کتابوں کو زیادہ سے زیادہ تقسیم کرتے ہیں اور ان کتابوں کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کے مؤسس محمد بن عبدالوہاب کی کتابیں بھی بڑے اہتمام سے شائع کرتے ہیں۔[۲]

جامعہ الازہر کے علماء اور **اخوان المسلمین** کے رہنما اگرچہ ان اسلامی تنظیموں کے نزدیک کافی محترم سمجھے جاتے تھے لیکن وہ بھی اس جاہلانہ فکر کے سیلاب کے آگے کوئی بند نہ باندھ سکے اور ان تحریکوں نے دور حاضر کے بہت سے مسلمانوں کو تہذیب و تمدن کے میدان سے نکال کر دہشتگردی کے حوالے کر دیا۔ اس پورے عرصے میں علمائے الازہر کوئی کردار ادا کرنے سے قاصر رہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ تک تک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے دور سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔

حزب التكفير

جب **حزب التكفير** ابتدا میں منظر عام پر آئی تو اس نے سلفی تنظیم کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا اور سلفی عقائد و افکار پر سوالیہ نشان لگا دیا۔ **حزب التكفير** کے نظریات کی وجہ سے وہابی نظریات کو بالواسطہ طور پر بہت دھچکا لگا۔

۱۔ عقیدۂ طحاویہ میں مؤلف نے لوگوں کو اپنے مخصوص نظریے کی پیروی کی ترغیب دی ہے اور کتاب "عواصم" کا ہدف یہ ہے کہ مسلمان صحابہ کے باہمی تنازعات کی طرف ہرگز توجہ نہ کریں اور آنکھیں بند کر کے ان کی تقدیس کی مالا جپتے رہیں اور اگر انہوں نے مشاجرات صحابہ پر توجہ کی تو وہ گمراہ ہو جائیں گے۔

۲۔ مصری طلباء مصر میں اسلامی انقلاب کے زبردست حامی تھے۔ وہابی اور سلفی مذہب کی کتابیں ان ہی طلباء کے ذریعے [illegible] تقسیم ہوتی تھیں

حزب التکفیر نے بزرگوں کی تقلید کو حرام قرار دیا اور ان کے عمل کے متعلق یہ فیصلہ دیا کہ اسلاف کا عمل دین میں حجت نہیں ہے۔ اس نے اپنے پیروکاروں کو کتاب و سنت سے براہ راست استفادہ کرنے کی تعلیم دی۔

اس سے واضح الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس تنظیم نے نصوص و متون اسلامی کے ساتھ ساتھ عقل کو بھی انسان کا پاسبان سمجھا اور ''شخصیت پرستی'' کی روش کو خیر باد کہا۔

حزب التکفیر نے مقلدین پر کفر کا فتویٰ صادر کیا اور اس کی دلیل کے طور پر آیت قرآنی اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۂ توبہ: آیت ۳۱) کو پیش کیا اور اسی آیت کے تحت اس نے ایسے تمام صحابہ و فقہاء پر کھل کر تنقید کی جنہوں نے نص کی موجودگی میں اجتہاد سے کام لیا تھا۔

حزب التکفیر میں جہاں یہ خوبی تھی وہاں اس میں ایک خرابی بھی تھی اور وہی خرابی اس کے تمام نظریات کی نفی کرتی تھی۔ حزب التکفیر نے جہاں بہت سے صحابہ و فقہاء پر تنقید کی تھی اور لوگوں کو دعوت دی تھی کہ وہ صرف نص کی پیروی کرنا سیکھیں اور شخصیت پرستی کی عادت کو چھوڑ دیں، وہاں اس سے یہ غلطی بھی ہوئی کہ اس نے صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث کو اپنے لئے حجت قرار دیا اور یہ نہ دیکھا کہ ان کتابوں میں ہر طرح کا رطب و یابس جمع ہے۔ اس تنظیم نے برملا یہ اعلان کیا کہ مذکورہ محدثین کی ہر روایت حجت ہے اور ان محدثین نے جس روایت کو تسلیم کیا وہ ہمارے لئے بھی واجب التسلیم ہے اور ان محدثین نے جس روایت کو رد کیا ہم بھی اسے رد کرتے ہیں۔

اس نظریے کو حزب التکفیر کی سادگی کہیے یا خود فریبی، اس کا نقد نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں لوگ ایک طرف سے ''شخصیت پرستی'' کے سحر سے نکل آئے وہیں دوسری طرف سے اسی ''شخصیت پرستی'' کے جال میں پھنس گئے اور اس سے سلفیت کے نظریات مزید پختہ ہونے لگے کیونکہ احادیث نبویؐ کے تحت لوگ شخصیات کے طلسم میں اسیر ہوئے اور وہ طلسم ناقابل شکست تھا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ حزب التکفیر کے خیر خواہ بھی ان احادیث

کی وجہ سے ''شخصیت پرستی'' کے گرداب میں ڈوب گئے۔[۱]

بہر نوع حزب التکفیر کے نظریات سے مجھے اتنا فائدہ ضرور پہنچا کہ میں نے شخصیات کے طلسم سے آزادی حاصل کرلی۔ بعدہٗ جب میں نے اس گروہ کے نظریات کا مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس گروہ کے نظریات خوارج کے فرقہ ازارقہ کے نظریات کا چربہ ہیں۔[۲]

میں نے حزب التکفیر اور فرقہ ازارقہ کے نظریات کا موازنہ کیا تو مجھے ان دونوں میں فکری ہم آہنگی دکھائی دی اور میں نے کھل کر اس پر اظہار خیال کیا اور اس سلسلے میں کئی مضامین لکھے اور نوجوانوں کو اس طرف متوجہ کیا کہ حزب التکفیر اپنے دعویٰ کے مطابق اجتہاد اور شخصیات کے طلسم سے ہرگز آزاد نہیں ہے بلکہ یہ تو فرقہ ازارقہ کے نظریات کا چربہ ہے۔

میرے ان مضامین سے نوجوان بہت متاثر ہوئے اور ان کے لئے یہ بات کسی بھی انکشاف سے ہرگز کم نہ تھی کیونکہ اس سے قبل اکثر نوجوان انہیں فکر جدید کا حامل سمجھتے تھے اور میرے ان مضامین سے ان کی ''جدیدیت'' کی قلعی کھل گئی۔

پھر میری کتاب ''آیا حق ایک گروہ میں منحصر ہوسکتا ہے؟'' نے حزب التکفیر کے اس دعوے کو باطل ثابت کردیا کہ اس وقت وہ حق کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔[۲]

حزب التکفیر نے اگرچہ مصری مسلمانوں کے ذہن بدل کر رکھ دیئے تھے اور اسلاف کی غلطیوں کی بھی نشان دہی کی تھی اور کچھ بزرگوں پر تنقید بھی کی تھی مگر اس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوسکا کیونکہ ان کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ جس عطار کے سبب بیمار ہوئے تھے اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے تھے اور انہوں نے بخاری اور مسلم جیسی کتابوں پر انحصار کرکے

۱۔ حزب التکفیر کے لئے اکثر اوقات یہ مشکل پیش آتی تھی کہ انہیں بعض ایسی احادیث سے سابقہ پڑتا تھا جو ان کے افکار کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتی تھیں۔ اس صورتحال میں انہیں مجبور ہو کر ان احادیث کی تاویل کرنا پڑتی تھی اور یوں وہ جن علمی شخصیات کی تکفیر کرتے تھے ان کے مساوی قرار پاتے تھے اور ان احادیث کو رد کرنا بھی ان کے لئے خاصا مشکل کام ہوتا تھا اسی لئے انہیں ایسی احادیث کی تاویل کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اور ان کی اسی روش کی وجہ سے ان کے بہت سے پیروکار ان سے علیحدہ ہوگئے تھے۔

۲۔ یہ کتاب ایک قلمی نسخہ کی صورت میں تھی اور مختلف لوگوں کے ہاتھوں میں گردش کرتی رہتی تھی اور جب سے میں نے مذہب سنی کو خیر باد کہا تو اس کے ساتھ ہی یہ کتاب میرے ہاتھوں سے نکل گئی۔

متاع حریت فکر کو دوسرے ہاتھ سے لٹا دیا تھا۔ اس سے سلفی نظریات کی مزید تائید ہوئی۔ ان کے طرفداروں کو شدت سے یہ احساس ہونے لگا کہ انہوں نے اپنے اسلاف پر تنقید کیوں کی تھی۔

بہر حال حزب التکفیر سے چند روزہ وابستگی کی وجہ سے مجھ پر یہ بات کھل گئی کہ یہ گروہ حق کو اپنے اندر منحصر جانتا ہے اور اپنے سوا سب کو باطل کا پیرو سمجھتا ہے جبکہ دوسری تنظیموں کا بھی کم و بیش یہی نظریہ تھا اور ان تمام تنظیموں کی نظر میں اسلام کے دفاع کی چنداں اہمیت نہیں تھی۔ ان کے نزدیک صرف اپنی تنظیم کا دفاع ہی مقدم تھا۔

اس تنظیم سے وابستہ کئی افراد نے مجھ سے کہا کہ ''ہم حق و حقیقت کے متلاشی ہیں اور ہم اپنے تئیں تو حقیقت تک پہنچ چکے ہیں البتہ اگر آپ کے پاس ہمارے باطل پر ہونے کی کوئی دلیل ہو تو بیان کریں، اگر آپ کی دلیل قاطع ہوئی تو ہم آپ کی پیروی کریں گے۔''

اس طرح کے افراد کے متعلق میرا تجزیہ یہ ہے کہ انہیں حزب التکفیر کے نظریات پر اطمینان حاصل نہیں ہے۔ اس طرح کے غیر یقینی اور ڈگمگ سوچ کے حامل افراد صرف مصر میں ہی نہیں بلکہ تمام بلاد اسلامی میں پائے جاتے ہیں۔[1]

فلسفۂ حاکمیت

حزب التکفیر سے وابستگی کی وجہ سے مجھے تقدیس اسلاف کے نظریے سے نجات ملی اور جب اس کے بعد میں نے ''فلسفۂ حاکمیت'' اور ''اطاعت امیر'' کے موضوع کا مطالعہ کیا تو مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

اس موضوع کے مطالعے کی ضرورت مجھے یوں محسوس ہوئی کہ حرکۃ الجہاد کے ارکان میں فقہی و شرعی حوالے سے یہ اختلافات پیدا ہو چکے تھے کہ آیا انہیں حکومت کے خلاف قیام کرنا چاہئے یا نہیں اور اس کے لئے ان کی شرعی ذمے داری کیا ہے اور کیا حکومت کی مخالفت یا اس کے خلاف بغاوت جائز ہے یا طبقۂ حکام کو ''اولی الامر'' سمجھ کر ان کی اطاعت کرنا فرض ہے؟

۱۔ حزب التکفیر کے نظریات مصر کے علاوہ یمن، سعودی عرب، الجزائر حتیٰ کہ یورپ کے مسلمانوں میں بھی سرائیت کر گئے۔

اس مسئلے کے لئے جب میں نے فقہ کی کتابیں دیکھیں اور حکمرانوں کی حمایت پر مبنی فقہاء کے فتوے دیکھے تو مجھے یقین ہو گیا کہ حرکۃ الجہاد کی سرگردانی ابدی و ازلی ہے۔ اس فقہ کے سائے میں انہیں حکمران طبقے کے خلاف قیام کرنے کی اجازت ملنا ناممکن سی بات ہے۔

میں نے کتب فقہ میں بزرگوں کا یہ طرز عمل مشاہدہ کیا کہ وہ امیر کی اطاعت کو دین کا جزو سمجھتے تھے اور اطاعت امیر کے لئے ان کے یہاں بہت سی احادیث و روایات موجود تھیں جن میں یہ بتایا گیا تھا کہ امیر کی پیروی کرنے میں ہی حق کا راز مضمر ہے۔

جب میں نے اس طرح کے ''طرفہ مسائل'' پڑھے تو مجھے یہ باور کرنے میں دیر نہ لگی کہ ان احادیث و روایات کے پیچھے کچھ چھپے ہوئے ہاتھ موجود ہیں جنہوں نے امت کو سلطانوں کا غلام بنانے اور مرد مسلم سے حریت فکر کو سلب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔

ہماری اسلامی جماعتیں اور تنظیمیں ''فلسفۂ حاکمیت'' اور ''اطاعت امیر'' کے متعلق اختلافات کا شکار ہیں اور ان کے نظریات ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ سلفی اور اخوان المسلمین ٹائپ کی جماعتیں حکام کی مخالفت کو حرام قرار دیتی ہیں جبکہ حرکۃ الجہاد اور قطبی جماعت اسے جائز سمجھتے ہیں اور اطاعت امیر کی غیر مشروط قسم کی روایات کی وجہ سے آج تک امت اسلامیہ اپنے ظالم حکام کے خلاف قیام کرنے میں ناکام ہوئی ہے اور جدید تحریکیں بھی ان روایات کی موجودگی میں اپنا ہدف حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گی۔ (عقائد السنۃ و عقائد الشیعۃ اور الاسلام والعمل السیاسی)

اس ناکامی کی وجوہات کو اسلاف کی فقہ میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ آج کے اخوان المسلمین اور سلفی گروپ اُن فقہاء کی فقہ کے قائل ہیں جو کہ خود پوری زندگی حکمرانوں کی خوشنودی کے خواہاں رہے اسی لئے ان فقہاء نے اپنے ولی نعمت اور مربی حکمرانوں کا حق نمک ادا کرتے ہوئے یہ فتویٰ صادر کیا تھا کہ حکام کے خلاف ہر قسم کی مزاحمت شرعاً حرام ہے۔

اس فکر کے برخلاف جہادی افراد ابن تیمیہ کے فتوے کے تحت مرتد حکمرانوں کی مخالفت و مزاحمت کو جائز قرار دیتے ہیں اور سنی فقہ میں اس قسم کا نظریہ ایک شاذ نظریہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک قطبی جماعت کا تعلق ہے تو اس کے تمام تر نظریات کا محور

سید قطب شہید کے اجتہادات ہیں۔[1]

اخوان المسلمین کے بعد یہ وہ واحد تنظیم ہے جس نے حکومت اور نظریۂ حاکمیت کے متعلق کچھ نہ کچھ سوچ بچار سے کام لیا اور حکومت کے ساتھ سیاسی کاموں میں بھی حصہ لیا۔ اگرچہ انہیں اس میں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ان کے علاوہ دوسرے گروہ اپنے پیروکاروں کو گوشہ نشینی کی تلقین کرتے ہیں جن میں سے بعض گروہ تو ایسے بھی ہیں جو مسلمانوں کے لئے میدان سیاست میں قدم رکھنے کو کفر قرار دیتے ہیں۔[2]

فقہائے سابقین کے حکومت دوستی پر مبنی فتووں کی وجہ سے اسلامی جماعتیں شدید اختلافات کا شکار ہیں اور اطاعت امیر کی ان کے یہاں یہ کیفیت ہے کہ جب ان کے سامنے قرآن مجید کی آیت وَمَنْ لَمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰئِکَ هُمُ الْکَافِرُوْنَ۝ ''اور جو بھی اللہ کے نازل کردہ فرمان کے مطابق فیصلہ نہ کریں گے تو وہ کافر ہوں گے۔'' (سورۂ مائدہ: آیت ۴۴) تلاوت کی جاتی ہے تو ان کی حالت دیدنی ہوتی ہے۔ وہ اس آیت کی ایسی تاویلیں کرنے لگ جاتے ہیں جو کسی صورت بھی آیت کے مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتیں اس کے لئے

۱۔ ابن تیمیہ نے منگول حکمرانوں کے دور میں یہ مشہور فتویٰ جاری کیا تھا کہ جو حکمران اسلامی قوانین کا اجرا نہ کرے اس سے جنگ کرنا جائز ہے۔ ابن تیمیہ نے یہ فتویٰ ان منگول حکمرانوں کے متعلق جاری کیا تھا جو اسلام قبول کر چکے تھے مگر تنازعات کے فیصلے کے لئے اپنے مورث اعلیٰ چنگیز خان کی کتاب ''الیاق'' پر انحصار کرتے تھے اور واضح رہے کہ چنگیز خان نے اپنی کتاب کی تالیف کے وقت چاروں آسمانی کتابوں اور اپنے خاندانی فیصلوں کو مدنظر رکھا تھا۔ حزب الجہاد نے ابن تیمیہ کے اس فتویٰ کو بنیاد بنا کر حکومت کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ اس فتویٰ کی مزید تفصیل کے لئے دیکھیں "فتاوی ابن تیمیہ" اور "الفریضۃ الغائبۃ"۔

واضح رہے کہ موخر الذکر کتاب محمد عبدالسلام فرج کی تالیف ہے اور اس کا تعلق ان پانچ افراد کے گروپ سے ہے جنہیں انور السادات کے قتل کے الزام میں سزائے موت دی گئی تھی۔

۲۔ سلفی گروہوں اور حزب الجہاد کی طرف سے بہت سے ایسے پینفلٹ تقسیم کئے گئے ہیں جن میں مسلمانوں کو سیاست کے میدان میں داخل ہونے سے روکا گیا ہے۔

یہ تاویل کی جاتی ہے کہ یہاں کفر سے مراد کفران نعمت ہے نہ کہ کفر حقیقی۔[1]

الغرض ہمارے دور کی تمام اسلامی تنظیمیں قرآن مجید کی اس آیت کو دور حاضر کے مسائل سے منطبق کرنے کی جرأت نہیں رکھتیں۔ یہی حال سابقہ فقہاء کا تھا اور یہی حال آج ان کے پیروکاروں کا ہے۔ آج کے اخوان المسلمین اور سلفی گروپ اسی پرانے نظریے کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں۔

اخوان المسلمین اور سلفی گروپوں کے برعکس حزب الجہاد اور قطبی جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ موجودہ حکمرانوں کو سابقہ حکمرانوں پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ ان کا خیال ہے کہ فقہاء نے سابقہ حکمرانوں کی مخالفت کو حرام قرار دیا تھا اور اُس دور کے حکمرانوں اور اس دور کے حکمرانوں میں بڑا فرق ہے۔ اُس دور کے حکمرانوں نے حدود اسلام سے پاؤں باہر ضرور نکالے تھے لیکن آج کے حکمران اس سے تجاوز کر کے دائرۂ کفر میں قدم رکھ چکے ہیں اور فقہائے سابقین کا اس سلسلے میں فتویٰ موجود ہے کہ ایسے حکام کے خلاف احتجاج کرنا اور قیام کرنا جائز ہے اور حدیث میں بھی یہ حکم موجود ہے۔

ہمارے سابقہ فقہاء نے اطاعت امیر کے وجوب کا جو فتویٰ دیا تھا اور اس کی تائید میں احادیث سے جو استدلال کیا تھا اس کی حقیقت بس یہی ہے کہ کوئی سچا مسلمان نہ تو ان احادیث پر مطمئن ہو سکتا ہے اور نہ ہی ایسے فتوے کو تسلی بخش قرار دے سکتا ہے۔

مذکورہ احادیث اور فتوے دیکھ کر میرے دل میں شکوک و شبہات نے جنم لیا اور مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ ایسی احادیث حکمرانوں کی خوشامد میں وضع کی گئی ہیں اور ان احادیث اور فتووں میں سیاسی بازیگروں کا بڑا عمل دخل ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ رسول خداؐ نے احکام الٰہی سے بغاوت کرنے والے حکمرانوں کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا ہوتا تو پھر نقش اسلام کو باقی رکھنے کی ضرورت ہی کیا

۱۔ صحیح مسلم کی حدیث میں وارد ہے کہ جب تم اپنے حکمرانوں سے صریح کفر دیکھو تو ان کے خلاف تمہیں خروج کی اجازت ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان الفاظ سے مسلمانوں کو حکومت وقت کے مظالم کے خلاف ہر قسم کی جدوجہد سے روکا گیا ہے۔

تھی؟ اور پھر ان احادیث کو دیکھ کر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام صرف اس لئے دنیا میں آیا تھا کہ وہ ستمگروں کو تحفظ فراہم کرے اور ظالم حکمرانوں کو اجازت دے کہ وہ بیت المال کو هٰذا مِنْ فَضْلِ رَبِّي سمجھ کر اپنی عیاشیوں کا سامان فراہم کریں اور غریب عوام کا استحصال کرتے رہیں لیکن ان کے خلاف کسی مظلوم کو آہ کرنے کی اجازت تک نہ ہو؟ کیا اسلام لٹیرے حکمرانوں کو تحفظ دینے کے لئے آیا ہے؟ کیا مظلوم کا تحفظ اس کے پروگرام میں شامل نہیں ہے؟

ہمارے فقہاء ہر دور میں حکومتوں سے وابستہ رہے تھے اور دربار کے وظیفہ خوار تھے اسی لئے انہوں نے حکام کے خلاف بات کرنے تک کو ناجائز قرار دیا اور ان کی اس غلط روش کا خمیازہ آج پوری امت کو اٹھانا پڑ رہا ہے۔ ہمارے فقہاء کی روش سو فیصد روح اسلام کے خلاف تھی اور آج ان کے فتووں کی وجہ سے اسلامی انقلاب کی صدا تک بلند نہیں کی جاسکتی اور اس کے لئے جو بھی تحریک اٹھے گی وہ ناکامی سے دوچار ہوگی۔

غرضیکہ اطاعت امیر کی روایتیں اور فتوے اسلامی جماعتوں کی شکست کا اصل سبب ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے فتووں نے پوری امت اسلامیہ کو حکمرانوں کے استبدادی پنجوں میں جکڑ کر رکھ دیا ہے اور آج کی تمام اسلامی جماعتوں کی ناکامی کو اسی فلسفے میں تلاش کرنا چاہئے۔[۱]

میں اپنی قوت یقین کے بل بوتے پر چاہتا تھا کہ حکمرانوں کی غیر مشروط اطاعت کی روایات کو ٹھکرادوں اور فقہائے سابقین کے فتووں اور ان کی تاویلوں کی بھی کھل کر تردید کروں اور چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاؤں کہ حکمرانوں نے اس طرح کی احادیث اس لئے وضع کرائی تھیں کہ وہ ان کی وجہ سے ہر قسم کے محاسبے سے آزاد ہو جائیں اور دل کھول کر قوم (رسول ہاشمیؐ) کا استحصال کرتے رہیں۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ میری اس طرح کی جرأت رندانہ میرے لئے وبال جان بن جائے گی کیونکہ اس دور میں اس طرح کے نظریات بیان کرنے کی معاشرے میں گنجائش نہیں تھی اور میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو پہلے ردعمل کے طور پر مجھے کافر اور ملحد

۱۔ ان احادیث نے اسلامی جماعتوں کی صفوں میں شگاف پیدا کیا اور ان کے اختلافات کھل کر سامنے آئے۔ حزب الجہاد، اخوان اور سلفی گروپ کے درمیان اس اختلاف کی شدت کہیں زیادہ دکھائی دی۔

کے خطابات سے نوازا جائے گا۔

پھر مصلحت کے تحت میں نے اپنے اس پروگرام کو دوسرے انداز سے شروع کیا۔ میں نے اپنے مضامین میں امیر کی غیر مشروط اطاعت کی وہ احادیث لکھیں جن میں کہا گیا تھا کہ حاکم خواہ ظالم کیوں نہ ہو اس کے خلاف قیام کرنا جائز نہیں ہے اور اس کے پہلو بہ پہلو میں نے رسول خداؐ کی ان احادیث کو نقل کیا جن کا مفہوم یہ تھا کہ ظالم حکمرانوں کی اطاعت حرام ہے اور ان کے خلاف قیام کرنا واجب ہے۔ لہٰذا ان احادیث کی موجودگی میں فقہاء کو امیر کی غیر مشروط اطاعت کا فتویٰ جاری کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے اور فقہاء کے پاس ان روایات کی توجیہ اور تقید کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

ایسی ہی روایات نے اسلامی جماعتوں کو اسلامی انقلاب کے متعلق سرگردانی میں مبتلا کیا کیونکہ ان روایات کی موجودگی میں اسلامی جماعتیں انور السادات کی حکومت کے خلاف کوئی بھی کارروائی کرنے کے مجاز نہیں تھیں اور مذکورہ فتووں اور روایتوں کی موجودگی میں وہ انور السادات کے خلاف کفر کا فتویٰ لگانے سے قاصر تھیں۔ پھر انہیں احادیث کی تاویل وتشریح کے بعد بڑی مشکل سے ابن تیمیہ کا ایک فتویٰ ہاتھ لگا جس میں اس نے یہ کہا تھا کہ "جو حکمران احکام شرعی کا اجراء نہ کرتا ہو اس کے خلاف جنگ کرنی چاہئے۔" اس فتوے کو انہوں نے اپنے لئے غنیمت جانا اور انور السادات کی مخالفت کے لئے اسے استعمال کیا اور یہ فتویٰ ان کے لئے اس وقت اور زیادہ کارآمد ثابت ہوا جب انور السادات نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں سیکولر پالیسیوں کا اعلان کیا اور کھل کر اسلامی حجاب کی مخالفت کی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اسلامی تنظیموں کے ساتھ ٹکراؤ کی پالیسی اپنائی۔[۱]

اور ادھر ہماری اسلامی تنظیموں کے قائدین بھی اسی دن کے منتظر تھے کہ انور السادات کھل کر کفر کا اظہار کرے اور وہ اس پر واجب القتل ہونے کا فتویٰ جاری کرسکیں۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو انور السادات کا حقیقی قاتل ابن تیمیہ ہے۔

۱۔ اگر ابن تیمیہ کا فتویٰ نہ ہوتا تو کسی کے پاس انور السادات کے قتل کا جواز نہ ہوتا اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انور السادات کا اصلی قاتل ابن تیمیہ ہے۔

خالد اسلامبولی تو فقط ایک مہرہ تھا جسے ضرورت پڑنے پر استعمال کیا گیا تھا۔

ملوکیت پرستی پر مبنی فقہی فتووں کی وجہ سے بات صرف انور السادات تک محدود رہی اور اگر فقہی پابندیاں نہ ہوتیں تو مصر میں اسلامی انقلاب بھی برپا کیا جاسکتا تھا۔

کتب عقائد

۱۹۷۰ء کی دہائی میں اسلامی تنظیموں کے قائدین کی ہدایت پر مندرجہ ذیل تین کتابیں بڑے پیمانے پر نوجوانوں میں تقسیم کی گئیں:

۱۔ العقیدة الطحاویة یہ کتاب طحاوی مصری کی تالیف ہے۔

۲۔ العقیدة الواسطیة یہ کتاب ابن تیمیہ کی تالیف ہے۔

۳۔ کتاب التوحید یہ کتاب محمد بن عبدالوہاب کی تالیف ہے۔

اس کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی نوجوانوں میں بڑے وسیع پیمانے پر تقسیم کی گئیں۔ مذکورہ کتابوں کا تعلق باری تعالیٰ کے اسماء و صفات نیز ایمان و شرک کے مسائل سے ہے اور یہ کتابیں تقسیم کرتے وقت نوجوانوں کو یہ باور کرایا گیا کہ ان امور کے نہ جاننے کی وجہ سے ان کا ایمان ضائع ہوسکتا ہے اور ان کے اعمال اکارت بھی جاسکتے ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کتابوں کا تعلق اصول سیاست وفکر اور اجتہادی مسائل سے زیادہ ہے اور عقیدہ و ایمان و کفر کے ساتھ ان کا کوئی بھی واسطہ نہیں ہے۔ ان کتابوں کی تقسیم کا مقصد یہ تھا کہ نوجوانوں کے افکار کو ایک مخصوص فکر کی تیزاب میں ڈالا جائے اور جب وہ ملائم ہو جائے تو اسے حسب منشا موڑا جاسکے۔

میں نے ان کتابوں کو اچھی طرح سے پڑھا تو اپنے آپ سے یہ سوالات کئے:

۱۔ چار خلفاء اور عقیدے کا باہمی ارتباط کیا ہے؟

۲۔ اس کے لئے کون سی شرعی دلیل وارد ہوئی ہے؟

۳۔ طبقۂ حکام کا عقیدے سے کیا ارتباط ہے اور آخر ان کی اطاعت اور ان کی اقتدا میں نماز پڑھنا اور ان کے ساتھ حج کرنا اور ان کے پرچم تلے جہاد کرنے کو عقیدے کا

حصہ قرار دینے میں کون سی مصلحت ہے؟

۴۔ فقہاء کو وہ کون سی مجبوری لاحق ہے جس کے تحت وہ ہر نیک اور بد کی اقتدا میں نماز پڑھنے پر امت کو مجبور کر رہے ہیں؟

۵۔ فقہاء نے ایسا نظریہ قبول کیوں کیا جو کہ صریحاً قرآن اور عقل کے خلاف تھا؟[۱]

۶۔ فقہاء ہر وقت امت کو یہ درس کیوں دیتے رہے کہ اہلبیت رسولؐ کو دیوار کے ساتھ لگادیں اور اسے عقیدے کا حصہ بنانے کی کیا ضرورت تھی؟

۷۔ ہمارے علماء نے عقائد کی کتابوں کے نام اپنے ناموں سے کیوں منسوب کئے اور انہیں **عقائد طحاویه، عقائد نسفیه، عقیدة حمویه** اور **عقیدة واسطیه** جیسے نام رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟[۲]

اور مزید یہ کہ اسی طرح کے نام کیا عیسائی مذہب کی انجیلوں سے مطابقت نہیں رکھتے جیسے انجیل متی، انجیل لوقا، انجیل یوحنا اور انجیل مرقس وغیرہ۔ کیا ناموں کی یہ مماثلت محض اتفاق ہے یا اس کے پس منظر میں کوئی اور کہانی ہے؟

ایک طویل اور گہری سوچ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان تمام امور کا عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے جبکہ کتب عقائد میں موجود یہ اصول و مفاہیم سیاست کے پیدا کردہ ہیں جنہیں امت اسلامیہ پر زبردستی ٹھونسا گیا ہے اور اس کے لئے فقہاء نے اہم کردار ادا کیا ہے۔[۳]

لیکن اس نتیجے پر پہنچ کر بھی میری تشفی نہیں ہوئی کیونکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ ان کتب عقائد کی نشر و اشاعت میں ایک قوی سبب کا ہونا ضروری ہے اور واضح رہے کہ یہ تفسیر اس

۱۔ عقائد السنه و عقائد الشیعة۔ سنی فقہاء کے ہاں ایسی روایات بکثرت موجود ہیں جن سے خدا کا مجسم ہونا ثابت ہوتا ہے۔

۲۔ "عقائد نسفی" کے علاوہ مذکورہ کتابیں مفت تقسیم کی جارہی ہیں۔

۳۔ ان کتابوں سے بغدادی کی "الفرق بین الفرق" اور شہرستانی کی "الملل والنحل" اور اشعری کی "مقالات الاسلامیین" کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔

مطلب کی تکمیل نہیں کرتی بلکہ یہ اہلسنت کے فائدے میں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ روایت [1] اس دعویٰ کے اثبات کی واحد دلیل ہے جس سے وہ تمسک کرنا چاہتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس کی دلالت بھی ظنی ہے اور اس سے قطعی مفہوم اخذ کرنا صحیح نہیں ہے۔ (فقه الهزيمة)

اگر اہلسنت کی اس منطق کو مان لیا جائے تو اس کا مفہوم اول و آخر یہی ہوگا کہ ان کے علاوہ باقی تمام اسلامی فرقے کافر ہیں اور حق صرف ان کے فرقے میں منحصر ہے جبکہ عقل سلیم اس بات کو ماننے پر ہرگز آمادہ نہیں ہے کیونکہ ان کے مخصوص فرقے کو دوسرے فرقوں پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے اور جس چیز کے وہ دعویدار ہیں وہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے جس میں ثواب اور خطا کا یکساں امکان پایا جاتا ہے۔ (عقائد السنة و عقائد الشيعة)

کتب عقائد دراصل اہلسنت کو ہی فرقہ ناجیہ ثابت کرتی ہیں اور نوجوانوں میں ان کتابوں کی تقسیم کا مقصد ہی یہی ہے کہ نوجوان ان میں بیان کردہ نظریات کو حرف آخر تسلیم کرتے ہوئے ان کے سامنے گردنیں جھکا دیں اور کسی جواب و سوال اور قید و شرط کے بغیر ان کی باتوں کو قبول کرلیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی کئی سالوں تک اس اندھی عقیدت میں مبتلا رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل سے میری عقل نے مجھے اس گرداب سے نجات دلائی اور میری رہنمائی کی۔

فرقۂ ناجیہ کے نظریات کی باتیں کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ فرقہ ناجیہ بنی امیہ اور بنی عباس کی پیروی کا نام نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ امویوں اور عباسیوں نے یکساں طور پر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی ہے اور انہوں نے خونریزی کی ایک تاریخ رقم کی ہے لہٰذا ایسے سفاک اور عیاش حکمرانوں کی پیروی سے انسان فرقۂ ناجیہ کا فرد نہیں بن سکتا۔

فرقۂ ناجیہ کا تعلق ان فقہاء سے بھی کبھی نہیں ہوسکتا جنہوں نے ظالم اموی و عباسی حکمرانوں کی ہر ہر مرحلے پر تائید و توثیق کی اور انہیں عامۃ المسلمین کے غم و غصے سے بچانے کے لئے خود ساختہ فتووں کی چھتری فراہم کی۔

۱۔ اس روایت کو ابوداؤد، احمد بن حنبل اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ روایت معاویہ کی بیان کردہ ہے اس لئے اس پر خوب غور کرنا چاہئے۔ شیخ الازہر عبدالحلیم محمود نے اپنی کتاب التفكير الفلسفي في الاسلام میں اس روایت پر جرح کی ہے اور غزالی نے بھی اپنی کتاب [illegible]

فرقۂ ناجیہ کا تعلق رسول خداؐ کی توہین کرنے والوں سے بھی نہیں ہوسکتا۔ انسان کی عقل و وجدان اس بات کو کیسے قبول کرسکتا ہے کہ یزید بن معاویہ جیسے شخص کا تعلق بھی فرقۂ ناجیہ سے ہے۔ ایسے تمام افراد جو رسوائیوں کے تالاب میں غوطہ لگانے کے عادی ہیں اور انحرافات کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں، وہ کبھی بھی اہل نجات میں سے قرار نہیں پائیں گے۔ لہٰذا اس حدیث سے کوئی دوسرے مسلمان مراد ہیں۔

فرقۂ ناجیہ کی کھوج نے ہی مجھے بہت سی شخصیات کے سحر سے نجات دی کیونکہ جب تک میری عقل کے گرد پہرے لگے ہوئے تھے میں صحابہ و فقہاء کے متعلق صحیح تحقیق کرنے کا قائل نہیں تھا اور یہ ایک واضح سی بات ہے کہ جب تک کسی کی عقل کسی شخصیت کے طلسم میں گرفتار ہو اور وہ اپنے آپ کو کسی دلیل کے بغیر فرقہ ناجیہ کا فرد تصور کرتا ہو تو اس کے لئے حقائق کا تلاش کرنا اور حقائق کی پیروی کرنا انتہائی دشوار ہے اور انسان تحقیق کی دنیا میں اس وقت قدم رکھے گا جب وہ اپنے آپ کو فرقہ ناجیہ کے ہالے سے باہر نکالے گا۔

ہاں البتہ کتب عقائد کی نشر و اشاعت کا اسلامی تنظیموں کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ انہوں نے نوجوانوں کو یہ باور کرایا کہ ان کا تعلق ناجی فرقے سے ہے اور جب نوجوانوں کے ذہن میں یہ غلط نکتہ بیٹھ گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے اپنے فرقے کے علاوہ باقی تمام فرقوں بالخصوص شیعوں سے بغض و عناد رکھا۔ اسی غلط روش کی وجہ سے نوجوانوں کی صلاحیتیں تباہ و برباد ہوگئیں اور وہ زندگی کے حقائق کو سمجھنے سے قاصر رہے اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے ان پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔

اتباع و پیروی

مصر میں یہ بات میرے لئے انتہائی تعجب کا باعث ثابت ہوئی کہ اسلامی تنظیمیں ابن تیمیہ اور اس کے پیروکاروں کی اتباع پر ہی کیوں زور دیتی ہیں اور جب میں نے اس معاملے پر غور کیا تو یہ سوالات میرے سامنے آکر کھڑے ہوگئے:

۱۔ ابن تیمیہ اور اس کے پیروکاروں میں آخر ایسی کون سی خصوصیت پائی جاتی ہے جس کی

وجہ سے اسلامی قائدین لوگوں کو ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں؟

۲۔ ابن تیمیہ سے پہلے جتنے علماء گزرے ہیں کیا وہ سب باطل پر تھے اور ان کا کیا بنے گا؟

۳۔ نوجوانوں میں مروج مذاہب کو رد کرنے کے جذبہ کو اتنی شدت سے رواج دینے کی کیا ضرورت ہے؟

اس باب میں، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ چند خفیہ ہاتھ نوجوان ذہنوں کو پہلے سے مقرر شدہ مرکز سے بدول کرنا چاہتے ہیں اور ان کا ہدف یہ ہے کہ جب نوجوان اپنی فقہ سے بدول ہوجائیں گے تو انہیں آسانی سے ٹریپ کیا جاسکے گا۔

جب میں نے وہابیت کا لٹریچر پڑھا تو ان سوالات کے جوابات دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا اور مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہی وہ نظریہ ہے جس نے نوجوانوں اور مختلف تنظیموں میں رخنہ ڈالا ہے اور وہابیت کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ دوسرے اسلامی مذاہب کو حقیر سمجھا جائے اور ابن تیمیہ اور اس کے ہم مسلک افراد کو اسلامی دنیا کا ہیرو تسلیم کرایا جائے اور اس سلسلے میں عجیب بات یہ ہے کہ وہابیت ایک طرف سے اس بات کی دعویدار ہے کہ وہ کسی کی تقلید نہیں کرتی، صرف حدیث کی پیروی کرتی ہے اور مذاہب اربعہ میں سے ان کا کسی کے ساتھ کوئی الحاق نہیں ہے جبکہ یہ دعویٰ سراسر جھوٹ ہے کیونکہ وہابی امام احمد بن حنبل کے پیروکار ہیں اور پھر اس کے بعد وہ ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب کے مقلد ہیں۔[1]

میں اس حقیقت کو پانے میں کامیاب ہوگیا کہ وہابی تقلید کے مخالف نہیں ہیں البتہ عوام الناس کو مشہور ائمہ کی تقلید سے نکال کر ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب کی تقلید کے دائرے میں لانے کے خواہش مند ہیں۔ یہ لوگ تقلید شخصی کے ہرگز مخالف نہیں ہیں البتہ مسلمانوں کو امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کی تقلید سے نکال کر ابن تیمیہ کی تقلید میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ بعض معاصرین کو یہ اشتباہ ہوا ہے کہ وہابیت سلف صالحین کی پیروی پر یقین رکھتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہابیت کا سلف صالحین سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہابیت ابن تیمیہ کی پیروی پر یقین رکھتی ہے اور ابن تیمیہ کی پوری زندگی اپنے مخالفین کے ساتھ تنازعات میں بسر ہوئی تھی۔

اسی لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں نے کوئی نئی بات پیش نہیں کی ہے۔ اس کی بجائے انہوں نے نوجوانوں کو فریب دے کر ان کے مسلمہ فقہی مذاہب سے دور کیا اور انہیں ایک ایسے محدود دائرے میں لے آئے ہیں جو کہ عامۃ المسلمین سے بڑے فاصلے پر واقع ہے۔[1]

حزب التکفیر نے جب تقلید کی مخالفت میں آواز بلند کی تھی تو اس کے پیروکار بھی اسی گمراہی میں مبتلا ہوئے تھے۔ اس سے پہلے لوگ مشہور فقہاء کی تقلید کرتے تھے۔ اس کے بعد لوگ حزب التکفیر کے قائد شکری مصطفیٰ کی تقلید کرنے لگ گئے (بالفاظ دیگر تقلید تو ہر دور میں باقی رہی البتہ مراجع بدلتے گئے)۔

علاوہ ازیں دوسرے اسلامی مذاہب کے تقابلی مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ:

۱۔ تمام سابقہ مذاہب مکتب اہلبیتؑ کو رد کرنے پر متفق اللسان ہیں۔

۲۔ ان لوگوں نے مکتب اہلبیتؑ کو صرف چند سیاسی اغراض کی وجہ سے رد کیا ہے۔

۳۔ اسلام کے مشہور فقہاء مالک، ابوحنیفہ اور شافعی ائمہ اہلبیتؑ کے شاگرد تھے۔

۴۔ اسلامی مذاہب میں سے شیعہ وہ واحد مذہب ہے جس نے احکام دین کو اہلبیت رسولؐ سے ہی حاصل کیا ہے۔

۵۔ حنبلی مذہب، خاص کر ابن تیمیہ کا گروہ اس مکتب کا بدترین دشمن ہے۔

۶۔ ابن تیمیہ تمام سنی علماء کی بہ نسبت شیعوں سے زیادہ دشمنی اور عداوت رکھتا تھا۔

ان تمام نتائج کو جمع کرنے سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اس وقت اسلامی دنیا میں بہت سے نظریات رائج ہیں اور سب کے سب سیاست کی پیداوار ہیں اور ان نظریات کے عین درمیان ایک نظریہ ایسا بھی ہے جس سے تمام نظریات دشمنی رکھتے ہیں۔[2]

۱۔ الدرر الکامنۃ فی ایان المائۃ الثامنۃ، ج۱، ص۱۴۴ تا ۱۶۰۔ اہلسنت کی طرف سے ابن تیمیہ کے فتویٰ کو تسلیم کرنا انتہائی تعجب خیز ہے کیونکہ علمائے اہلسنت نے اس کی مخالفت کی تھی اور اس پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا اور اس دور کے فقہاء کے فتویٰ کے تحت اسے زندان میں بھیجا گیا تھا جہاں اس کی وفات ہوئی تھی۔

۲۔ عباسی خلفاء، صلاح الدین ایوبی اور ظاہر بیبرس نے مذاہب کی تائید کی تھی اور اس تائید کا مقصد مکتب اہلبیت کو نقصان پہنچانا تھا۔

وہ نظریات مذاہب اسلامیہ کی شکل میں موجود ہیں اور جس نظریے کی مخالفت پر ان سب مذاہب کا اتفاق ہے وہ نظریہ مذہب اہلبیت کہلاتا ہے۔

اس حقیقت کے اظہار کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمام مذاہب مذہب اہلبیت سے آخر کیوں لڑ رہے ہیں اور اس دشمنی کی کیا وجہ ہے؟ اور اس کے ساتھ یہ سوال بھی ابھر کر سامنے آتا ہے کہ مذہب اہلبیت کیا ہے اور وہ کس نظریے کی پیروی کرتا ہے؟

فطری بات ہے کہ اس کا جواب میری قوم سے مجھے نہ مل سکا کیونکہ سیاست کے تقاضوں نے اہلبیت کی تمام خصوصیات کو لوگوں کے اذہان سے محو کردیا ہے اور اگر کچھ تذکرہ بچا بھی ہے تو وہ صرف اتنا کہ جس سے حکمرانوں کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔

جس دن سے معاویہ نے اقتدار سنبھالا اور بنی امیہ تخت نشین ہوئے اس دن سے امت کو اہلبیتؑ کی دشمنی کا سبق پڑھایا گیا۔ تمام بلاد اسلامی میں منبروں پر کھلم کھلا حضرت علیؑ اور ان کی اولاد پر سب وشتم کیا جاتا تھا اور بات یہاں تک محدود نہ رہی بلکہ حضرت علیؑ، ان کی اولاد اور ان کے شیعوں کو بڑی بے دردی سے قتل کیا گیا اور ان کی میراث اور ان کے علوم کو نابود کردیا گیا اور ان مقاصد کی تکمیل تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ (**السیف والسیاسة فی الاسلام**، ص۱۳۳و۱۳۴)

یہ وہ دور تھا جب بی بی عائشہؓ، ابن عمر اور ابوہریرہ احادیث رسولؐ کے سرکاری راوی قرار پائے تھے اور لوگ انہیں اسلام کا حقیقی ترجمان سمجھتے تھے اور ان کی بیان کردہ روایات پر عمل کرتے تھے اور ان کی تعلیمات کے نتیجے میں لوگ آل محمدؐ کے مخالف بن گئے۔

یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ آل محمدؐ سے دشمنی آج کی نہیں بلکہ اس کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور اس دشمنی کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی جب موجودہ مذاہب کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ آل محمدؐ سے دشمنی کی تکمیل معاویہ کی رہنمائی میں انجام پائی۔ معاویہ نے لوگوں کو ان افراد کی طرف متوجہ کیا تھا جو اس کی حکومت کو جائز سمجھتے تھے اور معاویہ کے نظریات سے دشمنی نہیں رکھتے تھے۔ ایسے تمام افراد جو حضرت علیؑ کی رہبری میں خط اہلبیتؑ کی پیروی کرتے تھے، معاویہ نے ان سے کھلم کھلا دشمنی کا اظہار کیا اور انہیں

معاشرے سے الگ تھلگ کر کے رکھ دیا تھا۔

حکام نے امت کو ایک راستا دکھایا اور پوری امت کو اس راستے پر چلنے کی تلقین کی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ اہلبیتؑ کے راستے کو پوری حکومتی طاقت سے دبایا گیا اور عوام الناس کی نظروں سے اسے اوجھل رکھنے کی کوششیں کی گئیں جس کی وجہ سے امت بے خبر ہو کر حکام کے مقرر کردہ راستے پر چلنے لگی اور آج کے یہ جدید اسلامی گروہ بھی سابقہ حکام کے بچھائے ہوئے دام میں پھنسے ہوئے ہیں۔

لہٰذا جب میں اس غلطی سے واقف ہوگیا اور لوگوں کے نظریات کا اختلاف میرے سامنے واضح ہوگیا تو میں نے اپنے آپ کو فرقہ ناجیہ کہلانے والوں کے افکار سے آزاد محسوس کیا اور اس کے ساتھ ہی میرے دل میں مذہب اہلسنت کی پیروی کے متعلق شکوک وشبہات نے جنم لیا۔ اس مرحلے پر میرے لئے ضروری تھا کہ میں ماضی سے نجات حاصل کروں اور سالہا سال سے پڑی ہوئی زنجیروں کو اپنی گردن سے اتار پھینکوں اور اس کے بعد آزادی سے شرعی پیروی کے لئے تلاش وجستجو کروں۔

دین و میراث

میں اکثر اپنے آپ سے پوچھا کرتا تھا کہ جو کچھ اس وقت ''بنام دین'' ہمارے ہاتھ میں ہے آیا یہ دین ہے یا میراث؟

اس سلسلے میں مشہور تو یہی تھا کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ دین ہے۔ میں بھی ایک عرصے تک یہی باور کرتا رہا کیونکہ میں نے اسی طرز فکر میں آنکھ کھولی تھی اور اسی میں پلا بڑھا تھا لیکن تجربے اور رشد فکری کے بعد میں دین اور میراث کا فرق سمجھنے کے قابل ہوگیا اور اس کے ساتھ یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ مسلمانوں کی فکری جنگ میراث کی اساس پر لڑی جارہی ہے اور اس جنگ کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے اس بات کا بھی یقین ہوگیا کہ موجودہ اسلامی جماعتوں کی آئیڈیالوجی بھی میراث کی اساس پر قائم ہے اور متون حدیث اور دین کی اساس ان کے ہاں بھی مفقود ہے اور اخوان المسلمین، سلفی اور جہادی گروپوں اور حکومت کی وفادار اسلامی جماعتوں کے اصول فکر میں میراث ہی جلوہ گر دکھائی دیتی ہے اور اگر ان جماعتوں کے علاوہ ہم ان سے جدا ہونے والی جماعتوں بالخصوص حزب التکفیر پر نظر کریں تو یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔[۱]

فقہاء کے فتوں، خطبوں اور ان کی کتابوں میں متون دین کی بجائے میراث کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جب میں اس حقیقت کو سمجھ گیا تو مجھے یقین ہوگیا کہ اب تک میں دھوکا کھاتا رہا اور مزید یہ کہ موجودہ اسلامی جماعتوں کے نظریات دھوکے کی ٹٹی ہیں اور بس! پھر اس کے بعد میں نے میراث کو خیر باد کہا اور دین کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

۱۔ مزید تحقیق کیلئے اخوان المسلمین کی شائع کردہ کتاب دعاۃ لاقضاۃ دیکھیں۔ مذکورہ کتاب حزب التکفیر کی رد میں لکھی گئی تھی۔ علاوہ ازیں الحرکۃ الاسلامیۃ فی مصر کا مطالعہ بھی مفید رہے گا۔

اس بحث کو شروع کرنے سے قبل ہم میراث اور دین کا مفہوم بیان کریں گے اور اس ذریعے سے ہم یہ بتانے کے قابل ہوسکیں گے کہ دین اور میراث میں کیا فرق ہے کیونکہ اس کے بغیر ہمیں یہ معلوم کرنے میں دشواری پیش آئے گی کہ کس کس مقام پر دین کی جگہ میراث نے لے لی ہے۔

دین کیا ہے؟

دین ان نصوص کا نام ہے جنہیں ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے تھے اور لوگوں کو ان کی تبلیغ فرمائی تھی۔ دین اس حرکت کا نام ہے جو خدا اور بندے کے درمیان ارتباط قائم کرتی ہے جس سے انسان میں عقیدے اور شریعت الٰہی سے وفاداری پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے نبی پاکؐ جو کتاب لائے ہیں وہ اس دین کے اصول و قوانین کی جامع ہے۔ لہٰذا اس کتاب سے تجاوز کرنے یا اس سے پھر جانے کو دین سے خروج اور کفر سے تعبیر کیا جائے گا۔

تورات نے دین یہود کی تبلیغ کی اور انجیل نے عیسائیوں کے دین کی اور قرآن مجید نے مسلمانوں کے دین کی تبلیغ کی۔ لہٰذا قرآن مجید اور اس کی وضاحت میں پیغمبر اکرمؐ کے فرامین مسلمانوں کے دین کی اساس ہیں اور قرآن اور احادیث رسولؐ دین کا واحد سرچشمہ ہیں۔ قرآن و حدیث کے علاوہ کسی اور سرچشمے کی تلاش دین سے انحراف اور دین کی عملی نفی ہے۔ اس سے قبل ہم ابن تیمیہ کا فتویٰ بیان کر چکے ہیں جو اس نے منگول حکمرانوں کے کفر کے متعلق صادر کیا تھا کیونکہ ان حکمرانوں کا جرم یہ تھا کہ وہ قبول اسلام کے بعد قرآن کی بجائے چنگیز خان کی کتاب ''الیاقی'' کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اکرمؐ پر یہ ذمے داری عائد کی گئی تھی کہ آپ قرآن مجید کی آیات کی تبلیغ و ترویج کریں گے اور آیات قرآن کی وضاحت کریں گے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغ. ''رسولؐ کی ذمہ داری صرف احکام کا پہنچا دینا ہے۔'' (سورۂ مائدہ: آیت ۹۹)

رسول اکرمؐ کی وضاحت ہمیشہ قرآن مجید کی حدود کے اندر ہی ہوتی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ہر گفتگو کو وحی قرار دیا ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ "وہ اپنی خواہش سے گفتگو نہیں کرتے۔ وہ تو وہی کہتے ہیں جو وحی کہتی ہے۔" (سورۂ نجم: آیت ۳و۴)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لبوں پر وحی کی مہر اس لئے لگائی تاکہ دین میں انسانی خواہشات کو داخل ہونے سے روکا جائے۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ لوگ پہلے نقش رسولؐ کو سمجھیں کیونکہ نقش رسولؐ کا سمجھنا قرآن فہمی کا مقدمہ ہے اور قرآن فہمی ہی دین فہمی ہے۔ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد آپ کی طرف سے قرآن کی توضیح وتشریح کا باب بند ہوگیا لیکن نقش قرآن قیامت تک باقی رہے گا۔

قرآن مجید دین کا وہ واحد سرچشمہ ہے جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے اور قرآن مجید کے متعلق مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ قرآن مجید کے علاوہ دین کے دوسرے ماخذ بالخصوص سنت نبویؐ اور احادیث نبوی میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔

سنت دراصل قرآن کی وضاحت کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے وضاحت کو قرآنی قیود میں محدود ہونا چاہئے اور وہی وضاحت قابل قبول ہے جو قرآنی حدود و قیود سے متجاوز نہ ہو۔ مگر ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی افسوس ہوتا ہے کہ یار لوگوں نے ایسی روایات بھی اللہ کے رسولؐ کی طرف منسوب کردیں جو قرآنی احکام کے صریحاً خلاف تھیں۔ چنانچہ اسی لئے ایسی تمام روایات و احادیث کو رد کردینا چاہئے۔ اس کے برعکس ہمارے فقہاء و محدثین نے ایک اور وطیرہ اختیار کیا یعنی جو روایت انہیں اپنے اصولوں کے تحت صحیح محسوس ہوئی انہوں نے دوسرے مسلمانوں کو اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا اور یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی کہ آیا وہ روایت قرآن مجید کے مطابق بھی ہے یا نہیں۔

محدثین کے نزدیک صحت کا پیمانہ اسناد کا صحیح ہونا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے نزدیک اور کوئی شرط نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کسی حدیث کے راوی عادل اور سچے ثابت ہوجائیں تو محدثین کے نزدیک وہ روایت صحیح ہے اور محدثین یہ کبھی نہیں دیکھتے کہ کیا یہ روایت جزوی یا کلی طور پر قرآن کے مطابق ہے یا مخالف ہے اور ان کی جسارت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ بہت سے

فقہاء کے نزدیک حدیث قرآن مجید کی ناسخ ہوسکتی ہے!!

اس کے لئے ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

ایک حدیث میں وارد ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کی موجودگی میں بیوی کی پھوپھی یا خالہ سے نکاح نہیں کرسکتا اور اتفاق سے محدثین کے نزدیک یہ حدیث ازروئے اسناد صحیح ہے۔ جبکہ قرآن مجید میں حرام عورتوں کی مکمل فہرست موجود ہے اُس میں اس رشتے کی حرمت کا سرے سے ذکر ہی موجود نہیں ہے۔ (صحیح بخاری کتاب النکاح، ج۷، ص۱۵)

یقیناً اس طرح کے نظریات کو قبول کرنا اور قرآن مجید کی مخالف احادیث پر عمل کرنا اختلاف اور دردسر کا موجب ہے۔ اگر یہ بات ہمارے لئے ثابت ہوجائے کہ پیغمبر اکرمؐ کی ذمے داری احکام الٰہی کی تبلیغ تک محدود تھی اور آپ وحی الٰہی کی تشریح کرتے تھے، تو ہمارے لئے دین کے حدود واضح ہوجائیں گے۔ نبی اکرمؐ اپنی طرف سے احکام قرآن کے علاوہ کوئی حکم جاری کرنے کے مجاز نہیں تھے۔

میراث کیا ہے؟

میراث سے مراد ہے اقوال و روایات، توجیہ و تاویل اور تاریخ و فقہ و تفسیر سے حاصل ہونے والے اجتہاد کا مجموعہ۔ اس میں دین کے زیر سایہ حاصل ہونے والی عقلی توجیہات بھی شامل ہیں۔ دین اور میراث کے فرق کو یوں واضح کیا جاسکتا ہے:

- دین ہی اصل حق اور عین حقیقت ہے، میراث اس حق کے متعلقات کا نام ہے۔
- دین ہمیشہ ثابت رہنے والی حقیقت ہے، میراث تغیر پذیر ہے۔
- دین میں کسی چیز کو داخل نہیں کیا جاسکتا اور اس میں کسی طرح کی کمی بیشی نہیں ہوسکتی مگر میراث کو قبول بھی کیا جاسکتا ہے اور ٹھکرایا بھی جاسکتا ہے۔
- دین انسان کے لئے خدا کا پیغام ہے جبکہ میراث نص اور انسان کے درمیان اجتہاد کا نام ہے۔
- اور اجتہاد کی مخالفت کرنے سے نص کی مخالفت لازم نہیں آتی۔

ہمیں نص و اجتہاد، دین اور اقوال افراد اور نصوص شرعی قرآنی اور نصوص وضعی اجتہادی کے فرق کو جاننا ہوگا اور اس فرق کو جانے بغیر ہم حقیقت دین سے ناآشنا رہیں گے اور خدائی فرامین پر صحیح عمل نہیں کرسکیں گے۔

اب ہمیں اپنی حالت پر غور کرنا چاہئے۔ اگر ہم نے قرآن کی مخالف روایات و احادیث پر توقف کیا تو اس سے لازم آئے گا کہ ہم نے نص اور اقوال کے درمیان فرق کیا ہے۔ اگر بالفرض ہم نے لوگوں کے اقوال کو نصوص کے برابر جانا تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ ہم یہود و نصاریٰ کی طرح سے مذکورہ افراد کو اپنا رب تسلیم کر چکے ہیں کیونکہ یہود و نصاریٰ بھی اپنے علماء و مشائخ کو رب مانتے تھے اور احکام خداوندی کے مقابلے میں ان کے خود ساختہ احکام پر عمل کرتے تھے اور ہمارا یہ عمل گواہی دے گا کہ ہم نے دین اور میراث میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔

معاصر اسلامی تحریکیں بالعموم اور حزب التکفیر بالخصوص اسی مشکل سے دوچار ہوئی کیونکہ اس نے میراث میں حاصل ہونے والے اجتہادات اور اختلافی احادیث کو بنیاد بنا کر احکام وضع کئے اور اس کے نتیجے میں وہ فکری طور پر شکست کھا گئی اور اسلامی انقلاب برپا کرنے میں ناکام رہی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نص اجتہاد پر فوقیت رکھتی ہے یا اجتہاد نص پر فوقیت رکھتا ہے؟ اصولی طور پر اس کا جواب یہی ہے کہ نص اجتہاد پر مقدم ہے اور اجتہاد نص کی پیداوار ہے۔ اب اگر ہم اس روش و قاعدے کو سابقہ اور موجودہ اسلامی نظریات پر تطبیق کرنے لگ جائیں تو ہم یقیناً آسانی کے ساتھ حق کی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ اس کے لئے بطور نمونہ ہم آپ کے سامنے اپنی اس گفتگو کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جو ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ہمارے اور حزب التکفیر کے درمیان ہوئی تھی۔

حزب التکفیر کا نظریہ تھا کہ جو شخص گناہ پر اصرار کرے اور جو شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو اور جو شخص تقلید کرے وہ کافر ہے اور اس کے ساتھ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ حق ان کے گروہ میں ہی منحصر ہے اور یہ کہ ہجرت واجب ہے۔

ان کے ان ہی نظریات کے تناظر میں ہم نے ان کے سامنے یہ سوال اٹھایا کہ آپ

کے یہ نظریات و افکار نص پر مبنی ہیں یا نص کے مقابلے میں اجتہاد پر مبنی ہیں؟

اس سوال نے حزب التکفیر کو سخت مشکل میں ڈال دیا کیونکہ اگر وہ یہ جواب دیتے کہ ہمارے نظریات نص پر مبنی ہیں تو وہ اس غلط جواب کی وجہ سے خود کافر قرار پاتے تھے کیونکہ اس بارے میں نہ قرآن مجید میں کوئی آیت موجود ہے نہ پیغمبر اکرمؐ کی کوئی حدیث وارد ہے۔

اگر حزب التکفیر جواب میں یہ کہتی کہ ہمارے نظریات اجتہاد پر مبنی ہیں تو لوگوں کو اس کی پیروی کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی تھی کیونکہ اجتہاد کا تعلق ظن پر ہوتا ہے اور اس کا قبول کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ چاہے تو اجتہاد کو قبول کرے اور چاہے تو اسے رد کردے۔

اس جواب سے حزب التکفیر کی اساس ہی سرے سے منہدم ہوجاتی ہے کیونکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ امت اسلامیہ نے فقہاء کے اجتہاد کو قبول کر کے اور ان کی تقلید کر کے کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ جب سابقہ فقہاء کا اجتہاد حرام ہے تو حزب التکفیر کا اجتہاد کیونکر جائز ہوسکتا ہے؟

یہود و نصاریٰ نے بھی اپنے علماء و مشائخ کے خود ساختہ اجتہادات کو تسلیم کر کے غلطی کی تھی اور یہی بدبختی امت اسلامیہ کے افراد میں بھی در آئی کیونکہ امت اسلامیہ کے افراد نے نص قرآن اور نص حدیث کے بالمقابل ''شخصیات'' کے اجتہاد کو اہمیت دی۔ لہٰذا عملی طور پر یہود و نصاریٰ اور امت اسلامیہ کے اکثر افراد مساوی حیثیت اختیار کر گئے۔

حزب التکفیر نے عجیب دو عملی کا مظاہرہ کیا۔ ایک طرف سے تو اس نے اپنے پیروکاروں کو ''شخصیات'' کی تقلید سے نجات دلائی اور لوگوں کو یہ باور کرایا کہ سابقہ مذاہب اور فقہاء کی تقلید حرام ہے مگر دوسری طرف سے انہوں نے لوگوں کو اپنے گروہ کے بانی شکری مصطفیٰ کے اجتہادات قبول کرنے کی دعوت دی اور لوگوں کو اس کی تقلید کی ترغیب دی اس طرح لوگ ایک بھنور سے نکل کر دوسرے بھنور میں پھنس گئے۔ حزب التکفیر کی ترغیب پر لوگوں نے ایسے فقہاء کی پیروی کو خیرباد کہہ دیا جن کا عقیدہ تھا کہ گناہ پر اصرار کرنے والا، گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا، کسی فقیہ کی تقلید کرنے والا اور ہجرت کو رد کرنے والا مسلمان ہے کافر نہیں

اس کی بجائے لوگوں نے اس شخص کی پیروی کی جو مذکورہ افراد کو کافر قرار دیتا تھا۔

حزب التکفیر کے خود ساختہ فیصلے کے تحت کہ "جو تقلید کرے وہ کافر ہے" خود حزب التکفیر کافر ثابت ہوتی ہے کیونکہ یہ گروہ شکری مصطفیٰ کا مقلد ہے اور اس طرح حزب التکفیر نے جو گڑھا دوسروں کے لئے کھودا تھا وہ خود اس میں گرگئی اور اپنے بچھائے ہوئے دام میں اس کا قدم پھنس گیا۔ اسی بنا پر حزب التکفیر کے نظریات ہرگز قابل اجراء نہیں ہیں۔

علاوہ ازیں سابقہ فقہاء کے دعوے اور حزب التکفیر کے دعوے میں بھی بڑا فرق پایا جاتا ہے کیونکہ سابقہ فقہاء میں سے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ اس کے اجتہاد کو تسلیم کرنا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے اور ان کے اجتہاد کو رد کرنے والا کافر ہے۔ اس کے برعکس حزب التکفیر اس شدید غلط فہمی کا شکار ہے کہ اس کے تمام اقوال نص اور نازل شدہ وحی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اگر ملت اسلامیہ نص قرآن و نص حدیث اور لوگوں کے شخصی اجتہادات کے درمیان فرق کو تسلیم کرلے اور نصوص کو اصل دین قرار دے اور اجتہاد کو عارضی حیثیت دینے لگ جائے تو حقیقت واضح ہوسکتی ہے اور دین اپنی خالص اور مصفا صورت میں نمایاں ہوسکتا ہے۔ لیکن اس بدبختی کا کیا علاج کہ اس قاعدے کو عملی صورت میں جاری کرنا انتہائی دشوار ہے کیونکہ فقہاء اور سیاست مدار قسم کے افراد نصوص کی گھات میں چھپے بیٹھے ہیں اور وہ نصوص کو ان کی قید و بند سے آزاد کرنے کی ہر کوشش کو ناکام بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔

حق و باطل

اسلام میں مذہب کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسلام میں شیعہ، سنی، شافعی، مالکی، حنفی اور حنبلی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ تمام نام مختلف تاریخی ادوار کے مرہون منت ہیں اور یہ سیاست کے تراشے ہوئے ہیں۔

حق بات یہ ہے کہ دو طرح کے اسلام پائے جاتے ہیں: (۱) سچا اسلام (۲) جھوٹا اسلام یعنی الہامی اسلام اور حکومتی اسلام۔ تاریخ میں جسے پذیرائی ملی وہ حکومتی اسلام تھا اور جو مجہور و

متروک رہ گیا وہ الہامی اسلام تھا۔

یہاں اسماء اور مسمیات کا کوئی وجود نہیں۔ اہم چیز حق ہے اور حق کے مقابلے میں اسماء اور مسمیات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اہمیت صرف جوہر کو حاصل ہوتی ہے۔ حق کی جستجو افراد کے اقوال کی بجائے نص کا تقاضا کرتی ہے۔ نص کی پیروی انسان کو حق کے قریب کر دیتی ہے۔ افراد کی پیروی کرنے والے لوگ اپنے قائدین کے ہاتھوں گروی ہو جاتے ہیں۔ نص معیار ہے اور تکلیف شرعی کا دارو مدار اور مسلمان کی مسئولیت کی بنیاد بھی نص پر ہے۔ مسلمان کا حساب کتاب بھی نص کے ساتھ ہے اور نص کی پیروی میں ہی دوزخ سے نجات کا راز مضمر ہے۔

نص سے قرآن مجید کا متن اور پیغمبر اکرمؐ کی وہ احادیث مراد ہیں جو قرآن اور عقل کے مطابق ہوں۔ وہ امور جن کا تعلق غیب سے یا سیاست سے یا اصول دین اور تولا و تبرا سے ہے، ان میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جن نصوص کا تعلق احکام سے ہے تو ان میں اجتہاد کی گنجائش موجود ہے اور اجتہاد کے لئے ایسے افراد کا ہونا ضروری ہے جن میں اجتہاد کی شرائط موجود ہوں اور استنباط کے لئے جن کے پاس قدرت علمی موجود ہو۔

جن نصوص کا تعلق دعوت و ارشاد، تبلیغ دین، اصول دین، تولا و تبرا، تدوین احکام کے سرچشمے کی تعیین، رہبری، ذاتی اور اخلاقی کردار اور دوزخ سے رہائی سے ہے، ایسی نصوص میں تقلید جائز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کا فریضہ یہ ہے کہ عقل سے استفادہ کر کے منزل حق پر پہنچیں۔

اس امت کی گمراہی کا راز اسی میں ہے کہ انہوں نے عقل کو معطل کر کے اپنی باگ ڈور فقہاء کے ہاتھوں میں تھمادی اور حکومت کے منظور نظر فقہاء سے انہوں نے دین حاصل کیا اور ان کی تقلید کرتے وقت یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ کون سے امور قابل تقلید ہیں اور کون سے امور تقلید کے قابل نہیں ہیں۔

اگر امت اسلامیہ درباری ملاؤں سے علیحدہ رہ کر جہاد، سیاست، دعوت اسلامی اور رہبری کے مسائل نصوص سے حاصل کرتی تو ان کے مشام جان حقیقی اسلام کی خوشبو سے معطر ہوسکتے تھے اور وہ اس کو معیار بنا کر فقہاء کے سامنے پیش کر کے نص کو قابل [illegible] سکتے تھے لیکن [illegible]

کہیے کہ مسلمانوں نے ان نصوص کے سمجھنے کے لئے فقہاء کو وسیلہ قرار دیا جس کی وجہ سے وہ ایک ایسے دائرے میں محدود ہو کر رہ گئے جس کی نقشہ کشی حکام نے فقہاء کی ملی بھگت سے کی تھی۔

اسی لئے اس دائرے سے آزادی ہی حق کی طرف اٹھنے والا پہلا قدم ہے اور نصوص کا سہارا لئے بغیر یہ آزادی میسر نہیں آ سکتی، اس کے لئے ہمیں ایسی نصوص کو تلاش کرنا ہوگا جن میں ہمارے لئے بہتر اور لائق رہبر کا تعین کیا گیا ہو تاکہ ہم اس کی پیروی کریں اور اپنے دین کو اس سے حاصل کریں اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں غلط رہبری سے نجات حاصل کرنی ہوگی جو ہم سے عقل چھین کر نصوص کی فراموشی کا مطالبہ کرتی ہو۔

جب نصوص کسی شخص کو بطور رہبر مشخص کر دیں تو پھر سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہمارا فرض صرف یہ رہ جائے گا کہ ہم منبع حق اور ترجمان حق رہبر کے وفادار بن کر زندہ رہیں۔

میں ایک طویل جستجو اور تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد امت میں غلط رہبری پیدا ہوئی اور اسی غلط رہبری کی کوکھ سے ان تمام منصوبوں نے جنم لیا جنہوں نے حقیقی اسلام کا دمکتا چہرہ مسخ کر دیا اور نصوص کو امت سے مخفی کر دیا جس کے نتیجے میں حق کی جگہ باطل نے لے لی اور صراط مستقیم کی جگہ گمراہی کے مختلف انحرافی راستوں نے لے لی۔

جب ہم سچے رہبر کو تلاش کریں گے تو باطل رہبر خود بخود مشخص ہو جائے گا اور شخصیات کی بجائے نصوص کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا۔

جب ہم رسول اکرمؐ کی ختم نبوت پر ایمان رکھیں گے تو رہبر کی ضرورت ہمارے لئے زیادہ کھل کر سامنے آئے گی کیونکہ جب ہمارا یہ ایمان ہے کہ ہمارے رسول خاتم النبیینؐ ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو لامحالہ ایک ایسے رہبر کی ضرورت ہوگی جو آپؐ کے بعد دین کی حفاظت کرے۔ امت کے درمیان رسول اکرمؐ کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرے۔

اس حقیقت میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہے کہ امت کے رہبر میں ایسی خصوصیات ہونی چاہئیں جن کی وجہ سے وہ اپنی ذمہ داریوں کو احسن انداز سے ادا کر سکتا ہو اور وہ

دوسرے افراد امت سے افضل ہو تاکہ اس کی رہبری میں لوگ اختلاف نہ کر سکیں۔ اس کی موجودگی سے امت باطل کی طرف لے جانے والے غلط رہبروں سے محفوظ رہ سکے۔ اس امر نے مجھے سخت پریشان کر دیا تھا اور میں جن نظریات و افکار کا قیدی تھا ان کی موجودگی میں مجھے اس سوال کا کہیں جواب سجھائی نہیں دیتا تھا۔

میرا پہلا سوال یہ تھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد "حق" کی کیفیت و ماہیت کیا ہے اور کیا اسے قرآن مجید میں منحصر کیا جا سکتا ہے۔ اگر رسول خداؐ کے بعد "حق" کو قرآن مجید میں منحصر قرار دیں تو قرآن مجید کی صحیح تفسیر کہاں سے حاصل کی جائے؟

جب میں نے تاریخ قرآن کا مطالعہ کیا تو مجھے اپنے سوال کا جواب کہیں دکھائی نہ دیا اور جب میں نے قرآن مجید جمع کرنے کی تاریخ پڑھی اور جمع قرآن کے وقت اصحاب پیغمبر کے اختلافات کو ملاحظہ کیا تو میرے شکوک و شبہات میں مزید اضافہ ہو گیا۔

میری حیرت اس وقت مزید بڑھ گئی جب میں نے کتب تفسیر میں پڑھا کہ "فلاں حکم کے متعلق اللہ نے جو آیت نازل کی تھی اسے اٹھا لیا لیکن اس کے حکم کو باقی رکھا" اور بعض آیات کے متعلق لکھا تھا کہ "ان آیات پر عمل منسوخ ہو چکا ہے۔" یہ بات مجھے انتہائی عجیب لگی کہ آیت منسوخ ہو چکی ہے لیکن اس کا حکم باقی ہے اور دوسری طرف سے آیت موجود ہے لیکن اس کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔

قرآن مجید کے متعلق ان اختلافات کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان تمام مشکلات کے دور کرنے کے لئے ایک جامع شخصیت کی ضرورت ہے اور وہ شخصیت خدا کے پسندیدہ رہبر کی ہی ہو سکتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ رہبر کون ہے اور اس نے اپنی رہبری کا اظہار کر کے حفاظت دین کا منصب کیوں نہ سنبھالا؟

سابقہ امتوں میں یہ قانون الٰہی جاری رہا کہ جب وہ امت ارتداد کا شکار ہوتی تھی تو اللہ تعالیٰ نئے نبی کو بھیج کر ان امتوں کی اصلاح کرتا تھا اور رسول اکرمؐ کے بعد چشم تاریخ نے اہل عرب کے ارتداد و انحراف کا مشاہدہ کیا۔ اب اگر رسالت کا سلسلہ جاری ہوتا تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی اصلاح کے لئے نیا رسول بھیجتا لیکن صورتحال مختلف تھی۔ رسالت کا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے

ہمیشہ کے لئے بند کردیا اور ادھر امت انحراف کا شکار ہوگئی تو اس صورت میں کیا ایسے رہبر کی ضرورت نہیں ہے جو امت کو انحراف اور کج فکری سے محفوظ رکھ سکے؟

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس راتوں کے لئے اپنی قوم سے جدا ہوئے تو وہ اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کر کے گئے اور ادھر عجیب صورتحال بنی کہ رسول خدا ہمیشہ کے لئے دنیا سے رخصت ہونے کا اعلان کرتے ہیں مگر کسی کو اپنا جانشین نہیں بناتے جبکہ آپ کے بعد کسی نبی نے بھی نہیں آنا تھا۔

ممکن ہے کہ ہمارے اس سوال کے جواب میں یہ کہا جائے کہ رسول اکرمؐ نے لوگوں میں قرآن کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ اسی لئے پیغمبر اکرمؐ کے بعد لوگوں کی مشکلات حل کرنے اور ان کے تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لئے قرآن کافی ہے اور قرآن ہی جامع الشرائط اور مثالی رہبر ہے۔

اسی طرز فکر کے حامیوں سے ہم یہ پوچھنا چاہیں گے کہ وہ ہمیں بتائیں کہ اگر کتاب ہی کافی ہوتی تو انبیائے سابقین اپنی رحلت کے وقت کتاب تو اپنی امت میں چھوڑ کر گئے تھے مگر اس کے باوجود ان کی امتیں گمراہ کیوں ہوئی تھیں؟

اور بنی اسرائیل کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انہوں نے کتاب الٰہی کے کلمات میں تحریف کردی تھی اسی لئے ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ پیغمبر کے بعد صرف کتاب لوگوں کو گمراہی سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ کتاب کے ساتھ ساتھ ایک ایسی قوت کی بھی ضرورت ہے جو اس کتاب کا اجراء کرسکے اور امت کو اختلاف و انحراف سے بچاسکے۔ وہ قوت امت کا وہ چنا ہوا طبقہ ہے جو قرآن کے حقیقی وارث ہیں اور وارثان قرآن ہی قرآن کے سچے مفسر ہیں۔ امم سابقہ میں بھی سنت الٰہیہ یہی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا.... ''پھر ہم نے کتاب کا وارث اپنے بندوں میں سے انہیں قرار دیا جنہیں ہم نے چن لیا۔'' (سورۂ فاطر: آیت ۳۲)

اگر تنہا کتاب کافی ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے چنیدہ بندوں کو اس کا وارث نہ بناتا اور قرآن کو ان کی میراث قرار نہ دیتا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ کے بعد لوگ مرتد ہوئے تھے تو اس وقت بھی قرآن مجید موجود تھا مگر لوگوں کی اصلاح تلوار سے ہوئی تھی۔

قرآن مجید بھی دوسری آسمانی کتابوں کی طرح سے ایک کتاب ہے۔ امت کے افراد اس سے روگردانی بھی کرسکتے ہیں۔ رسول اکرمؐ کی وفات کے وقت قرآن مجید موجود تھا مگر اس کے باوجود مسلمانوں نے مسئلہ خلافت میں اختلاف کیا اور قرآن نے اس کا کوئی فیصلہ نہ کیا۔ لوگ مرتد ہوئے اور قتل ہوئے اس وقت بھی قرآن موجود تھا مگر قرآن نے اس کا بھی کوئی فیصلہ نہ کیا اسی طرح سے دوسرے معاملات کا فیصلہ بھی قرآن نے نہیں کیا۔ (السیف والسیاسة)

علاوہ ازیں خود جمع قرآن کے وقت لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا مگر قرآن مجید نے اس کا بھی کوئی فیصلہ نہ کیا۔ اب اصل سوال یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ جس قرآن کو امت کے درمیان چھوڑ کر گئے تھے اس نے لوگوں کو ارتداد اور تنازعات سے نہ روکا اور ان کے جھگڑوں کا فیصلہ نہ کیا تو کیا یہ ارتداد و تنازعات قرآن سے انحراف کی وجہ سے پیدا ہوئے یا رہبر سے انحراف کی وجہ سے پیدا ہوئے؟

تاریخ نے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ مذکورہ ارتداد کی وجہ رہبر سے انحراف تھا نہ کہ قرآن سے کیونکہ جن لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تھا — وہ سب کے سب مسلمان تھے۔ جن لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کا انکار کیا تھا — وہ بھی مسلمان تھے۔ وہ لوگ راسخ العقیدہ اور قرآن مجید پر مکمل ایمان رکھنے والے تھے مگر قرآن کے وفادار ہونے کے باوجود منحرف ہوگئے تھے۔ لہٰذا اگر قرآن سے وفاداری کسی کو انحراف سے روکنے کے قابل ہوتی تو وہ لوگ منحرف نہ ہوتے۔

ان ہی حقائق کی وجہ سے میں نے صحیح رہبر کی تلاش کا آغاز کیا اور میں نے رہبر کی تعیین کے لئے نصوص اور متون احادیث پر انحصار کیا کیونکہ نصوص حق تک پہنچنے اور غلط کار افراد کے اجتہاد سے محفوظ رہنے کا واحد ذریعہ ہیں۔ حق کو نصوص کی روشنی میں پرکھا جاسکتا ہے کیونکہ حق اپنی پہچان کے لئے ''شخصیات'' کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ ''شخصیات'' اپنی پہچان کے لئے حق کی محتاج ہوتی ہیں اور جب سے میں نے ''شخصیات'' کو حق کے ذریعے سے پہچاننے کی کوشش کی تب سے میرے لئے راستے کھلنے شروع ہوگئے۔

سنی میراث اور شیعہ میراث

ایسے بہت سے مسائل ہیں جن میں شیعہ اور سنی دونوں متفق ہیں اور دونوں میں ان کے متعلق معمولی سا اختلاف بھی نہیں پایا جاتا۔ جب میں نے میراث کے متعلق تحقیق کی تو سنی اور شیعہ میراث میں مجھے بہت سی روایات اور بہت سے اجتہادات اور افراد کے اقوال دکھائی دیئے جن کی وجہ سے میرے شکوک و شبہات میں اضافہ ہوا۔

سنی میراث میں بہت سی خود ساختہ روایات موجود ہیں اور اسی طرح سے شیعہ میراث میں بھی بہت سی خود ساختہ روایات موجود ہیں۔ سنی میراث میں بہت سے قابل اختلاف اصول و قواعد موجود ہیں جبکہ شیعہ میراث میں بھی بہت سے قابل اختلاف اصول و قواعد موجود ہیں۔

ان حالات کی موجودگی میں وہ کون سا امر ہے جو ایک گروہ کو دوسرے سے ممتاز بناتا ہے۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے ہمیں دونوں مذاہب کی میراث میں اختلاف کی تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔

سنی اپنی میراث کے لئے صحابہ پر انحصار کرتے ہیں اور شیعہ اپنی میراث کے لئے اہلبیت رسولؐ پر انحصار کرتے ہیں۔ سنی میراث نے ہمیشہ حکمرانوں کا ساتھ دیا جبکہ شیعہ میراث حکمرانوں سے دور رہی۔ سنی میراث میں شخصیات کے اقوال کو برتری حاصل ہے جبکہ شیعہ میراث میں نصوص کو برتری حاصل ہے۔ سنی میراث معروضی حالات کی وجہ سے پیدا ہوئی اور شیعہ میراث معروضی حالات کی مخالفت سے وجود میں آئی۔ سنی میراث میں عقل کی کوئی اہمیت نہیں ہے جبکہ شیعہ میراث میں عقل کو قابل احترام تسلیم کیا جاتا ہے۔

میراث کے اس موازنے سے دونوں مذاہب کی میراث کا فرق واضح ہو جاتا ہے مگر اس کے باوجود شیعہ میراث میں بھی سنی میراث کی طرح اقوال و آراء اور خود ساختہ روایات کی بھرمار ہے۔ اس لحاظ سے دونوں مذاہب کا وزن برابر ہو جاتا ہے۔

سنی میراث میں بہت سی روایات موجود ہیں جو صحابہ کو ان کے اصلی مقام سے ہٹا کر انتہائی بلندی پر لے جاتی ہیں اور ادھر شیعہ میراث میں بھی ایسی روایات کی کمی نہیں ہے جو

اہلبیت کو ان کے اصلی مقام سے ہٹا کر اوج ثریا پر لے جاتی ہیں۔

دونوں مذاہب کی میراث میں خود ساختہ روایات کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن اس تمام تر مماثلت کے باوجود شیعہ مذہب کو سنی مذہب پر پھر بھی برتری حاصل ہے کیونکہ شیعوں کے پاس خود ساختہ روایات کو کنٹرول کرنے کے لئے ایک قاعدہ اور ضابطہ موجود ہے۔ شیعہ اس بات کے قائل ہیں کہ جو روایت قرآن اور عقل کے خلاف ہو اسے دیوار پر مار دینا چاہئے جبکہ اہلسنت روایت کے لئے صرف اسناد پر ہی انحصار کرتے ہیں۔

روایات کے سلسلے میں شیعہ اور سنی دونوں کے طریقۂ کار میں ایک واضح فرق پایا جاتا ہے۔ شیعہ روایت کے متن کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں جبکہ سنی متن کی بجائے اسناد روایت کو باریک بینی سے دیکھتے ہیں اور شیعوں کی اس روش کی وجہ سے میراث میں حاصل ہونے والی بہت سی روایات کو مخالف قرآن و عقل قرار دے کر رد کر دیا گیا اور اس کے برعکس سنیوں کی روش کی وجہ سے ایسی روایات قبول کی گئیں جو کہ سراسر قرآن اور عقل سلیم کے مخالف تھیں کیونکہ سنیوں کے ہاں معیار روایت صرف یہی ہے کہ اس روایت کے راوی سچے ہوں اور اگر وہ روایت قرآن کے خلاف ہی کیوں نہ ہو صحیح ہے۔

شیعوں کی روش میراث کو کنٹرول کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے اور سنیوں کی روش قرآن سے دوری کا سبب بنتی ہے اور مسئلہ امامت کے متعلق شیعوں کا عقیدہ شیعہ میراث کو سنی میراث سے ممتاز قرار دیتا ہے اور عقیدۂ امامت نے ایسے بہت سے اجتہادات اور بہت سے ایسے نقطہ ہائے نظر کو جنم دیا جنہوں نے شیعوں کے عقیدے پر گہرا اثر ڈالا اور عقیدۂ امامت سے شیعوں کو سب سے بڑا فائدہ یہ ملا کہ انہوں نے احکام شریعت کے لئے آل محمدؐ کو اپنے لئے مخصوص کر لیا اور اس کے ساتھ انہوں نے مخالفین آل محمدؐ کے نظریات کو ٹھکرا دیا اور انہوں نے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ اور ان کے ہمنوا صحابہ کے پیش کردہ نظریات کو مسترد کر دیا۔ سنی اور شیعہ میراث کا سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ شیعہ قرآن و عقل کی روشنی میں افراد و شخصیات کے اقوال کو مسترد کرتے ہیں جبکہ سنی میراث میں رجال حدیث کو متن حدیث پر فوقیت دی جاتی ہے اور اس قاعدے کی وجہ سے سنی مذہب قرآن اور عقل سلیم کے تقاضوں سے دور ہوتا چلا گیا اور یہ

سب کچھ سیاست مداروں کے خطرناک منصوبوں سے عمل میں لایا گیا اور سیاست مداروں کا مقصد یہ تھا کہ جھوٹی روایات سے اسلام کے حسین چہرے کو داغدار بنادیا جائے اور اسلام سے اس کی حقیقی روح کو سلب کرلیا جائے اور لوگوں کو ایسے اسلام کا پرستار بنادیا جائے جس میں ان کے اقتدار کے خلاف آواز تک اٹھانا حرام ہو اور ان کے فسق و فجور کے باوجود لوگ ان کی اطاعت کو اسلامی حکم سمجھ کر قبول کریں۔ قرآن وعقل کو میراث اجتہاد پر فوقیت دینے کی ضرورت تھی مگر سنی مسلک میں میراث اجتہاد کو قرآن وعقل پر فوقیت دی گئی۔

اس لحاظ سے شیعوں کی روش قابل تعریف ہے۔ ان کی نظر میں متن نصوص کو اولیت حاصل ہے اور رجال روایت کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔

میں شیعوں کی اس روش سے بہت متاثر ہوا اور اس روش سے مجھے اطمینان نصیب ہوا کیونکہ مذہب تشیع قبول کرنے کے بعد مجھے ایک میراث کی جگہ دوسری میراث ماننے کی زحمت نہ اٹھانی پڑی اور سنی مذہب کی ''شخصیات'' کے عوض مجھے یہاں دوسری شخصیات کے ہاں گروی نہ ہونا پڑا۔ مذہب اہلبیت نے مجھے افراد کے خط کی بجائے خط نص سے وفاداری کا درس دیا۔

شکوک کی منجدھار میں

فقہ، تفسیر، تاریخ، رسول اکرمؐ سے منسوب احادیث کے علاوہ ورثے میں ملنے والے بہت سے افکار ونظریات مجھے مطمئن نہ کرسکے اور میں شکوک وشبہات کی منجدھار میں گھر گیا۔ اس تمام تر صورتحال میں حقیقت کا سراغ لگانا آسان نہیں تھا کیونکہ مسائل کو اتنا خلط ملط کردیا گیا ہے کہ ''شخصیات کے فرمودات'' نصوص سے زیادہ اہمیت اختیار کرچکے ہیں اور ''نصوص'' کو ان ''فرمودات'' سے جدا کرنا انتہائی دشوار کام ہے۔ لیکن اگر تحقیق کرنے والا پُرعزم ہو اور تحقیق کے دوران فرسِ تحقیق کی لگام کو کھینچ کر رکھے تو اس دشواری پر قابو پایا جاسکتا ہے اور وہ آپ زمین پر گرا نہیں سکتا۔ اس روش کی بدولت جس میراث اور موجودہ اسلامی نظریات کا میں نے مشاہدہ کیا ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ مذہب اہلسنت میں شیخین کے اقوال نے قطعی اورابدی نصوص کی صورت اختیار کرلی ہے۔
۲۔ میراث کے اکثر بلکہ تمام مسائل کا دارو مدار اجماع پر ہے اور اجماع کو رکن اساسی کی حیثیت حاصل ہے۔
۳۔ اسوۂ کامل کے حامل رسول رحمتؐ کی طرف منسوب اکثر احادیث سے سیاست کی بو آتی ہے اور بہت سی احادیث عقل اور اسلام کے مستقل اصولوں سے متصادم ہیں۔
۴۔ روایات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر رسول اکرمؐ کی عظیم الشان شخصیت کو گھٹانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔
۵۔ حکومت مخالف افراد کے ''فرمودات'' اور ''اجتہادات'' سے مکمل دشمنی دکھائی دیتی ہے۔
۶۔ بعض کم مرتبہ افراد کو عالی مرتبت ہستیوں کے برابر لانے کی کوششیں کی گئیں۔
۷۔ راویان اور مؤلفان احادیث بھی سیاست کے اثر سے آزاد دکھائی نہیں دیتے۔

۸۔ بے توفیق فقیہانِ حرم کی طرف سے حکمران طبقے کو ہمیشہ اہمیت دی گئی اور انہوں نے حکومتوں کے جواز کے فتوے جاری کیے۔

۹۔ اسلام کی پوری تاریخ میں آزادیٔ فکر کبھی بھی دکھائی نہیں دی۔

اس حاصل مطالعہ کی وجہ سے میں موجودہ اسلام کے متعلق شکوک و شبہات میں مبتلا ہوگیا اور میں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ مجھے از سرِ نو اسلام کا مطالعہ کرنا چاہئے کیونکہ موجودہ اسلام پر سیاست کی چھاپ بہت گہری ہے اور فقہاء نے اپنی مصلحتوں کے پیشِ نظر اسے قبول کیا اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا تھا۔

ذیل میں بطور نمونہ میں کچھ نصوص پیش کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے میرے دل میں شکوک و شبہات کے دروازے کھولے اور مسلمانوں کی اس مسلّمہ میراث کو میں نے نگاہ انکار سے دیکھا اور ان کے نظریات کو رد کردیا۔

بنی امیہ

اہلسنت کی کتب حدیث میں سے بنی امیہ کے متعلق مروی روایات نے میری توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا۔ ان روایات میں امت کو ان کے خطرناک عزائم سے اور دین اسلام کو نیست و نابود کرنے کی کوششوں سے آگاہ کیا گیا تھا۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ علمائے حدیث نے ان روایات کو مشکوک اور ضعیف قرار دیا اور اس کی بجائے ان احادیث کو صحیح قرار دیا گیا جن میں بنی امیہ کی اسلام دوستی کو سراہا گیا تھا۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی امیہ کے اقتدار کی مذمت کی تھی اور آپ نے یہ الفاظ فرمائے تھے: ''میری امت کی تباہی قریش کے شہوت پرست افراد کے ہاتھوں سے ہوگی۔'' (صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب سوم، ج۹، ص۶۰)

اور دوسری روایت میں آپ سے یہ الفاظ مروی ہیں: ''امت میں فساد اور تباہی قریش کے نادان اور شہوت پرست گروہ کے ہاتھوں سے ہوگی۔'' (صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب سوم، ج۹، ص۶۰۔ مسند احمد بن حنبل، ج۲، ص۳۰۴)

ابوہریرہ نے کہا: ''اگر میں چاہوں تو ان لوگوں کے نام لے کر بتا سکتا ہوں کہ امت کو تباہ کرنے والے فلاں فلاں کی اولاد میں سے ہوں گے۔'' (صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب سوم، ج۹، ص۶۰، باب۳)

علاوہ ازیں بہت سی روایات میں حکم بن العاص اور اس کی اولاد پر لعنت و نفرین کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔[۱]

ابوہریرہ نے کہا: میں نے حدیث پیغمبرؐ کے دو برتن یاد کیے۔ ان میں سے ایک برتن کا میں نے اظہار کردیا ہے اور اگر میں نے دوسرے برتن میں سے کچھ بیان کیا تو میرا گلا کاٹ دیا جائے گا۔ (صحیح بخاری، کتاب العلم، ج۱، ص۴۱)

حضرت عثمانؓ کے چچا حکم بن العاص کے متعلق ابن حجر نے لکھا ہے کہ رسول خداؐ نے اسے طائف جلاوطن کیا تھا لیکن حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں اس راندۂ رسول کو واپس مدینہ بلا لیا۔ اس کے متعلق یہ بات منقول ہے کہ رسول اکرمؐ نے اس پر لعنت کی تھی لیکن یہ بات (ابن حجر کے نزدیک) ثابت نہیں۔ روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ کچھ صحابہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں آئے اور آنحضرتؐ حکم بن العاص پر لعنت و نفرین کر رہے تھے۔ صحابہ نے کہا: یارسول اللہؐ! آپ اس پر لعنت کیوں کر رہے ہیں؟

آپ نے فرمایا: میں اپنی فلاں بیوی کے ساتھ بیٹھا تھا اور یہ دیوار کے سوراخ میں سے ہماری طرف جھانک رہا تھا۔

صحابہ نے کہا: کیا ہم بھی اس پر لعنت کریں؟

آپ نے فرمایا: نہیں! اور یہ منظر گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اس کی اولاد میرے منبر پر اترتی اور چڑھتی ہے۔

صحابہ نے کہا: یارسول اللہؐ! کیا ہم انہیں پکڑ لیں؟

آپ نے فرمایا: نہیں! لیکن رسول اکرمؐ نے اسے جلاوطن کردیا۔ (**الاصابہ فی تمییز الصحابۃ**، ج۱، ص۳۴۵، شمارہ شخصیت ۱۷۸۱)

۱۔ یہ لعنت ام المومنین حضرت عائشہؓ کی زبانی مروی ہے جس کی ہم عنقریب وضاحت کریں گے۔

طبرانی روایت کرتے ہیں: ایک مرتبہ حکم، رسول اکرمؐ کی خدمت میں بیٹھا تھا۔ اس نے بات کرنی چاہی تو اپنے ہاتھ سے زبان کو پکڑا۔ رسول اکرمؐ نے اس کی طرف منہ کر کے فرمایا کہ ہمیشہ ایسے ہی رہنا۔ چنانچہ وہ جب بھی بات کرتا تو پہلے اپنی زبان کو ہاتھ سے پکڑتا تھا پھر بات کرتا تھا اور مرتے دم تک اس کی یہی حالت رہی۔

ابن حجر کو اس حدیث کی سند میں کچھ شک ہے۔ بیہقی نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن اس کے راویوں میں سے ایک ضرار بن صرد ہے اور اس پر رافضی ہونے کا الزام تھا۔ (الاصابه فی تمییز الصحابة، ج۱، ص۳۴۵، شمارہ شخصیت ۱۷۸۱)

ابن حجر نے نافع بن جبیر بن مطعم سے اور اس نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ ہم رسول اکرمؐ کے پاس بیٹھے تھے کہ آپ نے حکم بن العاص کو دیکھا اور فرمایا: اس شخص کی اولاد کی وجہ سے میری امت ہلاک ہوگی۔ (الاصابه، ج۱، ص۳۴۶)

روایت میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے مروان سے کہا: اے مروان! میں گواہی دیتی ہوں کہ رسول اکرمؐ نے تیرے باپ پر اس وقت لعنت کی تھی جب تو اس کی صلب میں تھا۔ (الاصابه، ج۱، ص۳۴۶)

مسلم نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے: مسلمان، ابوسفیان سے ہرگز نشست و برخاست نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی اس کی طرف نظر کرتے تھے۔ (صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب من فضائل ابی سفیان، ج۴، ص۱۹۴۵، حدیث ۲۵۰۱)

ابن حجر نے بغوی سے نقل کیا ہے: حضرت عمرؓ جب بھی معاویہ کو دیکھتے تو کہا کرتے کہ یہ عرب کا نوشیروان ہے۔ (الاصابه در حالات معاویہ، ج۳، ص۴۳۴)

ابن ابی الدنیا سے منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا: خبردار! میرے بعد اختلاف نہ کرنا اور اگر تم نے ایسا کیا تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ معاویہ شام میں موجود ہے۔ اگر تم نے اپنی رائے پر انحصار کیا تو معاویہ کو بخوبی معلوم ہے کہ تم سے خلافت کیسے چھینی جاسکتی ہے۔ (الاصابه در حالات معاویہ، ج۳، ص۴۳۴)

ابتدا میں معاویہ اور ابوسفیان کے ساتھ مؤلفة القلوب کا رویہ اپنایا جاتا تھا، پھر جب

حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے مؤلفة القلوب کا حصہ ختم کر کے معاویہ کو شام کا والی مقرر کیا۔ (تاریخ عمر بن الخطابؓ مؤلفہ ابن جوزی و دیگر کتب تاریخ)

جن احادیث میں بنی امیہ کی تعریف کی گئی ہے ان میں ایسی احادیث بھی موجود ہیں جن میں شام اور اہل شام کی تعریف کی گئی ہے کیونکہ شام بنی امیہ کی چھاؤنی اور ان کی حکومت کا مرکز تھا۔[۱]

حضرت عثمانؓ نے کہا تھا: اگر جنت کی چابیاں میرے ہاتھ میں ہوتیں تو میں تمام چابیاں بنی امیہ کے سپرد کردیتا تاکہ وہ سب کے سب جنت میں چلے جائیں۔ (البدایہ والنہایہ، ابن کثیر۔ مسند احمد، ج۱، ص۶۲)

کتب سنن میں مؤلفین نے معاویہ اور اس کے باپ کے فضائل کو تلاش کرنے کی بڑی کوششیں کیں اور محدثین کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طریقے سے رسول اکرمؐ کی زبانی ان کی تعریف بیان کی جائے تاکہ ان کے مقام کو بلند ظاہر کیا جاسکے۔

حجاج ابن مسلم نے صحیح مسلم میں ابوسفیان سے نقل کیا ہے کہ اس نے پیغمبر اکرمؐ سے کہا: یارسول اللہ! میری خواہش ہے کہ آپ مجھے تین چیزیں عطا فرمائیں۔

رسول خداؐ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں ہے۔

میں (ابوسفیان) نے کہا: میری خواہش ہے کہ آپ میری بیٹی ام حبیبہ سے جس کا حسن و جمال پورے عرب میں بے نظیر ہے، نکاح کریں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: جی ہاں۔

میں (ابوسفیان) نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ آپ معاویہ کو اپنا کاتب بنائیں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: جی ہاں۔

میں (ابوسفیان) نے کہا: آپ مجھے کفار سے جنگ کرنے کے لئے لشکر کا سالار مقرر

۱۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ کی جلد اول صفحہ ۳۰۵ پر ایسی احادیث کو نقل کیا جو کہ ضعیف ہیں اور جو جھوٹی ہونے کے قریب ہیں۔ احمد بن حنبل نے مسند کی جلد سوم صفحہ ۴۳۶ اور جلد پنجم صفحہ ۳۴ و ۳۵ پر اہل شام کی فضیلت میں یہ حدیث لکھی ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا: "جب اہل شام بگڑ گئے تو تمہاری کوئی قدر و قیمت نہیں رہے گی۔"

فرمائیں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح سے میں نے مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی کی تھی، اسی طرح سے اب کافروں کے خلاف لشکر کشی کروں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضل ابی سفیان، ج ۴، ص ۱۹۴۵، حدیث 2051)

ایسی (بے تکی) روایات کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ کیا گدائی سے فضیلت حاصل ہو سکتی ہے یا فضیلت وہ ہے جو رسول خداؐ خود اپنی طرف سے عنایت فرمائیں؟

۲۔ اس حدیث سے ابوسفیان کی کون سی فضیلت ثابت ہوتی ہے؟

۳۔ کیا اسلامی طریقہ یہی ہے کہ ایک باپ اپنی بیٹی کے حسن و جمال کو بیان کر کے کسی سے اس کے نکاح کی خواستگاری کرے؟

۴۔ کیا رسول خداؐ ایسے ہی حسن پرست تھے کہ ابوسفیان کی بیٹی کے حسن و جمال کی باتیں سن کر اس پر فریفتہ ہو گئے تھے؟

۵۔ روایت کا عجیب پہلو یہ ہے کہ آنحضرتؐ، ابوسفیان کی ہر درخواست کو سوچے سمجھے بغیر قبول کرتے چلے گئے؟

ویسے بھی یہ بات ناممکن ہے کہ ابوسفیان، رسول خداؐ سے اسلامی لشکر کی سالاری کی درخواست کرے کیونکہ ابوسفیان جانتا تھا کہ مسلمان اسے اور اس کے بیٹے کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہ روایت اس لئے بھی ناقابل قبول ہے کہ اس میں ایک خطرناک تاریخی غلطی موجود ہے کیونکہ اہلسنت مؤرخین کے مطابق رسول اکرمؐ نے ہجرت سے قبل ام حبیبہ سے نکاح کیا تھا اس لئے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ حدیث جھوٹی ہے اور سیاسی ہاتھوں کی کرشمہ سازی ہے۔[۱]

مسلم بن حجاج نے اپنی صحیح میں لکھا ہے: ایک دن ابوسفیان گروہ صحابہ کو دیکھنے کے لئے گیا۔ اس وقت بزم صحابہ میں سلمان فارسیؓ، صہیب رومیؓ اور بلال حبشیؓ موجود تھے۔ انہوں نے ابوسفیان کو دیکھ کر ازراہ تعجب کہا کہ تلواروں نے ابھی تک اس دشمن خدا کا خاتمہ نہیں کیا۔

۱۔ کتب سیرت میں ہے کہ جب ابوسفیان معاہدہ کی تجدید کے لئے مدینے آیا تو اس کی بیٹی ام حبیبہ نے اپنے گھر کے دروازے پر اس کا استقبال کرنے سے انکار کر دیا۔ (تاریخ طبری، ج ۳، ص ۴۶، ۱۶۵)

ابوبکرؓ وہاں موجود تھے، انہوں نے ان سے کہا کہ تم ایسے الفاظ قریش کے بزرگ اور سردار کے متعلق کہہ رہے ہو؟ پھر ابوبکرؓ رسول خداؐ کے پاس گئے اور ان کی خدمت میں سارا واقعہ بیان کیا۔ رسول خداؐ نے فرمایا: خبردار ابوبکرؓ! انہیں غصہ نہ دلانا اور انہیں ناراض نہ کرنا۔ اگر تم نے انہیں ناراض کیا تو تم نے اپنے پروردگار کو ناراض کیا۔ (صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب من فضائل صہیب و سلمان و بلال، ج ۴، ص ۱۹۴۷، حدیث ۲۵۰۴)

سابقہ روایات کی طرح اس روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ ابوسفیان کو لائق احترام نہیں سمجھتے تھے۔ البتہ قریش کے بے شخصیت افراد اور منافقین کی بات جدا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر حضرت ابوبکرؓ کو ابوسفیان کے دفاع کی کیا ضرورت تھی؟ کیا ابوبکرؓ اس کے ماضی اور اس کے کردار سے ناواقف تھے؟

رسول خداؐ کے جواب سے اصحاب رسول کے موقف کی تائید ہوتی ہے اور انہوں نے ابوسفیان کے متعلق جو تاثرات قائم کئے تھے، آنحضرتؐ نے ان کی تائید کر کے اس پر اپنی رضامندی کی مہر ثبت کر دی تھی اور ابوسفیان کے متعلق حضرت ابوبکرؓ کے موقف کو مسترد کر دیا تھا۔

محمد بن اسماعیل بخاری نے صحیح بخاری میں معاویہ کی تعریف و توصیف کے لئے ایک باب قائم کیا ہے لیکن اس میں اپنے ممدوح کے لئے کام کی کوئی بات لانے سے قاصر رہے۔ اس باب میں انہیں بس یہی نقل کرنے پر اکتفا کرنا پڑا کہ ابن عباسؓ نے اس کے صحابی اور فقیہ ہونے کی گواہی دی تھی۔[۱]

ابن حجر نے اس باب کی شرح میں لکھا ہے: ''بخاری نے اس باب میں معاویہ کی کوئی فضیلت بیان نہیں کی ہے۔ بخاری صرف یہی کہہ سکے ہیں کہ ابن عباسؓ نے معاویہ کے فقیہ ہونے کی گواہی دی تھی اور شاید یہ گواہی بڑی فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔''

۱۔ صحیح بخاری، ج ۵، ص ۳۵، باب ۲۹ میں ابن عباسؓ سے اس سلسلے کی دو روایات مرقوم ہیں۔ پہلی روایت میں مذکور ہے کہ معاویہ نے ایک رکعت نماز نافلہ پڑھی تو ابن عباسؓ کے خادم نے برا محسوس کیا۔ اسی وقت ابن عباسؓ نے اپنے خادم سے کہا کہ اسے کچھ نہ کہو وہ رسول خداؐ کا صحابی ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ ابن عباسؓ نے کہا کہ وہ فقیہ ہے [illegible]

اسحٰق بن راہویہ سے منقول ہے کہ اس نے کہا: معاویہ کی فضیلت میں جتنی بھی روایات بیان کی گئی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ معاویہ کے متعلق بہت سی روایات بیان ہوئی ہیں لیکن مذکورہ روایات اسناد کے اعتبار سے صحیح نہیں ہیں۔ اسحٰق بن راہویہ اور نسائی کے علاوہ دوسرے محدثین کا بھی یہی خیال ہے۔[۱]

عبداللہ بن احمد بن حنبل نے کہا کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا: آپ علیؑ اور معاویہ کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ یہ سن کر وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں یہ بات ازروئے تحقیق جانتا ہوں کہ علیؑ کے دشمن زیادہ تھے اور انہوں نے علیؑ میں عیب ڈھونڈنے کی بڑی کوششیں کیں مگر پوری جستجو کے باوجود علیؑ میں کوئی عیب تلاش نہ کر سکے۔ پھر مجبور ہو کر انہوں نے اس شخص (معاویہ) کی طرف منہ کیا جو علیؑ سے جنگ کرتا رہتا تھا۔ انہوں نے علیؑ کی دشمنی میں آ کر اس کے مخالف کی تعریف و توصیف کی اور اسے علیؑ کے برابر قرار دیا۔

ابن حجر نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ معاویہ کے لئے بہت سے جھوٹے فضائل تراشے گئے جن کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ (فتح الباری، ج ۷، ص ۸۳۔ مسند احمد بن حنبل)

حجاج بن مسلم لکھتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے کہا کہ میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ رسول خداؐ نے مجھے پکارا اور کہا کہ معاویہ کو بلا لاؤ۔ میں وہاں گیا تو اسے کھانا کھاتے ہوئے پایا۔ میں واپس آ گیا۔ پھر آپ نے دوبارہ مجھے بھیجا اور فرمایا کہ معاویہ سے جا کر کہو کہ وہ ہمارے پاس آئے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں دوبارہ گیا۔ اس بار بھی میں نے اسے کھانا کھاتے ہوئے پایا۔ میں واپس آیا اور رسول خداؐ سے بیان کیا تو رسول خداؐ نے فرمایا: لااشبع اللّٰہ بطنہ ''خدا اس کے پیٹ کو کبھی سیر نہ کرے۔'' (صحیح مسلم، ج ۴، ص ۲۰۰۷)

اس سیدھی سادی بددعا نے معاویہ کے بہی خواہوں کو بڑا پریشان کیا اور انہوں نے اس کی تاویلیں کیں اور اس سلسلے میں بعض علماء کی روش انتہائی تعجب انگیز ہے۔ انہوں نے اس بددعا

۱۔ فتح الباری، ج ۷، ص ۸۳ پر مذکور ہے کہ بخاری کے استاد اسحٰق بن راہویہ نے کہا کہ معاویہ کی فضیلت میں ایک بھی صحیح السند حدیث موجود نہیں ہے۔

کو معاویہ کے لئے دعا بنا دیا اور کہا کہ رسول خداؐ نے ان الفاظ سے درحقیقت معاویہ کے اشتہائے طعام کے لئے دعا فرمائی تھی اور آنحضرتؐ کا مقصد یہ تھا کہ اس کی اشتہا ہمیشہ قائم و دائم رہے۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ مسلم نے اس حدیث کو اپنی کتاب کی جس فصل میں لکھا ہے اس کا عنوان اس نے اسی طرح سے قائم کیا: ''ان اشخاص کا باب جن پر رسول خداؐ نے لعنت یا نفرین کی یا انہیں سب وشتم کیا اور وہ سب وشتم کے لائق نہ تھے۔''

لہٰذا باب کا عنوان ہی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آنحضرتؐ کی بددعا معاویہ کے لئے رحمت اور اجر کا سبب ثابت ہوئی۔ (صحیح مسلم، ج ۴، ص ۲۰۰۷)

یہی روایت امام نسائی کے قتل کا سبب بنی تھی۔ معاویہ کے ہوا خواہوں نے شام میں اس سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ فضائل معاویہ میں کوئی کتاب لکھے اور اس نے کتاب لکھنے سے انکار کیا تھا۔[۱] (اگر شکم سیر نہ ہونے کی حدیث فضیلت معاویہ کی دلیل ہوتی تو اہل شام امام نسائی کو قتل ہی کیوں کرتے؟)

اس قسم کی حرکات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی امیہ کے طرفدار فقہاء نے بنی امیہ کو آبرومند گھرانہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور ان کی حرکت کا اول و آخر مقصد یہی تھا کہ بنی امیہ کو قعر مزلت سے نکال کر اوج عزت پر لے جائیں اور ان کی ظالمانہ کارروائیوں پر جواز کی مہر ثبت کر دیں۔

اس طرح کی روایات اور ان کی تفسیر کو دیکھ کر میں تمام فضائل کی روایات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگا اور ایسی روایات ہی میرے شکوک وشبہات کا محرک ثابت ہوئیں۔ چنانچہ میں نے فضائل و مناقب کی روایات کو آنکھیں بند کر کے ماننے کی بجائے انہیں قرآن اور عقل کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں مجھ پر یہ حقائق منکشف ہوئے:

۱۔ فضائل صحابہ کی اکثر روایات ایسی ہیں جن سے ان کی کوئی فضیلت واضح ہی نہیں ہوتی۔
۲۔ فضائل کی اکثر روایات خود ان کی اپنی زبانی منقول ہیں۔

۱۔ امام نسائی ۳۰۳ھ میں معاویہ کے پرستاروں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ انہوں نے فضائل امیر المومنین پر ایک کتاب خصائص الامام علیؑ لکھی تھی اور انہوں نے فضائل معاویہ پر کوئی کتاب لکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

۳۔ جب ہم بافضیلت افراد کے حالات زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ اپنی عملی زندگی میں فضیلت کے حامل دکھائی نہیں دیتے۔ ممکن ہے کہ ان احادیث سے کوئی دوسرے افراد مراد ہوں۔

۴۔ فضائل کی اکثر روایات ایک مخصوص گروہ کے گرد گردش کرتی ہیں جبکہ بزم اصحاب میں ان سے بہتر افراد بھی موجود تھے اور جن کے کارنامے بھی ان سے زیادہ تھے۔ مگر اس کے باوجود ان کے فضائل کی روایات کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔

۵۔ زیادہ تر فضائل کی روایات معاویہ کے دوستوں اور بنی امیہ کے بہی خواہوں کے لئے تراشی گئیں جن کا مقصد خط بنی امیہ کو صحیح ثابت کرنا تھا۔

۶۔ حضرت علیؑ اور اہلبیت رسولؐ کے متعلق روایات موجود ہیں جن سے ان کی قدر و قیمت کا پتا چلتا ہے اور ان روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اہلبیتؑ ایسی خصوصیات کے حامل تھے جن سے دوسرے اصحاب محروم تھے۔

۷۔ جان بوجھ کر ایسی روایات تخلیق کی گئیں جن سے حضرت علیؑ کی مذمت ہوتی ہے یا ان کی شان میں کمی کا شائبہ ہوتا ہے۔

توجیہ و تاویل

علماء و محدثین کی بہت سی کتابوں کے مطالعے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ تمام تر احتیاط اور وقت کی حکومتوں کی سینسر پالیسی کے باوجود بہت سی روایات کتابوں میں رہ گئی ہیں جنہوں نے ہمارے ساتھیوں کو پریشان کیا اور ان کے خود ساختہ نظریات میں دراڑیں پیدا کیں۔ چونکہ ہمارے ساتھی ان نصوص و متون کو تسلیم کرنا پسند نہیں کرتے تھے لہٰذا انہوں نے ان روایات کا یہ حل ڈھونڈا کہ ایسی تمام روایات کی تاویل و توجیہ کی جائے اور من مانی تاویلات سے انہیں قابل قبول بنالیا جائے۔ چنانچہ اس عمل کے نتیجے میں نص کے الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن تاویل سے ان الفاظ کی روح کو سلب کرلیا گیا اور عملی طور پر تاویل نے نص کا مقام حاصل کرلیا۔

اس تاویل کا مقصد صرف یہی تھا کہ جیسے بھی ہو اپنے نظریات کا تحفظ کیا جائے اور مسلمانوں کو دوسرے نظریات قبول کرنے سے روکا جائے اور اپنے نظریاتی مخالفین کو ان روایات سے استفادہ نہ کرنے دیا جائے۔

مکتب خلافت کے علماء کی یہ کوششیں صرف احادیث کے متون تک ہی محدود نہ رہیں بلکہ انہوں نے تاریخ پر بھی ہاتھ صاف کئے اور حکومت مخالف صحابہ اور تابعین کے حالات کو بھی توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ انہوں نے تاریخی واقعات کے علل و اسباب کچھ اس طرح بیان کئے کہ ظالم مظلوم اور مظلوم ظالم دکھائی دینے لگا۔ ہر دور میں ان علماء کو مقتدر طبقے کی آشیرباد حاصل رہی اور حکومت کی پروپیگنڈہ مشینری ان کے ساتھ تھی اسی لئے وہ پروپیگنڈے کی جنگ میں پیش پیش رہے۔

مکتب خلافت کے علماء نے تاویل و توجیہ کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان میں قدم رکھا اور اس ذریعے سے اپنے پیروکاروں کو جھوٹی تسلیاں دیں اور مخالفین سے اپنا بچاؤ کیا۔

مکتب خلافت کے علماء ومحدثین کی تسلیوں کی حیثیت وقتی طور پر سکون آور گولیوں کی سی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان "گولیوں" سے مسلمانوں کو مطمئن کریں اور حکام کو راضی رکھیں لیکن میرے خیال میں ان گولیوں کا اثر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا اور لوگ حقائق تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس کی ایک مثال خود میں ہوں۔

مکتب خلافت کو حضرت علیؑ اور اہلبیت طاہرینؑ کی شان میں موجود احادیث نے سخت پریشان کیا ہوا ہے۔ وہ ان احادیث کی تاویل کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ ان احادیث میں سے اکثر ان کے اپنے قواعد کے تحت صحیح ہیں۔

ان احادیث میں حضرت علیؑ کا خصوصی مرتبہ بیان کیا گیا ہے اور آپ کی ایسی خصوصیات بیان کی گئی ہیں جن کی وجہ سے آپ تمام صحابہ سے افضل وممتاز ثابت ہوتے ہیں نیز ان میں حضرت علیؑ اور ان کے خاندان کی خصوصی اسلامی خدمات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔

حضرت علیؑ اور ان کے خاندان کی افضلیت متون حدیث میں موجود ہے مگر حکومت سے وابستہ علماء نے حکام کی آشیرباد سے ان نصوص کی من پسند تاویل وتوجیہ کی اور تاریخی واقعات کے علل واسباب کو مسخ کیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ یہ لوگ نصوص کو الٹ پلٹ کر تاریخ کی حرکت کو اپنے فائدے میں گردش دینے کے خواہش مند ہیں۔

حجاج بن مسلم نے اپنی صحیح میں لکھا ہے کہ رسول خداؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: "تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔"

یہ نص کی عبارت ہے۔ اب ذرا اس کی تاویل ملاحظہ فرمائیں۔ نص کے حاشیے پر یہ عبارت لکھی گئی: "جو لوگ اس حدیث سے حضرت علیؑ کی خلافت کا استدلال کرتے ہیں وہ راہ حق سے منحرف ہیں کیونکہ حضور اکرمؐ کی زندگی میں رشتہ داروں پر خلیفہ بننا اور بات ہے اور رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد پوری امت کا خلیفہ بننا اور بات ہے۔" (صحیح مسلم (شرح نووی) کتاب فضائل الصحابہ، باب من مناقب علی، ج۱۵، ص۱۷۴)

حجاج بن مسلم نقل کرتے ہیں کہ رسول خداؐ نے روز خیبر ارشاد فرمایا: "میں کل ایسے شخص کو علم دوں گا جو خدا اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہوگا اور خدا اور اس کا رسول بھی

اس سے محبت کرتے ہوں گے۔"

راوی کہتا ہے کہ ہم نے اپنی گردنیں بلند کیں کہ شاید ان الفاظ سے رسول خداؐ نے ہم میں سے کسی شخص کی طرف اشارہ کیا ہو لیکن اچانک آپ نے فرمایا: علیؑ سے کہو کہ وہ یہاں آئے۔ حضرت علیؑ کو آشوب چشم کی حالت میں آنحضرتؐ کے پاس لایا گیا۔ رسول خداؐ نے اپنا لعاب دہن حضرت علیؑ کی آنکھوں پر لگایا پھر آپ نے انہیں پرچم عطا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؑ کے ذریعے سے مسلمانوں کو فتح عنایت کی۔ مسلم حاشیۂ حدیث میں لکھتے ہیں: "خدا کی قسم! یہ علیؑ کی عظیم منقبت اور فضیلت ہے۔"[۱] اور جب آیت مباہلہ **فقل تعالوا ندع ابناء نا وابناء کم.....** (سورۂ آل عمران: آیت ۶۱) نازل ہوئی تو رسول خداؐ نے علیؑ وفاطمہؑ، حسنؑ وحسینؑ کو بلا کر فرمایا: خدایا! یہ ہیں میرے اہلبیت۔ (صحیح مسلم، ج۱۵، ص۱۷۶)

مسلم لکھتے ہیں کہ رسول خداؐ نے مکہ ومدینہ کے درمیان مقام خم پر قیام کیا اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ نے اللہ کی حمد وثنا اور وعظ ونصیحت کے بعد لوگوں سے فرمایا: اے لوگو! میں بھی تمہارے جیسا انسان ہوں اور خدا کا فرستادہ فرشتہ عنقریب میرے پاس آئے گا اور میں اس کی دعوت کو قبول کروں گا۔ پس میں اپنے بعد تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ ان میں سے پہلی اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدات اور نور ہے۔ تم ہمیشہ کتاب خدا سے وابستہ رہنا۔

پھر آپ نے لوگوں کو قرآن مجید سے وابستگی کی ترغیب دی اور لوگوں کو اس کا شوق دلایا۔ اس کے بعد فرمایا: اور میرے اہلبیت اور میں تمہیں اہلبیت کے متعلق وصیت کرتا ہوں۔

حصین نے حدیث کے اصل راوی زید بن ارقم سے پوچھا: کیا حضورؐ کی ازواج اہلبیت میں سے نہیں ہیں؟

زید نے کہا: کیوں نہیں! آپ کی ازواج آپ کی اہلبیت میں سے ہیں لیکن اس حدیث میں اہلبیت سے وہ افراد مراد ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔

حصین نے پوچھا: وہ کون ہیں؟

۱۔ شرح صحیح مسلم میں اس امر کا نووی نے حدیث سے استنباط کیا لیکن وہ حقیقت میں علیؑ کی منزلت اور ان [illegible]

زید نے کہا: وہ آل علیؑ، آل عقیل، آل جعفر اور آل عباس ہیں۔

حصین نے پوچھا: کیا ان سب پر صدقہ حرام ہے؟

زید نے کہا: جی ہاں۔ (صحیح مسلم، ج ۱۵، ص ۱۸۱)

دوسری روایت کے مطابق زید نے حصین سے کہا: خدا کی قسم! عورت ایک عرصے تک اپنے شوہر کے پاس رہتی ہے پھر ممکن ہے کہ شوہر اس کو طلاق دیدے تو طلاق کے بعد عورت اپنے والد اور اپنی قوم کے پاس واپس آ جاتی ہے لیکن اہلبیت وہ ہیں جن کی بنیاد ایک ہے اور جن پر آپ کے بعد صدقہ حرام ہے۔ (صحیح مسلم، ج ۱۵، ص ۱۸۱)

بخاری نے رسول خداؐ کی یہ حدیث نقل کی کہ آپ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں۔ (صحیح بخاری، کتاب فضائل الصحابہ، باب مناقب الامام علی، ج ۵، ص ۲۲، باب ۹۔ سنن ابن ماجہ، ج ۱، ص ۴۴، حدیث ۱۱۹)

حجاج بن مسلم نے حضرت علیؑ کا یہ فرمان نقل کیا ہے: اس ذات کی قسم جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور جاندار چیزوں کو پیدا کیا، رسول خداؐ نے مجھ سے یہ عہد کیا تھا کہ مومن کے علاوہ کوئی تجھ سے محبت نہ کرے گا اور منافق کے علاوہ کوئی تجھ سے دشمنی نہیں کرے گا۔ (صحیح مسلم، کتاب الیمان، ج ۱، ص ۸۶، حدیث ۱۳۱۔ ترمذی کتاب المناقب، ج ۵، ص ۶۳، حدیث ۳۷۱۷۔ فتح الباری، ج ۷، ص ۵۷)

نسائی اور ترمذی نے رسول خداؐ کی یہ حدیث نقل کی کہ آپؐ نے فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، اس کا علیؑ مولا ہے۔ (مسند احمد بن حنبل، ج ۱، ص ۸۴۔ سیوطی لکھتے ہیں کہ یہ حدیث متواتر ہے۔ خصائص نسائی، ص ۹۹، حدیث ۸۲، باب ۶۷۔ ترمذی، ج ۵، ص ۶۳۳، حدیث ۳۷۱۷)

ابن حجر نے احمد بن حنبل، نسائی، اسماعیل قاضی اور ابوعلی نیشاپوری کا یہ قول نقل کیا کہ سند صحیح کے ساتھ کسی صحابی کے اتنے فضائل وارد نہیں ہوئے جتنے علیؑ کے لئے وارد ہوئے ہیں۔ (فتح الباری، ج ۷، ص ۵۷۔ الاصابہ، ج ۲، ص ۵۰۷، نمبر ۵۶۸۸)

ابن سیرین کا خیال تھا کہ فضائل علیؑ کی اکثر احادیث جھوٹ پر مبنی ہیں۔ (فتح الباری، ج ۷، ص ۶۰)

ابن حجر نے ابن سیرین کے قول کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: ابن سیرین نے یہ الفاظ ان روایات کے لئے کہے جنہیں روافض نے حضرت علیؑ کے متعلق نقل کیا ہے اور جو شیخین کی مخالفت پر مشتمل ہیں۔[۱]

ابن حجر نے حدیث منزلت انت منی بمنزلۃ هارون من موسٰی کے حاشیے میں لکھا کہ بعض افراد اس حدیث سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ دوسرے صحابہ کی بہ نسبت خلافت کے زیادہ حقدار تھے کیونکہ وہ مثیل ہارونؑ تھے اور حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے خلیفہ تھے۔ ایسے لوگوں کی یہ دلیل درست نہیں ہے کیونکہ حضرت ہارونؑ، حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں ان کے جانشین تھے۔ حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد ان کے جانشین نہیں تھے کیونکہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں وفات پائی تھی۔ (فتح الباری، ج ۷، ص ۶۰)

حدیث خیبر کے متعلق ابن حجر تے یوں ''گوہر افشانی'' کی: رسول خداؐ نے یہ کہہ کر کہ ''علیؑ، خدا اور اس کے رسول کا محبّ اور خدا و رسول کا محبوب ہے'' علیؑ کی محبت کو ثابت کیا ہے (اور ویسے یہ علیؑ کی کوئی خاص فضیلت نہیں) کیونکہ اس صفت میں تمام مسلمان علیؑ کے ساتھ شریک ہیں۔ اس حدیث میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے کہ قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله. ''آپ کہہ دیں اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، تم خدا کے محبوب بن جاؤ گے۔'' (سورۂ آل عمران: آیت ۳۱)

۱۔ فتح الباری، ج ۷، ص ۶۰۔ علاوہ ازیں اسی کتاب کے ص ۱۵۷ پر ابن حجر نے لکھا:

''حضرت علیؑ کے متعلق لوگوں کے تین گروہ ہیں: (۱) اہلسنت (۲) بدعت پرست خوارج (۳) بنی امیہ میں سے حضرت کے دشمن اور بنی امیہ کے پیروکار۔ اہلسنت نے حضرت علیؑ کے فضائل کو خوب پھیلایا اور یوں حضرت علیؑ کے فضائل نقل کرنے والے راوی بہت زیادہ ہوگئے کیونکہ حضرت کے مخالفین کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی لیکن اگر میزان عدالت پر وزن کیا جائے تو حضرت علیؑ کے فضائل باقی خلفاء سے زیادہ نہیں تھے۔''

ان الفاظ سے ابن حجر دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضرت علیؑ کے فضائل خلفائے ثلاثہ سے زیادہ نہیں ہیں اور انہیں سابقہ خلفاء پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے۔ ابن حجر کا تعصب اس کی تقسیم سے ہی عیاں ہے کیونکہ اس نے حضرت علیؑ کے متعلق تین گروہوں کا ذکر کیا اور اس میں شیعوں کا کہیں نام تک نہ لیا گویا اس نے شیعوں کو بدعت پرست خوارج اور بنی امیہ کی ردیف میں کھڑا کر دیا اور یہ محض اتفاق سے نہیں ہوا بلکہ اس کے پیچھے شدید تعصب کارفرما تھا۔

اور رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کی صفت محبت کا اثبات کر کے اس طرف اشارہ کیا کہ علیؑ مکمل طور پر رسول خداؐ کے پیروکار ہیں اسی لئے وہ اللہ کے محبوب ہیں اسی لئے علیؑ کی محبت دلیل ایمان اور علیؑ کی دشمنی دلیل نفاق ہے۔ (فتح الباری، ج ۷، ص ۵۷)

مکتب خلافت کے پیروکاروں کے لئے حدیث ثقلین نے بڑی پریشانی پیدا کی کیونکہ اس حدیث کے بموجب آنحضرتؐ نے بار بار لوگوں کو متوجہ کر کے فرمایا کہ میں تمہیں اپنے اہلبیتؑ کے متعلق خدا یاد دلاتا ہوں۔

اس حدیث کے اسناد پر جب کوئی اعتراض نہ بن سکا تو پھر انہوں نے اپنے لئے توجیہ و تاویل کا دروازہ کھولا اور اہلبیتؑ کے مفہوم میں عمومیت پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔ مثلاً مسلم نے آیۂ مباہلہ کے ضمن میں لکھا کہ رسول خداؐ نے علیؑ و فاطمہؑ وحسنؑ وحسینؑ کے متعلق فرمایا کہ یہ میرے اہلبیت ہیں۔ پھر دوسرے مرحلے پر اس میں عمومیت پیدا کرتے ہوئے لکھا کہ اس سے مراد آل علیؑ، آل عقیل، آل جعفر اور آل عباس ہیں۔ پھر تیسرے مرحلے پر اس میں زیادہ عمومیت پیدا کرتے ہوئے کہا کہ آنحضرتؐ کی ازواج بھی اہلبیت میں سے ہیں۔ اس سلسلے کی عجیب بات یہ ہے کہ راوی بیک وقت ازواج کو اہلبیت میں شامل بھی کرتا ہے اور انہیں اہلبیت سے خارج بھی کرتا ہے۔

ان تمام تر کوششوں کا مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ لفظ اہلبیت کے مفہوم کو ہی مشکوک بنا دیا جائے اور اہلبیتؑ کو ازواج پیغمبر اور بنی ہاشم کے درمیان چھپا دیا جائے اور یوں ہادیان امت کو گمنام بنا دیا جائے اور جب اہلبیتؑ گمنامی میں چلے جائیں گے تو ان کے لئے خودساختہ رہبروں کی قیادت کو لانا آسان ہو جائے گا۔

مسلم کی اس روش پر ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ اس نے حجۃ الوداع اور غدیر خم کی روایات تو بیان کیں لیکن اس میں اہلبیت کے کسی فرد کے نام کا ذکر تک نہ کیا (اور حدیث غدیر "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کا تذکرہ تک نہ کیا۔) [1]

۱۔ صحیح مسلم، ج ۴، ص ۱۸۷۳، حدیث ۳۷۔ اس روایت میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ رسول خداؐ نے مسلمانوں کو صرف قرآن مجید سے وابستگی کی سفارش کی تھی۔

اہلبیتؑ کو اچھی طرح سے چھپانے اور انہیں امت سے دور رکھنے کے لئے حدیث غدیر کے مقابلے میں یار لوگوں نے اپنی طرف سے ایک اور روایت گھڑلی اور یہ روایت اس لئے گھڑی گئی کہ لوگ وصیت رسولؐ کے تحت اہلبیتؑ کی قیادت کو تسلیم کرنے نہ لگ جائیں اور اس خودساختہ حدیث کا مقصد ہی یہ ہے کہ اہلبیتؑ کے متعلق وصیت رسولؐ کو دیوار پر مارنا چاہئے۔

مالک نقل کرتے ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا: میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں، اگر تم ان سے وابستہ رہوگے تو میرے بعد گمراہی سے بچ جاؤگے (اور وہ ہیں) کتاب خدا اور میری سنت۔ (مستدرک، ج ۱، ص ۹۳۔ موطاء، ج ۲، ص ۸۹۹، حدیث ۳)

مالک کی اس روایت کو جان بوجھ کر شہرت دی گئی اور اس روایت کو کتابوں میں اتنی بار نقل کیا گیا اور منابر پر اس کا اتنا تذکرہ کیا گیا کہ مسلم کی حدیث گوشۂ گمنامی میں چلی گئی بلکہ اگر آج کوئی مسلم کی حدیث بیان بھی کرے تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ [1]

صحیح مسلم کی حدیث میں رسول خداؐ نے اپنے خلفاء کی تعداد بارہ بیان فرمائی اور حدیث کے معیار پر شیعوں کے بارہ ائمہ کے علاوہ کوئی پورا نہیں اترتا مگر یہاں بھی ہاتھ کی صفائی دکھائی گئی اور حدیث کا رخ ائمہ اہلبیتؑ سے ہٹا کر بنی امیہ کے حکمرانوں کی طرف پھیر دیا گیا۔ اس کا مقصد صرف یہی تھا کہ شیعہ اس حدیث سے اپنے ائمہ کے لئے استدلال نہ کرسکیں۔ [2]

رسول اکرمؐ نے بارہ خلفاء کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ وہ عزت اسلام کے رکھوالے ہوں گے مگر علماء و محدثین نے اس حدیث کو مندرجہ ذیل بارہ افراد میں محدود کردیا:

(۱) حضرت ابوبکرؓ (۲) حضرت عمرؓ (۳) حضرت عثمانؓ (۴) حضرت علیؑ (۵) معاویہ (۶) یزید بن معاویہ (۷) عبدالملک بن مروان (۸) ولید بن عبدالملک

۱۔ جب میری علماء سے گفتگو ہوئی تو مجھے معلوم ہوا کہ انہیں حدیث ثقلین میں لفظ "عترتی" کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں تھا اور جب میں نے انہیں یہی حدیث صحیح مسلم میں دکھائی تو وہ حیران رہ گئے اور انگشت عبرت منہ میں دبالی۔

۲۔ بارہ ائمہ کی حدیث بڑی مشہور ہے اور متعدد طرق و الفاظ سے یہ آنحضرتؐ سے مروی ہے۔ ایک حدیث میں یہ الفاظ وارد ہیں: اسلام بارہ خلفاء تک معزز و محترم رہے گا۔ ایک اور حدیث میں یہ الفاظ وارد ہیں: یہ امر (دین) بارہ خلفاء تک ختم نہ ہوگا۔ (صحیح مسلم، کتاب الامارہ، ج ۳، ص ۱۴۵۳، حدیث ۷۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب ۵۱، ج ۹، ص ۱۰۱۔ تاریخ الخلفاء سیوطی، ص ۱۰)

(۹) سلیمان بن عبدالملک (۱۰) یزید بن عبدالملک (۱۱) ہشام بن عبدالملک (۱۲) عمر بن عبدالعزیز اور پھر لکھا کہ ان بارہ خلفاء کے بعد خلافت کا رنگ اڑ گیا۔[1]

اور جب ہم علماء کے بیان کردہ بارہ ائمہ کے حالات زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں سے حضرت علیؑ کے علاوہ کسی میں بھی امامت کی معمولی سی خصوصیت دکھائی نہیں دیتی۔ یہ لوگ صرف اور صرف حاکم تھے مگر علماء نے سیاست کے دباؤ پر حدیث نبویؐ کو ان کے وجود پر چسپاں کردیا جبکہ حدیث بارہ ائمہ اہلبیتؑ کے علاوہ کسی پر منطبق نہیں ہوسکتی۔[2]

علماء کی یہ روش دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ ہمارے علماء نے جب بھی دیکھا کہ کوئی روایت ان کے نظریات سے متصادم ہو رہی ہے تو انہوں نے تاویل و توجیہ کے ہتھیار اٹھا کر اسے بے اثر بنانے کی کوشش کی۔

اس روش کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

بخاری سے لے کر حدیث و تاریخ کی چھوٹی کتابوں تک ہر جگہ ہمیں یہ جملہ دکھائی دیتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ نے حضرت ابوبکرؓ سے خمس، فدک اور میراث کا مطالبہ کیا تھا اور انہوں نے بی بی کو کچھ بھی دینے سے انکار کردیا تھا جس کی وجہ سے بنت رسولؐ، ابوبکرؓ پر غضبناک ہوئی تھیں اور جب تک زندہ رہیں ان سے بات نہیں کی۔

اس روایت کے متعلق ابن حجر نے اپنے فقہاء کے تاویل و توجیہ پر مبنی جوابات کو یوں

۱۔ ملاحظہ فرمائیں شرح عقیدہ طحاویہ، ص ۴۸۸۔ فتح الباری، ج ۱۳، ص ۱۷۹ تا ۱۸۳۔ آخر کتاب الاحکام۔ صحیح مسلم، شرح نووی، ج ۱۲، ص ۲۰۱۔ مذکورہ بارہ خلفاء پر ایمان رکھنا عقائد تسنن کے اصول اعتقاد میں شامل ہے۔

۲۔ رسول خدا نے اپنی حدیث میں جن بارہ اماموں کی پیشگوئی فرمائی تھی اس سے بارہ ائمہ اہلبیتؑ مراد ہیں جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: (۱) امام علیؑ (۲) امام حسنؑ (۳) امام حسینؑ (۴) امام علی زین العابدینؑ (۵) امام محمد باقرؑ (۶) امام جعفر صادقؑ (۷) امام موسیٰ کاظمؑ (۸) امام علی رضاؑ (۹) امام محمد تقیؑ (۱۰) امام علی نقیؑ (۱۱) امام حسن عسکریؑ (۱۲) امام مہدی منتظرؑ۔

ان ائمہ اہلبیتؑ کی سیرت کے لئے دیکھئے: سید محسن امین کی کتاب اعیان الشیعہ اور باقر شریف القرشی کی کتاب حیات الائمہ اور ہاشم معروف الحسنی کی کتاب سیرت ائمہ اہلبیتؑ (مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی)

علمائے تسنن نے ائمہ اہلبیتؑ سے تجاہل عارفانہ کیا ہے اور اگر انہوں نے ان ذوات قدسیہ کا ذکر کیا تو انتہائی اختصار کے ساتھ کیا ہے

نقل کیا: ''بنت رسولؐ نے ابوبکرؓ سے مرتے وقت تک بات نہیں کی'' کے معنی یہ ہیں کہ بی بی نے آخری لمحات تک فدک کے متعلق ابوبکرؓ سے دوبارہ کوئی بات نہیں کی۔

اور ''بی بی، ابوبکرؓ پر ناراض ہوئیں'' کے معنی یہ ہیں کہ بی بی کو اس بات کا سخت قلق ہوا کہ انہوں نے اپنے والد کا فرمان ان کی اپنی زبانی کیوں نہ سنا۔

''بی بی نے کہا تھا کہ میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ سے کوئی بات نہیں کروں گی'' کے معنی یہ ہیں کہ میں میراث کے متعلق آئندہ ان دونوں سے کوئی بات نہیں کروں گی۔ (فتح الباری، ج ۶، ص ۱۵۱)

بعض فقہاء نے حضرت فاطمہ زہراؑ کے مطالبے اور ناراضگی کی یوں توجیہ کی:

روایات میں ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے بی بی کے سامنے ان کے والد کی حدیث پیش کی تھی تو بی بی ناراض ہوئیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بی بی نے اس حدیث کو تسلیم کیا تھا لیکن بی بی اور ابوبکرؓ کے نقطہ ہائے نظر جدا جدا تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اس حدیث کو عمومیت پر محمول کرتے تھے جبکہ بی بی اس میں تخصیص کی قائل تھیں اور اس سلسلے میں بی بی کا نظریہ یہ تھا کہ اگرچہ وہ زمین کی وارث نہیں ہیں لیکن زمین کے منافع اور پیداوار میں انہیں ان کا حصہ دیا جاسکتا ہے۔ دونوں کے پاس اپنی اپنی تاویلات موجود تھیں اور جب ابوبکرؓ نے اپنی رائے کو حتمی قرار دیا تو بی بی نے ان سے رخ موڑ لیا۔ (فتح الباری، ج ۶، ص ۱۵۱)

علاوہ ازیں ابن حجر نے وکیل صفائی کا کردار ادا کرتے ہوئے ایک روایت نقل کی جس میں کہا گیا کہ بی بی نے ابوبکرؓ سے مصالحت کرلی تھی۔

پھر ابن حجر نے اپنی دریافت کردہ روایت کے متعلق کہا: اگرچہ یہ حدیث مرسل ہے لیکن اس کے اسناد صحیح ہیں۔ اس حدیث سے اشکال دور ہو جاتا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بی بی فاطمہ آخری وقت تک ابوبکرؓ سے ناراض نہیں تھیں۔ (فتح الباری، ج ۶، ص ۱۵۱)

ان تمام توجیہات کا واحد مقصد حضرت ابوبکرؓ کو بری الذمہ قرار دینا ہے۔ ان توجیہات کی وجہ سے فقہاء نے حضرت ابوبکرؓ کی اس اہلبیت دشمنی کو جائز قرار دیا جس کی وجہ سے انہوں نے حضرت زہراؑ کو رسول خداؐ کی میراث سے محروم کیا تھا۔ فقہاء نے اپنی توجیہات سے

لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ حضرت ابوبکرؓ عالم اور دانش مند تھے اور ان کے مقابلے میں آنے والے افراد احکام دین اور علم رسولؐ سے بے بہرہ تھے۔ فقہاء کو یہ تاثر دیتے ہوئے حیا آنی چاہئے تھی کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے مقابلے میں حضرت فاطمہؑ اور حضرت علیؑ تھے۔[۱]

اگر آپ فقہاء کی بدترین توجیہ و تاویل کو دیکھنے کے خواہش مند ہوں تو حضرت علیؑ اور معاویہ کی باہمی جنگوں کے متعلق ان کی تاویل ملاحظہ فرمائیں۔

فقہاء نے معاویہ کو علیؑ کے مساوی قرار دینے کی غرض سے معاویہ کو مجتہد کہا اور یہ موقف اپنایا کہ معاویہ نے اجتہاد کیا تھا مگر اس سے اجتہادی خطا ہوگئی تھی جس کی وجہ سے اس نے حضرت علیؑ سے جنگیں لڑیں اور لاکھوں مسلمانوں کو قتل ہوئے۔ چونکہ معاویہ کا جنگ لڑنا اور محبان علیؑ کو قتل کرنا اجتہاد کے تحت انجام پایا تھا اس لئے معاویہ گنہگار نہیں بلکہ اسے اس پر اجر و ثواب عطا کیا جائے گا کیونکہ رسول خداؐ کا فرمان ہے:

''حاکم کا اجتہاد صحیح ہو تو اللہ تعالیٰ اسے دو اجر عطا کرے گا اور اگر اس سے اجتہاد میں غلطی ہو جائے تو بھی اللہ اسے ایک اجر ضرور دے گا۔'' (صحیح بخاری، **کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ**، ج۹، ص۱۳۲و۱۳۳، باب۲۱)

فقہاء اس نص کو پہلے تو احکام شرعی کے استباط کے حوالے سے پیش کرتے تھے لیکن سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے اس نص کو معاویہ کی بے گناہی ثابت کرنے اور اس کے جملہ افعال کو جائز ثابت کرنے کے لئے استعمال کرنے پر مجبور ہوگئے۔[۲]

ہمارے فقہاء نے علیؑ و معاویہ کو یکساں ثابت کرنے کے لئے بڑے جتن کئے جس کی وجہ سے مجھے اپنے فقہاء کے کردار سے کراہت محسوس ہوئی۔ اس میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب میں نے امام نسائی کی داستان شہادت پڑھی۔[۳] میں نے امام نسائی کی روح کو خراج تحسین

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے ابن کثیر کی البدیہ والنہایہ اور سید محمد باقر الصدر کی فدک تاریخ کی روشنی میں۔

۲۔ جنگ صفین کی تفصیلات کے لئے دیکھئے: **الملل والنحل**، ابن حزم اور **الملل والنحل**، شہرستانی اور **العواصم من القواصم**، ابن عربی۔

۳۔ امام نسائی ۳۰۳ھ میں اہل شام کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ فضائل امیرالمومنینؑ پر ان کی کتاب "خصائص" ان کی شہادت کا سبب بن گئی۔ بحوالہ **وفیات الاعیان از ابن خلکان**۔

پیش کیا کہ انہوں نے موت کو ترجیح دی لیکن معاویہ کے فضائل بیان کرنے سے انکار کردیا۔

میری عقل اور میرا ضمیر اس فتوی سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ علیؑ اور معاویہ دونوں کا رتبہ مساوی تھا۔ فقہاء کا موقف یہ ہے کہ معاویہ ایک صحابی تھے اور تمام صحابہ عادل ہیں اسی لئے صحابہ کے تمام اعمال و افعال کی توجیہ کرنی چاہئے اور انہیں صحیح سمجھنا چاہئے۔[۱]

فقہاء کی بے توفیقی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امام حسینؑ کے قاتل اور مدینہ منورہ کی حرمت پامال کرنے والے یزید کے غلط کاموں کے لئے بھی ابن تیمیہ، ابن کثیر اور ابن خلدون نے توجیہ و تاویل سے کام لیا ہے۔

ابن تیمیہ یزید کے متعلق لکھتا ہے: یزید ایک مسلم جوان تھا، وہ کافر اور ملحد ہرگز نہیں تھا، اپنے والد کی وفات کے بعد اس نے حکومت سنبھالی تھی، چند مسلمان اس پر ناراض بھی تھے اور مسلمانوں کے کئی گروہ اس سے راضی بھی تھے۔ وہ سخی اور بہادر شخص تھا، وہ کسی طور پر پلیدی کا مظہر نہیں تھا جیسا کہ اس کے دشمن اس کے متعلق کہتے ہیں۔ اس نے امام حسینؑ کے قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا اور ان کے قتل کے بعد اس نے خوشی و مسرت کا اظہار نہیں کیا تھا اور اس نے امام حسینؑ کے لبوں اور دانتوں پر چھڑی نہیں رکھی تھی اور اس نے امام حسینؑ کے سر کو شام کی طرف طلب نہیں کیا تھا۔ اس نے بس یہی کچھ کہا تھا کہ امام حسینؑ کو اقتدار پر قابض نہ ہونے دیا جائے اور اگر وہ مجبور ہو جائیں تو امام حسینؑ سے جنگ کریں لیکن یزید کے نمائندوں نے اس کے حکم سے تجاوز کیا اور عبیداللہ بن زیاد نے شمر بن ذی الجوشن اور دوسری سپاہ کو امام حسینؑ کے

۱۔ البدایہ والنہایہ۔ فتاویٰ ابن تیمیہ، ج۳، ص۴۱۱۔ **العواصم من القواصم** اور تاریخ ابن خلدون میں مذکور ہے کہ اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ صحابہ کو اچھائی کے بغیر یاد نہ کیا جائے اور تمام صحابہ جنتی ہیں۔

اسفرائینی کے مطابق اہلسنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ تمام صحابہ عادل اور دین دار تھے لہٰذا ان پر تنقید کرنا صحیح نہیں ہر مسلمان کو ان کی تعریف کرنی چاہئے۔

ابن ابی زرعہ عراقی کے مطابق جس شخص کو صحابہ پر تنقید کرتے ہوئے پاؤ تو جان لو کہ وہ ملحد اور زندیق ہے۔

ہم ان فتووں کی حقیقت کو خوب جانتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ معاویہ اور اس جیسے لوگ جو صحابہ کی صفوں میں گھس گئے تھے "عظمت صحابہ" کی چھتری تلے ان پر تنقید کا دروازہ بند کر دیا جائے۔

خلاف برانگیختہ کیا۔ عبیداللہ بن زیاد نے واقعی امام حسینؑ پر زیادتی کی تھی۔ امام حسینؑ نے کہا تھا کہ مجھے یزید کے پاس لے چلو یا مجھے اسلامی قلمرو سے باہر جانے کی اجازت دیدو یا مجھے مکہ واپس جانے دو۔ لیکن ابن زیاد کی فوج نے امام حسینؑ کی کسی پیشکش کو قبول نہ کیا اور عمر بن سعد نے ان سے جنگ کی جس کی وجہ سے امام حسینؑ اور ان کے افراد خاندان مظلوم ہو کر مارے گئے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ، ج ۳، ص ۴۱۰)

جب تک میں نے یہ فتویٰ نہیں پڑھا تھا میں ابن تیمیہ کی عزت کرتا تھا اور اس سے محبت کرتا تھا بلکہ اس کی تعریف میں رطب اللسان رہتا تھا مگر اس کا یہ فتویٰ پڑھنے کے بعد میں اس سے متنفر ہو گیا اور میری نگاہوں میں اس کی کوئی توقیر باقی نہ رہی۔

جب میں نے ابن تیمیہ کا مزید مطالعہ کیا تو دیکھا کہ وہ بنی امیہ کا اس حد حامی ہے کہ وہ امام حسینؑ کو خطاوار گردانتا ہے اور یزید کے خلاف ان کے قیام پر تنقید کرتا ہے اور امام حسینؑ کو ہی واقعۂ کربلا کا حقیقی سبب قرار دیتا ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ، ج ۳، ص ۴۱۰)

ابن تیمیہ صرف یزید کا دفاع ہی نہیں کرتا بلکہ جن روایات میں یزید کی تباہ کاریوں کا ذکر ہے، وہ ان روایات پر بھی جرح کرتا ہے اور اسے امام حسینؑ کے قتل سے مبرا قرار دیتا ہے۔ اس کی جسارت یہاں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس نے امام حسینؑ کی توہین کی ہے اور انہیں ایک بے قدر و قیمت شخص تک کہا ہے۔ **نعوذ باللہ من ذلک ولعن اللہ علی اعداء الحسین۔**

ابن تیمیہ کہتا ہے کہ امام حسینؑ نے فوج یزید کے سامنے تین تجاویز پیش کی تھیں اور یہ روایت صحیح ہے اور اس صحیح روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؑ نے اپنے خروج کو خود ہی غلط اقدام کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔

جی ہاں! مکتب خلافت کی بنیاد ہی تاویل و توجیہ کی اساس پر قائم ہے۔ تاویل و توجیہ کو اس مذہب میں ایک اتفاقی امر قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ یہ ان کا مستقل ہتھیار ہے جس کے تحت وہ ہمیشہ روایات و واقعات کی غلط توجیہ کر کے انہیں اپنے مفاد میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دھوکا اور فریب ہمیشہ جاری نہ رہ سکے گا اور ایک دن ایسا بھی آئے گا جب عقل سلیم ان تمام تر تاویلات کو حقارت سے ٹھکرا دے گی۔

بخاری لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے فرمایا: میں قیامت کے دن سب سے پہلے اپنے مہربان خدا کے سامنے زمین پر زانو رکھوں گا۔ (صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی جہل، ج ۵، ص ۹۵)

بخاری نے اس روایت کو کتاب المغازی میں نقل کیا اور اسے هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ کی آیت سے ارتباط دیا ہے اور کہا ہے کہ اس سے مراد وہ دو جھگڑنے والے ہیں جنہوں نے غزوہ بدر میں ایک دوسرے سے مقابلہ کیا تھا اور جنگ بدر میں حمزہؑ، علیؑ، عبیدہ بن حارث کا مقابلہ عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ سے ہوا تھا۔ یہ آیت ان کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ (فتح الباری، ج ۷، ص ۲۳۷)

ابن حجر نے حضرت علیؑ کے فرمان پر حاشیہ لکھتے ہوئے کہا: اس آیت میں علیؑ کو دوسرے مجاہدین اسلام پر اس لئے اولیت دی گئی کیونکہ جنگ بدر اسلام کی پہلی جنگ تھی۔ (فتح الباری، ج ۷، ص ۲۳۷)

الغرض بخاری اور ابن حجر نے حضرت علیؑ کے فرمان کو صرف جنگ بدر کے ساتھ مخصوص کرنے کی پوری کوشش کی جبکہ حضرت کا فرمان صرف جنگ بدر تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ حضرت کا مقصد یہ تھا کہ میں قیامت کے دن اپنے ہر مخالف کے خلاف بارگاہ خداوندی میں دوزانو ہو کر درخواست کروں گا۔

حضرت کے فرمان کو مخصوص کرتے وقت بخاری اور ابن حجر کو یہ خیال نہ آیا کہ الفاظ کا عموم معتبر ہوتا ہے اور خصوص علت معتبر نہیں ہوتا۔

پیغمبر اکرمؐ اور ازواج

میرا خیال تھا کہ مستشرقین نے رسول خداؐ کو شہوت پرست اور عورتوں کا رسیا انسان لکھ کر بہت بڑا ظلم کیا ہے اور میری نظر میں یہ سب کچھ صلیب کے فرزندوں کے پرانے کینہ کا اظہار ہے لیکن جب میں نے کتب سیرت میں اس طرح کی بہت سی روایات پڑھیں تو مجھے معلوم ہوا کہ مستشرقین کی ہفوات کا سرچشمہ ہماری ہی کتب سیرت وحدیث ہے۔

اعتذار

فاضل مؤلف نے یہاں بہت سی روایات نقل کی ہیں جنہیں ہم نے عظمت رسولؐ کے تحفظ کے پیش نظر حذف کردیا ہے۔

فاضل مؤلف نے مذکورہ روایات لکھ کر یہ تبصرہ کیا ہے کہ رسول اکرمؐ کی قدسی صفات شخصیت سے یہ روایات مطابقت نہیں رکھتیں۔ مگر عیاش حکمرانوں کو سند جواز فراہم کرنے کے لئے درباری ملاؤں نے اس طرح کی روایات کو اپنی طرف سے تخلیق کیا اور ان کی نشر و اشاعت کی مگر ہم نے ایسی تمام روایات کو حذف کردیا ہے کیونکہ وہ رسالت کے مقام رفیع سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ اس کے لئے ہم مؤلف اورقارئین سے معذرت خواہ ہیں۔(ازمترجم فارسی)

میں جب کتب حدیث میں ان روایات کو پڑھتا تو اپنے آپ سے یہ سوال کرتا تھا کہ ایسی روایات تخلیق کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی اور کیا صاحب خُلقِ عظیم پیغمبرؐ کی شفاف زندگی

سے یہ روایات کچھ مطابقت بھی رکھتی ہیں؟

مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ کوئی بھی مسلمان خواہ فکری طور پر کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو وہ پیغمبر اکرمؐ پر اس طرح کی تہمتیں برداشت نہیں کرسکتا اور کوئی شخص اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرسکتا کہ خدا کا برگزیدہ پیغمبر اس قدر شہوت رانی سے مغلوب ہو۔[۱]

جنگ خیبر میں حُیی بن اخطب کی بیٹی صفیہ گرفتار ہوئی اور دحیہ کلبی کے حصے میں آئی۔ پھر اسے پیغمبر اکرمؐ کے پاس لایا گیا۔ آپ نے اسے آزادی دی اور اس سے نکاح کرلیا۔(صحیح بخاری، ج۵، ص۱۶۸، باب غزوہ خیبر۔ فتح الباری، ج۷، ص۳۷۸۔ صحیح مسلم، ج۲، ص۱۰۴۷، حدیث۱۳۶۵)

صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ ازواج پیغمبرؐ نے حضرت فاطمہؑ سے درخواست کی کہ وہ اپنے والد ماجد تک ان کی یہ درخواست پہنچائیں کہ وہ دختر ابوبکرؓ کے متعلق عدل سے کام لیں (یعنی اسے دوسری ازواج پر فوقیت نہ دیں) حضرت فاطمہؑ نے ازواج پیغمبرؐ کی یہ درخواست آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کی تو آپ نے فرمایا: بیٹی! کیا تم اس سے محبت نہ کروگی جس سے تمہارا باپ محبت کرتا ہے؟

بی بی نے کہا: کیوں نہیں۔ والد ماجد کا یہ جواب سن کر حضرت فاطمہؑ واپس آئیں اور انہیں آپ کے جواب سے مطلع کیا۔ ازواج پیغمبرؐ نے حضرت فاطمہؑ سے دوبارہ جانے کی درخواست کی مگر حضرت فاطمہؑ نے ان کی درخواست رَد کردی۔

پھر ازواج رسولؐ نے زینبؓ بنت جحش سے یہی درخواست کی اور وہ رسول خداؐ کی خدمت میں گئیں اور رسول خداؐ کے ساتھ بڑے تلخ لہجے میں باتیں کیں اور کہا کہ آپ کی ازواج آپ سے یہ مطالبہ کرتی ہیں کہ آپ ابوبکرؓ کی بیٹی کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ کریں۔ زینبؓ کی آواز بلند ہوئی اور اس نے عائشہؓ پر سب وشتم کیا۔

۱۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، فتح الباری اور دیگر کتب میں رسول خداؐ کی شہوت رانی کے بہت سے واقعات لکھے ہوئے ہیں ہم نے ادب پیغمبر اکرمؐ کے تقاضوں سے مجبور ہوکر ان روایات کا ترجمہ نہیں کیا۔ اس "تصرف" پر ہمیں معذور سمجھا جائے۔(ازمترجم فارسی)

عائشہؓ بھی وہاں موجود تھیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے عائشہؓ کی طرف رخ کیا تا کہ وہ خود انہیں جواب دیں۔ عائشہؓ نے زینبؓ کی باتوں کی تردید کی یہاں تک کہ اسے بیٹھنے پر مجبور کردیا۔ (صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، ج۳، ص۲۰۵۔ فتح الباری، ج۷، ص۱۷۵)

اس کے علاوہ ایسی روایات بھی موجود ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول خداؐ مخصوص ماہانہ ایام میں بھی اپنی ازواج سے مباشرت کرتے تھے۔

ادب پیغمبرؐ کی وجہ سے ہم ان رویات کو نقل کرنے سے قاصر ہیں۔

کتب سیرت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول خداؐ نے بی بی عائشہؓ سے چھ برس کی عمر میں نکاح کیا اور نو برس کی عمر میں ان کی رخصتی عمل میں آئی۔ (صحیح بخاری، باب تزویج النبیؐ عائشۃ، ج۵، ص۱۷، ج۷، ص۲۷۔ فتح الباری، ج۷، ص۱۷۹)

ابن کثیر کہتے ہیں: پیغمبر اکرمؐ نے چاہا کہ سودہ بنت زمعہ کو اس کے بڑھاپے کی وجہ سے طلاق دیدیں اور جب سودہ کو آپ کے اس ارادے کا علم ہوا تو اس نے کہا کہ آپ مجھے طلاق نہ دیں، میں اپنی باری عائشہؓ کے حوالے کرتی ہوں۔ اس شرط کی وجہ سے پیغمبر اکرمؐ نے اسے طلاق نہیں دی۔ (البدایہ والنہایہ ابن کثیر، ج۷، ص۱۴۴)

بخاری لکھتے ہیں کہ پیغمبر خداؐ نے اپنی ازواج سے فرمایا: تم مجھے عائشہؓ کے متعلق اذیت نہ دو۔ خدا کی قسم! عائشہؓ کے بستر کے علاوہ مجھے آج تک تم میں سے کسی کے بستر پر وحی نازل نہیں ہوئی۔ (صحیح بخاری، باب فضائل عائشۃ، ج۵، ص۳۷۔ فتح الباری، ج۷، ص۸۶)

اس طرح کی روایات پڑھ کر میں سخت متنفر ہوا اور آخر میں متنفر کیوں نہ ہوتا کیونکہ اللہ تعالی نے اپنے حبیب کے کردار کے متعلق یہ گواہی دی ہے: وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ اور یقیناً آپ عظیم اخلاق کے مالک ہیں۔ (سورۂ ن والقلم: آیت۴) اللہ تعالی نے آپ کے کردار کو عظیم قرار دیا ہے اور یہ آیت اس قسم کی روایات کی تردید کے لئے کافی ہے۔

جن لوگوں نے اس قسم کی روایات کو تراشا ان کے پیش نظر دو مقاصد تھے: پہلا مقصد یہ تھا کہ رسول مقبولؐ کی شخصیت کو انتہائی حقیر بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور دنیا کو یہ باور کرایا جائے کہ آنحضرتؐ ایک ہوس پرست انسان تھے (نعوذ باللہ) اور ان کا دوسرا مقصد

اپنے حکام کی شہوت رانیوں پر پردہ ڈالنا تھا۔ (فقہ الھزیمۃ، باب شخصیت رسولؐ)

میں نے مذکورہ کتب حدیث کی شرحیں پڑھیں تو مجھے گمان گزرا کہ کسی بندۂ خدا نے ان روایات کی تردید کر کے عظمت رسولؐ کی پاسبانی کا فریضہ ادا کیا ہوگا لیکن مذکورہ شرحیں پڑھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ کسی بھی شارح نے عظمت رسولؐ کا تحفظ نہیں کیا اور کسی نے بھی ان واہی تباہی روایات کی تردید نہیں کی اور تردید کرنے کی بجائے شارحین نے ان روایات کو صحیح قرار دیا اور ان کی تاویل وتوجیہ کی۔

چنانچہ نووی نے پہلی روایت کے متعلق کہا: جہاں تک اس امر کا معاملہ ہے کہ آنحضرتؐ تمام ازواج سے ایک ہی شب میں مباشرت کر کے آخر میں ایک ہی غسل کرتے تھے تو اس میں اس بات کا احتمال موجود ہے کہ حضورؐ نے ہر مباشرت کے بعد وضو کیا ہو۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ رسول خداؐ ایک ہی رات میں تمام ازواج سے مباشرت کرتے تھے اور بعض کے نزدیک آپ غسل کرتے تھے۔ اس روایت کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ اس ذریعے سے آپ اپنی تمام بیویوں کو راضی کرتے تھے یا یہ بھی ممکن ہے کہ جس بیوی کی باری ہوتی تھی تو آپ اس سے باقی تمام بیویوں سے مباشرت کرنے کی رضا مندی حاصل کرتے ہوں گے۔ (صحیح مسلم، ج۱، ص۲۴۹، حدیث۳۰۹۔ شرح النووی، ج۳، ص۲۱۷۔ سنن ابی داؤد، ج۱، ص۵۶، حدیث۲۱۹)

ابن حجر نے قاضی عیاض کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ ایک ہی شب میں تمام ازواج سے مباشرت کرتے تھے کیونکہ آپ انہیں (دوسروں کی طرف مائل ہونے سے) بچانا چاہتے تھے۔ آپ کے اس عمل کی توجیہ یہ ہے کہ آپ اپنی بیویوں میں عدالت قائم کرنے کی غرض سے ایسا کیا کرتے تھے اگرچہ ایسا کرنا آپ پرواجب نہیں تھا۔ (فتح الباری، ج۹، ص۲۶۰)

ابن حجر نے قاضی عیاض کی توجیہ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ قاضی عیاض کی یہ توجیہ صحیح نہیں ہے کیونکہ رسول خداؐ کے بعد ازواج پیغمبر کسی سے نکاح نہیں کرسکتی تھیں اور ان میں سے کچھ ازواج آنحضرتؐ کے بعد پچاس سال یا اس سے کچھ کم عرصے تک زندہ رہیں۔ (فتح الباری، ج۹، ص۲۶۰)

صفیہؓ دختر حیی بن اخطب کے متعلق ابن حجر نے کہا: جب آنحضرتؐ کو معلوم ہوا کہ صفیہ یہودیوں کے ایک بادشاہ کی بیٹی ہے تو آنحضرتؐ نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے دحیہ کے ہاتھوں میں دینا مناسب نہیں ہے کیونکہ صحابہ کی جماعت میں دحیہ سے بلند مرتبہ صحابی موجود تھے مگر قیدی عورتوں میں صفیہ سے بلند درجہ کوئی عورت نہیں تھی اور اگر صفیہ کو دحیہ کے ہاتھ میں دے دیا جاتا تو بہت سے صحابہ کو دکھ ہوتا اسی لئے آپ نے مصلحت عمومی کے تقاضوں کو مدنظر رکھا اور صفیہ کو دحیہ سے واپس لے لیا اور انہیں اپنے لئے مخصوص کرلیا اور اس طرح سے آپ نے تمام افراد کی رضامندی کو حاصل کیا۔ (فتح الباری، ج ۷، ص ۳۷۹)

سوال یہ ہے کہ کیا پیغمبر اکرمؐ کو پہلے سے علم نہیں تھا کہ صفیہ ایک شہزادی ہے؟

ابن حجر نے حضرت خدیجہؓ کی تاریخ وفات اور نو برس کی عمر میں حضرت عائشہؓ سے آنحضرتؐ کے نکاح پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ علماء کا اس امر میں اختلاف ہے کہ رسول خداؐ نے حضرت خدیجہؓ کے بعد سودہ سے نکاح کیا تھا یا عائشہؓ سے۔

ماوردی کا قول ہے کہ فقہاء کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے سودہ سے قبل بی بی عائشہؓ سے نکاح کیا تھا جبکہ محدثین کہتے ہیں کہ آپ نے پہلے سودہ سے نکاح کیا تھا اس کے بعد آپ نے عائشہؓ سے نکاح کیا تھا۔ (فتح الباری، ج ۷، ص ۱۷۹)

ابن کثیر نے بڑھاپے کی وجہ سے سودہ بنت زمعہ کو طلاق دینے کے عزم کی داستان لکھی اور لکھا کہ جب سودہ نے اپنی باری عائشہؓ کے حوالے کردی تو آپ نے انہیں طلاق نہ دی اور اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ۔ ''اور اگر کوئی عورت شوہر سے حقوق ادا نہ کرنے یا اس کی کنارہ کشی سے طلاق کا خطرہ محسوس کرے تو دونوں کے لئے کوئی حرج نہیں ہے کہ کسی طرح آپس میں صلح کرلیں کیونکہ صلح میں بہتری ہے۔'' (سورۂ نساء: آیت ۱۲۸)

الغرض فقہاء نے ازواج سے پیغمبر اکرمؐ کے سلوک کی باقی روایات کی توجیہ بھی اسی طرح سے کی ہے۔ ان لوگوں نے مذکورہ احادیث کی توجیہ و تاویل کی اور وارد ہونے والے سوالات کے جواب دیئے لیکن انہیں متن حدیث پر سوالیہ نشان لگانے کی توفیق نصیب نہ ہوئی

کیونکہ اس کی وجہ ان کا یہ رویہ ہے کہ جب کسی روایت کے اسناد صحیح ہوں تو پھر وہ متن حدیث کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ (البدایہ والنہایہ، ج ۷، ص ۱۴۴)

فقہاء و محدثین نے یہ اصول وضع کر کے انسانی عقل و شعور کے لئے تمام راستوں کو بند کردیا اور عقل انسانی کو پابند سلاسل کردیا اور امت اسلامیہ کو یہ درس دیا کہ وہ آنکھ کان بند کر کے ان کی باتوں کو تسلیم کریں اور ان کے عقائد کی پیروی کریں۔ فقہاء کے وضع کردہ اصول و نظریات نے مسلمانوں کو پسماندگی میں مبتلا کیا اور ہر دور میں حکمران طبقے کو تقویت بخشی۔

حدیث کے پرکھنے کے لئے صرف اسناد کو معیار قرار دینا عقل اور اسلام سے کھلی جنگ کے مترادف ہے۔ اس مقام پر ہم یہ بھی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حدیث کے لئے جو معیار مقرر کئے گئے ہیں ان میں سے سیاست کی بو آتی ہے اور سلسلہ رواۃ کے لئے جو اصول و قواعد بنائے گئے ہیں وہ بھی غیر منطقی اور غیر حتمی ہیں۔ ان اصولوں کی وجہ سے حدیث کو قبول یا رد کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

ہمارے فقہاء نے مذکورہ احادیث اور ان کے علاوہ رسول خداؐ کی عائلی زندگی سے مربوط دوسری روایات کے لئے حضور اکرمؐ کی عصمت کو بھی مدنظر نہیں رکھا۔ فقہاء بظاہر نبی اکرمؐ کو معصوم ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن وہ آنحضرتؐ کو ہر جہت سے معصوم نہیں مانتے۔ وہ حضور اکرمؐ کی عصمت کو تبلیغ اسلام کے دائرے تک محدود رکھتے ہیں اس کے علاوہ آنحضرتؐ کی ذاتی اور عائلی زندگی میں آپ کو معصوم تصور نہیں کرتے۔ اسی لئے اگر ان کی کتب سیرت و حدیث میں ازواج کے ساتھ آنحضرتؐ کی ناانصافیوں کی روایات مل جائیں تو انہیں ان روایات کی کوئی پروا نہیں ہوتی اور وہ یہ کہہ کر آزاد ہو جاتے ہیں کہ آنحضرتؐ کا یہ کردار ان کی شخصی اور ذاتی زندگی سے مربوط ہے اور اس کا آنحضرتؐ کے جنبۂ نبوت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس سے آپ کے جنبۂ نبوت پر کوئی منفی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ (فقه الهزیمة، باب شخصیت رسولؐ)

علم حدیث
متن اور سند کے درمیان

جس نکتے نے مجھے چونکا دیا وہ یہ تھا کہ علمائے حدیث کا اتفاق ہے کہ متن حدیث کو ہرگز نہ چھیڑا جائے اور حدیث کی تحقیق صرف سند تک ہی محدود رہنی چاہئے۔ چنانچہ اسی قاعدے کے تحت عقل انسانی اور کلام ربانی سے متصادم رسول خداؐ کی طرف منسوب احادیث کو علماء نے ''حدیث'' کے عنوان سے تسلیم کیا۔ علماء کے ترغیب دینے پر امت اسلامیہ نے بھی ایسی احادیث کو صرف ان کے اسناد کی صحت کی وجہ سے قبول کیا اور سو فیصد درست سمجھا۔

علماء کی اس روش سے میرے ذہن میں یہ شک پیدا ہوا کہ علماء متن حدیث کو نظر انداز کر کے اپنی بحث کو صرف اسناد تک ہی کیوں محدود رکھتے ہیں اور جب میں نے اس امر کی تحقیق کی تو مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا اور وہ یہ تھا کہ علماء سند کی تحقیق بھی اپنے ان خود ساختہ اصولوں سے کرتے ہیں جن میں سیاست پوری طرح ملوث ہے۔

حجاج بن مسلم، ابن سیرین سے نقل کرتے ہیں: ابتداء میں اہل حدیث اسناد کے متعلق سوال نہیں کرتے تھے لیکن جب شورشیں اٹھیں تو انہوں نے حدیث بیان کرنے والوں سے راویوں کے نام پوچھے۔ اگر راوی کا تعلق اہل بدعت سے ہوتا تو اس کی حدیث کو رد کر دیتے تھے۔ (صحیح مسلم، مقدمہ ج۱، ص۱۵)

عبداللہ بن مبارک سے منقول ہے کہ اس نے کہا: اسناد دین کا حصہ ہیں اگر اسناد نہ ہوتے تو لوگ جو چاہتے بیان کرنے لگ جاتے۔ علمائے حدیث بیان کرتے ہیں کہ نیک لوگوں کو

روایت حدیث میں ہم نے بہت زیادہ جھوٹا پایا۔ (صحیح مسلم، ص۱۵ تا ۱۷)

حجاج بن مسلم نے سفیان سے نقل کرتے ہوئے کہا: لوگ جابر بن یزید جعفی سے حدیث نقل کرتے تھے یہاں تک کہ اس نے اپنے اندرونی عقیدے کا اظہار کیا۔ اس کے بعد لوگوں نے اسے حدیث میں متہم جانا اور بعض افراد نے اس سے حدیث لینی چھوڑ دی۔ پوچھا گیا کہ اس نے کس چیز کا اظہار کیا تھا تو کہا گیا کہ اس نے رجعت پر ایمان کا اظہار کیا تھا۔ (صحیح مسلم، ج۱، ص۲۰)[1]

رتبہ سے منقول ہے کہ ابوجعفر ہاشمی مدنی اچھی باتیں خود بنا کر رسول خداؐ کی طرف منسوب کر کے بیان کیا کرتا تھا۔ (صحیح مسلم، ج۱، ص۲۲)

یونس بن عبید سے منقول ہے کہ عمرو بن عبید روایت حدیث میں جھوٹ بولتا تھا۔ (صحیح مسلم، ج۱، ص۲۲)

ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ بہت سے ناصبی افراد سچ بولنے اور احکام دین کی پابندی میں مشہور تھے لیکن رافضی کہلانے والے افراد میں اکثریت جھوٹے افراد کی تھی اور وہ حدیث کے متعلق کوئی پروا نہیں کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب)

ابن المدینی کا قول ہے کہ میں نے یحییٰ بن سعید قطان سے جعفر صادقؑ کے بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا: میرا دل اس سے کراہت محسوس کرتا ہے اور میری نظر میں مجالد اُن سے بہتر ہے۔ (تہذیب التہذیب، ج۲، ص۱۰۳)

امام جعفر صادقؑ پر ان لوگوں نے دروغ گوئی اور اپنی طرف سے احادیث بنانے کا الزام لگایا اور یہ لوگ امام جعفر صادقؑ کی روایات کو قبول نہیں کرتے۔ اصل بات یہ ہے کہ شیعہ

۱۔ علمائے اہلسنت شیعوں کی تحقیر کرنے کے لئے ہمیشہ سے یہ کہتے آئے ہیں کہ شیعہ رجعت کے قائل ہیں۔ اس سے ان کا مقصد دوسرے مسلمانوں کو شیعہ دشمنی پر مائل کرنا ہے۔ مسلم نے سفیان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''روافض کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؑ بادلوں میں رہتے ہیں اور ایک دن واپس تشریف لائیں گے اور بادلوں کے اوپر سے ہی وہ شیعوں کی رہبری کرتے ہیں اور ان کے نام اپنے احکام جاری کرتے ہیں۔'' یہ سچ ہے کہ شیعوں کا (امامیہ) فرقہ رجعت کا قائل ہے لیکن جس عقیدے کی نسبت سفیان نے ان کی طرف دی ہے ایسا ہرگز نہیں۔ یہاں اس مسئلہ پر بحث کی گنجائش نہیں

امام جعفر صادقؑ کے ساتھ تھے اور حکومت ان سے ناخوش تھی اسی لئے علمائے حدیث نے ان کی احادیث سے گریز کیا اور بخاری نے امام جعفر صادقؑ سے ایک روایت بھی نقل نہیں کی۔[1]

عمرو بن عبید کی روایات کو بھی اسی لئے رد کر دیا گیا کہ وہ معتزلی نظریات رکھتا تھا۔ (تہذیب التہذیب ابن حجر، ج ۸، ص ۷۰ تا ۷۴۔ میزان الاعتدال ذہبی، ج ۳، ص ۲۷۳)

ابن حجر نے ناصبیوں (دشمنان آل محمدؐ) کو صادق القول کہہ کر ان کی پاک دامنی کی گواہی دی ہے اور آل محمدؐ کے پیروکاروں کو نقل حدیث میں جھوٹا اور غیر محتاط قرار دیا ہے۔ (تہذیب التہذیب، ج ۲، ص ۱۰۳)

ابن قطان کو امام جعفر صادقؑ کی صداقت پر اعتماد نہیں ہے اور وہ ان کی احادیث قبول کرنے پر آمادہ دکھائی نہیں دیتا جبکہ وہ مجالد کی احادیث قبول کرنے پر آمادہ ہے جس کے متعلق محدثین کا فیصلہ ہے کہ وہ دروغ گوئی میں مشہور تھا۔[2]

ابوبکر بن عیاش سے پوچھا گیا کہ تم نے امام جعفر صادقؑ سے ملاقات کی مگر ان کی

۱۔ امام بخاری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے احادیث کی تلاش کے لئے مشرق و مغرب کا سفر کیا تھا۔ بعض اوقات تو وہ ایک ایک حدیث کے لئے سیکڑوں میل کا سفر طے کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ طویل سفر کر کے مذکورہ راوی کے پاس گئے تو انہوں نے دیکھا کہ اس راوی نے اپنے جانور سے دھوکا کیا۔ یہ دیکھ کر امام صاحب اس سے روایت حاصل کئے بغیر واپس چلے آئے۔

ہمیں بخاری اور ان کے ثناخوانوں پر تعجب ہے کہ انہوں نے ایسے افراد کو تو بہت تلاش کیا جن کے اور رسول خداؐ کے درمیان بہت سے سلسلوں کا فاصلہ تھا مگر انہوں نے امام جعفر صادقؑ سے مدینے میں رہ کر ایک بھی حدیث نقل نہیں کی تھی جبکہ امام جعفر صادقؑ اور رسول خداؐ کے درمیان صرف چار سلسلوں (امام محمد باقر، امام علی زین العابدین، امام حسین اور امام علی علیہم السلام) کا فاصلہ تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ اپنے دور کے ممتاز ترین فرد تھے اور ان کا سلسلۂ روایت بھی باقی تمام سلسلوں سے بلند و بالا تھا مگر اس کے باوجود بخاری نے ان سے کوئی روایت لینے کو پسند نہیں کیا۔

سوال یہ ہے کہ بخاری جو کہ حدیث کو اس قدر باریک بینی سے دیکھتے تھے اور جو اپنے آپ کو اس قدر پارسا کہلاتے تھے آخر اس نکتہ شناس اور پارسا شخص نے ائمہ اہلبیتؑ سے احادیث نقل کرنے میں بخل کا مظاہرہ کیوں کیا تھا؟ (اور کیا بخاری کے رویے کو سیاست کے تقاضوں اور اس کی ناصبیت پر محمول نہ کیا جائے گا؟)

۲۔ تہذیب التہذیب: بخاری، یحییٰ بن معین اور ابن حنبل نے اسے ضعیف کہا ہے۔

احادیث کو نقل نہیں کیا تو اس نے کہا کہ میں نے جعفر صادقؑ سے پوچھا تھا کہ کیا آپ نے یہ احادیث خود اپنے کانوں سے سنی ہیں تو انہوں نے جواب میں کہا تھا: "نہیں! ہم اپنے آباؤ اجداد سے ان کی روایت کرتے ہیں۔" (اسی لئے میں نے ان سے حدیث نہیں لی)۔ (تہذیب التہذیب، ج ۲، ص ۱۰۳)

کتنے تعجب کی بات ہے کہ جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب جن کا لقب ہی صادق تھا اور جن کے اور پیغمبر اکرمؐ کے درمیان صرف چار معصوم اور صادق سلسلوں کا فاصلہ تھا، ان کی روایات کو تو محدثین نے قبول نہیں کیا اور اس کی بجائے مجالد کی روایات کو قبول کیا جو کہ خود جھوٹا اور غیر محتاط تھا اور جن افراد سے روایت کرتا تھا وہ بھی کوئی معصوم شخصیات نہیں تھیں۔ کیا دین اور عقل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں؟ فی الحال ہم اس بحث کو یہیں ختم کرتے ہیں اور ایک دوسرے پہلو کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

محدثین نے راوی کے لئے دو شرائط کو لازمی قرار دیا۔ جس راوی میں یہ دونوں شرائط موجود ہوں اسی راوی کی روایت ہر صورت میں تسلیم کی جاتی ہے اور وہ دو شرائط یہ ہیں:
(۱) عدالت (۲) دقت۔

عدالت سے مراد یہ ہے کہ راوی مسلمان، عاقل اور بالغ ہو اور ایسے امور سے دور ہو جو کسی بھی انسان کی مروت اور جوانمردی کو داغدار بناتے ہوں اور دقت سے مراد یہ ہے کہ راوی نے محدثین کے وضع کردہ اصول و قواعد کے مطابق حدیث کو سنا ہو اور اس نے مذکورہ اصولوں کی مکمل پاسداری کی ہو اور روایت حدیث کے وقت تک اس کا حافظہ بھی صحیح ہو۔[1]

محدثین کے مذکورہ دو اصولوں عدالت اور دقت کو مدنظر رکھا جائے تو انہیں بہت سی احادیث سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور مذکورہ اصول صرف کتابوں تک ہی محدود ہیں۔ محدثین نے ان اصولوں کی کبھی پیروی نہیں کی اور اگر اپنے ہی وضع کردہ ان اصولوں کی پیروی کرتے تو بہت سے رواۃ حدیث کو چھوڑنا پڑتا اور ان کا چھوڑنا ان کے لئے آسان نہیں تھا کیونکہ ان کے چھوڑنے سے مذہب اہلسنت کی بنیادیں ہی منہدم ہونے کا اندیشہ تھا۔

۱۔ کتب حدیث و رجال کی طرف رجوع فرمائیں۔ اکثر راوی آپ کو بدکار اور فاسق دکھائی دیں گے۔

ذیل میں ہم بطور نمونہ چند رواۃ حدیث کے متعلق کچھ بحث کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہم اپنے قارئین کو یہ بتائیں گے کہ اس طرح کے ضعیف رواۃ سے کن کن محدثین نے استنادہ کیا ہے اور اپنے ہی وضع کردہ قوانین سے کتنا تجاوز کیا ہے:

۱۔ **اسمٰعیل بن عبداللہ (ابو اویس) بن عبداللہ اصبحی (ابو عبداللہ مدنی):**

ابن معین نے اس کے متعلق کہا ہے کہ وہ دو کوڑی جتنی بھی قدر و قیمت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اور اس کا باپ دونوں حدیث کے چور تھے۔ وہ جھوٹا اور بے شخصیت فرد ہے مگر اس کے باوجود بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے اس سے حدیث لی ہے۔

۲۔ **بسر بن ارطاہ:**

ابن معین نے کہا ہے کہ وہ بہت برا شخص تھا۔ بسر، معاویہ کا بہی خواہ تھا اور اس نے معاویہ کے حکم سے حجاز و یمن میں شیعوں کا قتل عام کیا تھا۔ حضرت علیؑ نے اسے بددعا دی تھی مگر اس کے باوجود ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے اس سے روایت کی ہے۔

۳۔ **ثور بن یزید بن زیاد کلاعی حمصی:**

امام احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ امام مالک اس کے ساتھ نشست و برخاست سے منع کرتے تھے اور اوزاعی نے اس کی بدگوئی کی ہے۔ اس کی حضرت علیؑ سے دشمنی کی وجہ یہ تھی کہ حضرت علیؑ نے جنگ صفین میں اس کے باپ کو قتل کیا تھا مگر اس کے باوجود بخاری اور دیگر محدثین نے اس کی روایات نقل کی ہیں۔

۴۔ **جراح بن ملیح (وکیع کے والد اور شافعی کے استاد)**

ابن حبان نے کہا ہے کہ وہ اسناد کو الٹ پلٹ کرتا تھا اور مرسل روایات کو مرفوع سمجھتا تھا۔ ابن معین نے کہا ہے کہ وہ دروغ گو تھا اور اپنی طرف سے احادیث بنایا کرتا تھا مگر اس کے باوجود مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے اس سے روایات نقل کی ہیں۔

۵۔ **حبیب بن ابی حبیب یزید جرمی انماطی:**

ابن معین نے اس کی روایات لکھنے سے منع کیا ہے مگر اس کے باوجود مسلم، ابن ماجہ اور نسائی نے اس سے احادیث نقل کی ہیں۔

۶۔ **حریز بن عثمان رحبی حمصی:**

یہ شخص امیرالمومنینؑ پر سب و شتم کیا کرتا تھا اور آنحضرتؐ پر جھوٹ تراشا کرتا تھا مگر بخاری اور دیگر محدثین نے اس سے روایات نقل کی ہیں۔

۷۔ **خالد بن سلمۃ العاص مخزومی معروف بہ ضاء ضاء:**

جوزی کا قول ہے کہ وہ فرقۂ مرجئہ سے تعلق رکھتا تھا اور حضرت علی کا دشمن تھا اور پسر مروان کے اشعار پڑھا کرتا تھا۔

۸۔ **زیاد بن عبداللہ بن طفیل بکائی عامری:**

ابن مدینی کے مطابق وہ "ضعیف" ہے۔ ابن معین نے کہا کہ اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے مگر بخاری، مسلم اور دوسرے محدثین نے اس سے روایت کی ہے۔

۹۔ **سالم بن عجلان افطس اموی:**

ابن حبان نے کہا ہے کہ وہ روایات کو الٹ پلٹ کیا کرتا تھا اور وہ برے کام میں متہم تھا جس کی وجہ سے قتل ہوا۔ عدی نے کہا ہے کہ وہ عقیدہ مرجئہ کی دعوت دیتا تھا اور ان کی حمایت کرتا تھا۔ نووی نے کہا ہے کہ وہ فرقۂ مرجئہ سے تعلق رکھتا تھا اور معاند تھا مگر بخاری، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے اس سے روایت نقل کی ہے۔

۱۰۔ **طارق بن عمرو مکی قاضی (عثمان بن عفانؓ کا غلام):**

عبدالملک بن مروان کی طرف سے مدینہ کا والی تھا اور وہ ایک ظالم والی تھا مگر مسلم اور ابوداؤد نے اس سے روایت کی ہے۔

۱۱۔ **عمرو بن سعید بن العاص اموی (اشدق):**

معاویہ اور یزید کی طرف سے مدینہ کا والی تھا۔ اس نے عبدالملک بن مروان کے خلاف خروج کیا اور قتل ہوا۔ وہ انتہائی ظالم اور سفاک قسم کا حاکم تھا مگر مسلم، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی نے اس سے روایت نقل کی ہے۔

۱۲۔ **عمران بن خطان دوسی:**

دارقطنی نے کہا ہے کہ اس کی احادیث متروک ہیں کیونکہ وہ بدعقیدہ تھا اور خبیث

مذہب کا پیروکار تھا۔ یہ خوارج کا شاعر تھا اور اس نے حضرت علیؑ کے قاتل عبدالرحمٰن بن ملجم کی تعریف میں قصیدہ لکھا تھا مگر بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے اس سے روایت کی ہے۔

۱۳۔ **مجالد بن سعید ھمدانی کوفی:**

امام احمد بن حنبل نے اس کے متعلق کہا ہے کہ اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا مگر مسلم اور دیگر محدثین نے اس سے روایت کی ہے۔ واضح رہے کہ یہ وہی مجالد ہے جس کے متعلق ابن قطان نے کہا تھا کہ مجالد میری نظر میں جعفر صادقؑ سے بہتر ہے۔

اگر ہم تمام رواۃ کے متعلق لکھنا چاہیں تو کتاب کا حجم کئی گنا بڑھ جائے گا۔ بہرنوع مذکورہ بالا رواۃ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قابل بھروسا افراد نہیں تھے لیکن اس کے باوجود کتب حدیث ان کی روایات سے بھری ہوئی ہیں۔[۱]

اس بحث سے ہمارا مقصد صرف یہی بتانا ہے کہ محدثین نے غیر عادل افراد کو عادل بنا کر انہیں قابل بھروسا بنانے کی سعی مذموم کی ہے۔ اگر محدثین اپنے خود ساختہ قواعد کی پابندی کرتے اور متن حدیث کی بجائے اپنے آپ کو صرف سند حدیث تک ہی محدود رکھتے تو آج ہمیں بہت سی روایات صحاح میں دکھائی نہ دیتیں اور اگر سند ہی معتبر ہے تو کتب صحاح میں بہت سی غلط روایات موجود ہیں۔

ہمارے محدثین نے متن حدیث پر تنقید و جرح سے لوگوں کو اس لئے منع کیا تھا کہ مسلمانوں کو روایات میں شک کرنے سے محفوظ رکھا جائے مگر انہوں نے غلط اسناد پر انحصار کر کے مسلمانوں کو اور زیادہ شک و تردد میں مبتلا کر دیا۔

خدارا ذرا سوچیے کہ مقتدر طبقے کے جن ظالم حکام نے مسلمانوں کو قتل کیا ہو، ان کے ناموس کو خاک میں ملایا ہو اور اپنے خلفاء اور سلاطین کی کرسی کے لئے نسل انسان اور کھیتوں کو

۱۔ ہدی الساری، مقدمہ فتح الباری در شرح صحیح بخاری کی طرف رجوع فرمائیں۔ جہاں بخاری کی بہت سی روایات پر تنقید کی گئی ہے مگر ابن حجر نے توجیہ و تاویل کی منطق سے ان کا دفاع کیا ہے۔

برباد کیا ہو کیا ایسے سفاک حکام کو حدیث رسول کا راوی سمجھا جاسکتا ہے؟

کتنے افسوس کی بات ہے کہ بخاری نے بسر بن ارطاۃ اور فوج یزید کے سالار عمر بن سعد بن ابی وقاص سے روایات نقل کی ہیں جبکہ تمام لوگ جانتے ہیں کہ ابن سعد نے کربلا میں فرزند رسول امام حسینؑ اور ان کے خاندان سے جنگ کی تھی اور بڑی بے دردی سے انہیں شہید کیا تھا۔ (کیا عادل راوی ایسے ہی ہوتے ہیں؟) اور کیا محدثین کے پاس بسر بن ارطاۃ اور عمر بن سعد کے شرمناک مظالم کی بھی کوئی توجیہ موجود ہے اور کیا ان کی توجیہ سے یہ لوگ بے گناہ ثابت ہو جائیں گے؟ اور کیا کسی راوی کے عادل ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ وہ امانت و راست گوئی میں مشہور تھا اور اس کے ساتھ اس نے بے تحاشا مظالم ڈھائے ہوں یا مسلمانوں کو قتل کرنے والا کوئی پلید خارجی صرف امانت و راست گوئی کی وجہ سے عادل کہلا سکتا ہے؟ جس شخص نے اپنی تلوار سے مسلمانوں کا قتل عام کیا ہو اور برائی اور بے حیائی کے کام کئے ہوں تو ایسے شخص کو امین اور صادق کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ زہری جو کہ ظالم حکام کا خصوصی مصاحب تھا اور اس جیسے دیگر افراد کو کس طرح صادق و امین مانا جاسکتا ہے؟

اسی طرح سے خوارج کو گروہ صادقین کے افراد کیونکر سمجھا جاسکتا ہے جبکہ رسول خداؐ نے ان کی مذمت کی تھی اور انہیں دوزخ کے کتے کہا تھا اور محدثین کے ہاں ایسی احادیث صحیحہ بھی موجود ہیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ نے ان کے قتل کا حکم دیا تھا تو کیا واجب القتل دوزخی کتے صادق اور امین کہلانے کے قابل ہیں؟

ان تمام سوالات کا ایک ہی جواب ہے کہ یہ سب کچھ سیاست کے تقاضوں کا کیا دھرا ہے کیونکہ اگر محدثین یہ روش اختیار نہ کرتے تو آج اہلسنت کہلانے والوں کا کہیں نام و نشان تک نہ ہوتا۔

اموی اور عباسی سیاست کے تقاضوں کے تحت ان لوگوں کو ظالم و کاذب و قاتل ہونے کے باوجود سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ اگر مذکورہ افراد کی فکری مدد حکام کے شامل حال نہ ہوتی تو وہ تلوار اٹھا کر اپنے مخالفین کو ذرا دھمکا نہیں سکتے تھے اور اگر سیاست ملوث نہ ہوتی تو کسی کو رسول خداؐ پر جھوٹ باندھنے کی احتیاج محسوس نہ ہوتی۔ جھوٹی احادیث حکام کو تحفظ دینے کی

غرض سے بنائی گئیں اور یہی جھوٹی احادیث ان کے لئے پناہ گاہ ثابت ہوئیں۔

برسراقتدار طبقہ اگر متن حدیث کو زیر بحث لانے کی اجازت دے دیتا تو ان کے سیاسی حریفوں پر ارتداد کا فتویٰ صادر نہیں کیا جاسکتا تھا اور امیر کی غیر مشروط اطاعت کی احادیث وجود میں نہیں لائی جاسکتی تھیں۔ اگر متن حدیث پر بحث کی اجازت ہوتی تو امت کو یہ حدیث کبھی نہ سنی پڑتی: ''تجھے آنکھ اور کان بند کر کے امیر کی اطاعت کرنی چاہئے اگرچہ وہ تیری پشت پر کوڑے برسائے یا تیرا مال چھین لے ایسی حالت میں بھی تجھے اس کا فرمان سننا چاہئے اور اس کی اطاعت کرنی چاہئے۔'' (صحیح مسلم، كتاب الامارة، باب وجوب طاعة الامراء، ج ۳، ص ۱۴۶۵۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، ج ۹، ص ۷۷)

اگر سیاست کے تقاضے نہ ہوتے تو آج یہ طرفہ حدیث بھی ہمارے کانوں تک نہ پہنچتی: ''جو میری اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور جو میری نافرمانی کرتا ہے تو وہ اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔'' (صحیح مسلم، ج ۳، ص ۱۳۶۶، حدیث ۱۸۳۵)

اسی طرح کی ایک اور حدیث ملاحظہ فرمائیں: ''سربراہ ڈھال ہوتا ہے، لڑنے والے اس ڈھال کے پیچھے لڑتے ہیں اور اس کی پناہ میں آتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی سربراہ عدالت سے کام لے تو اسے ایک اجر دیا جائے گا اور اگر اس نے عدل کے علاوہ کسی اور چیز کا حکم دیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔'' (صحیح مسلم، ج ۳، ص ۱۴۷۱، حدیث ۱۸۴۱)

اسی مفہوم کی ایک حدیث کچھ اس طرح سے وارد ہے: ''میرے بعد بہت سے خلفاء ہوں گے۔ صحابہ نے کہا: آپ ہمیں ان کے متعلق کیا حکم دیتے ہیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: تمہیں خلفاء میں سے ایک کے بعد دوسرے کی بیعت کرنی چاہئے اور ہر قیمت پر ان کا حق ادا کرنا چاہئے اور رعیت کے ساتھ سلوک کے متعلق قیامت کے دن ان سے خود خدا سوال کرے گا۔'' (یعنی تمہیں اپنی حق تلفی کے لئے احتجاج کا کوئی حق حاصل نہیں ہے)۔ (صحیح مسلم، ج ۳، ص ۱۴۷۱، حدیث ۱۸۴۲)

اور ایسی ہی ایک اور حدیث میں کہا گیا ہے: ''(امراء کا فرمان) سنو اور اطاعت کرو

کیونکہ ان کے اعمال کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ہے اور تمہارے اعمال کی ذمہ داری تمہارے اپنے کندھوں پر ہے۔'' (صحیح مسلم، ج ۳، ص ۱۴۷۴، حدیث ۱۸۴۶)

ایک اور حدیث میں یہ تعلیم دی گئی ہے: ''اگر کوئی شخص اپنے حاکم سے ایسی چیز دیکھے جس سے کراہت کرتا ہو تو اسے صبر کرنا چاہئے کیونکہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھی دوری اختیار کرے اور اسی حالت میں مر جائے تو اس کی موت، جاہلیت کی موت ہے۔'' (صحیح مسلم، ج ۳، ص ۱۴۷۷، حدیث ۱۸۴۹)

ایک اور حدیث میں بیان کیا گیا ہے: ''اگر کوئی شخص تمہارے پاس آئے اور تم نے کسی شخص کو حکومت کے لئے منتخب کرلیا ہو اور آنے والا تمہیں اس سے متفرق کرنا چاہے تو تم اس کو قتل کردو۔'' (صحیح مسلم، ج ۳، ص ۱۴۸۰، حدیث ۱۸۵۲)

اسی طرح کی ایک اور حدیث میں یہ کہا گیا ہے: ''اگر دو اشخاص کے لئے بعنوان خلیفہ بیعت لی گئی ہو تو دوسرے کو قتل کردو۔'' (صحیح مسلم، ج ۳، ص ۱۴۸۰، حدیث ۱۸۵۳)

ایک اور حدیث میں یہ الفاظ وارد ہیں: ''لوگ عنقریب تم پر حکومت کریں گے، ان کے افعال میں سے تم کچھ افعال کو بہتر اور کچھ افعال کو بُرا سمجھو گے۔ جس نے افعال کو بہتر سمجھا اس نے نجات حاصل کی اور جس نے بُرا سمجھا وہ سالم رہا لیکن کچھ لوگ قبول کریں گے اور پیروی کریں گے۔ صحابہ نے کہا: کیا ہم ان لوگوں سے جنگ کریں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں! جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں۔'' (صحیح مسلم، ج ۳، ص ۱۴۸۰، حدیث ۱۸۵۴)

ایک اور حدیث میں ہے: ''تم پر ایسے حکمران مسلط ہوں گے جن سے تم دشمنی رکھو گے اور وہ تم سے دشمنی رکھیں گے اور تم ان پر لعنت کرو گے اور وہ تم پر لعنت کریں گے۔ کہا گیا: یارسول اللہؐ! کیا ہم تلوار اٹھا کر ان سے جنگ کریں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں! جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کریں اور اگر تم اپنے فرمانرواؤں اور حکام سے ایسی چیز دیکھو جو تمہیں پسند نہ ہو تو اس عمل کو ناپسند کرو لیکن ان کی اطاعت سے ہاتھ ہرگز نہ اٹھاؤ۔'' (صحیح مسلم، ج ۳، ص ۱۴۸۱، حدیث ۱۸۵۵)

قارئین کرام! ان احادیث کو ہمارے فقہاء صحیح مانتے ہیں اور انہیں مبارک تسلیم کرتے

ہیں جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ روایات رسول خداؐ کی احادیث ہی نہیں ہیں۔

بنی امیہ اور بنی عباس کے جابر و ظالم اور سفاک حکمرانوں نے رقم دے کر اس طرح کی احادیث تخلیق کرائیں اور پھر اپنے گماشتوں کے ذریعے سے ان کی خوب نشر و اشاعت کی کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ اپنے عوام پر وہ جتنے بھی مظالم ڈھاتے رہیں کوئی ان سے بازپرس کرنے والا نہ ہو اور کوئی ان کے خلاف زبان سے بھی احتجاج نہ کر سکے اور ان احادیث کی وجہ سے ان کے تمام مظالم پر پردہ پڑا رہے اور وہ بدستور واجب الاطاعت کہلاتے رہیں۔ (عقائد السنة و عقائد الشیعة)

ان خودساختہ احادیث کی وجہ سے امت کے دلوں سے جوش و جذبہ اور حرارت ایمانی رخصت ہوگئی اور ان احادیث نے اسے بھیڑوں کے ریوڑ کی شکل دیدی جو اپنے گڈریے کے پیچھے چلنے پر مجبور ہو۔ ان احادیث نے ایک تیز تلوار کی طرح مسلمانوں کی گردنوں کو قطع کر دیا اور لوگوں سے حق گوئی و بے باکی کی صفت سلب کرلی۔

حکمرانوں نے جہاں ان احادیث کی تخلیق کرائی وہاں ذہنی طور پر پسماندہ اور شکست خوردہ فقہاء نے ایسی وحشتناک احادیث کی تائید و تصدیق کی۔ حکام اور فقہاء کی ملی بھگت کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت اسلامیہ روح حریت سے خالی ہوگئی اور کسی میں ان نظریات کی مخالفت کی ہمت نہ رہی اور جب حکام نے جھوٹی احادیث کے ذریعے سے عوام کو اپنے جال میں اچھی طرح جکڑ لیا تو اس کے بعد انہوں نے اپنے مخالفین کو قتل کرنے کے لئے ایک اور حدیث تخلیق کرائی کہ رسول خداؐ نے فرمایا: ''جو دین میں تبدیلی کرے اسے قتل کردو۔'' (صحیح بخاری، ج۹، ص۱۹)

اس حدیث سے حکمرانوں نے اپنی سیاسی دہشت گردی کو سند جواز فراہم کی اور اپنے سیاسی اور نظریاتی مخالفین کو قتل کرنے کے لئے ایک قانونی سہارا حاصل کیا جس کی وجہ سے اختلاف رائے رکھنے والے افراد پر الحاد و ارتداد کا الزام لگا کر انہیں قتل کیا گیا اور یہ سب کچھ اسلام اور حدیث کی چھتری تلے انجام پاتا رہا۔ (شهداء الرأی فی التاریخ الاسلامی اور السیف والسیاسة ص۱۹۱)

احادیث پیغمبر کو کئی ادوار سے گزرنا پڑا اور خلیفہ اول و ثانی کے دور حکومت میں تدوین

حدیث ممنوع تھی اور جن لوگوں کے پاس احادیث لکھی ہوئی شکل میں موجود تھیں ان سب سے حدیث کے صحیفے لے کر نذر آتش کر دیئے گئے اور احادیث نقل کرنے کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے ابوہریرہ کی خوب سرزنش کی تھی اور یہ سرزنش صرف زبان تک محدود نہ تھی بلکہ اس کی پشت پر کوڑے برسائے تھے۔

اور بنی امیہ کے دور حکومت بالخصوص دور معاویہ میں حکمران گروہ کو اپنی حکومت کو سند جواز فراہم کرنے کے لئے حدیث کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی اور اس کے لئے رسول خداؐ کے چند مخصوص اصحاب کی خدمات حاصل کی گئیں جن میں سرفہرست نام ابوہریرہ کا ہے اور مذکورہ اصحاب نے حکومتی اشارہ پا کر احادیث بیان کیں اور شائقین حدیث نے انہیں نقل کیا۔

دور معاویہ سے لے کر دور عمر بن عبدالعزیز تک حکومت نے ایسی احادیث کی سرپرستی کی جو حضرت علیؑ کے نظریات کی مخالفت پر مبنی تھیں اور ان احادیث کا ہدف یہ تھا:

۱۔ خلفائے ثلاثہ کی شخصیت کو بڑھانا اور بنی امیہ کی حکومت کو سند جواز فراہم کرنا۔
۲۔ حضرت علیؑ کی ذات اور ان کی خدمات کو مشکوک بنانا۔
۳۔ جن صحابہ نے حضرت علیؑ کا ساتھ دیا تھا ان کی کردار کشی کرنا۔

نقل حدیث کے لئے ام المومنین عائشہؓ، ابوہریرہ، عمرو بن العاص اور عبداللہ بن عمر جیسے بنی امیہ نواز افراد کا انتخاب کیا گیا۔ جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ بنے تو انہوں نے تدوین حدیث کا حکم دیا۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ تدوین حدیث کا فرمان بنی عباس کے اوائل خلافت میں جاری ہوا تھا۔

ہم اس امر پر بحث کرنا نہیں چاہتے کہ تدوین حدیث کس دور میں شروع ہوئی ہم تو صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ تدوین حدیث کے وقت دو نکات پر خصوصی توجہ دی گئی:

۱۔ احادیث کی نشر و اشاعت بنی امیہ کی زیر سرپرستی ہوئی تھی اور جب دور تدوین شروع ہوا تو محدثین نے مذکورہ احادیث کو اپنی کتابوں میں لکھا اور انہوں نے امت اسلامیہ کو یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ ان میں سے کون سی حدیثیں برسراقتدار طبقے کے مفادات کی خاطر وضع کی گئی ہیں۔

۲۔ احادیث کی تدوین کے وقت اس نکتے پر خصوصی توجہ دی گئی کہ ان احادیث سے بنی امیہ کے مخالفین بالخصوص امام علی زین العابدینؑ، امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ جیسے ائمہ ہدیٰ کو کوئی فائدہ نہ پہنچنے پائے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ائمہ اہلبیتؑ کی شخصیات کو مطعون و مشکوک قرار دیا گیا جبکہ ائمہ اہلبیتؑ کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ حضرت علیؑ کے نظریات کے پیروکار تھے اور اگر محدثین ائمہ ہدیٰ کو ثقہ قرار دیتے تو انہیں یہ خطرہ تھا کہ ائمہ ہدیٰ حضرت علیؑ کے فضائل کی احادیث نشر کر کے ان کے جھوٹ کی قلعی نہ کھول دیں اور کہیں ایسی احادیث کی تردید نہ کردیں جنہیں اموی دور میں بڑی محنت سے تراشا گیا تھا۔

اگر حدیث بیان کرنے والی شخصیات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ مذکورہ شخصیات نے حکمران طبقے کی بے چوں و چراں اطاعت کی تھی۔

روایت حدیث کے لئے حسب ذیل تین افراد کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی:

۱۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ:

ام المومنین حضرت عائشہؓ کو حضرت علیؑ سے جو بغض و عناد تھا اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بی بی کا رویہ زبان زدِ عام و خاص ہے۔ بی بی نے رسول اکرمؐ کی زبانی بہت سی احادیث نقل کیں جن میں حکومت و سیاست کی روایات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

۲۔ عبداللہ بن عمر:

موصوف حضرت علیؑ کے مخالف کیمپ کے اہم فرد تھے اور انہوں نے حضرت علیؑ کی بیعت نہیں کی تھی جبکہ معاویہ ویزید اور دیگر بنی امیہ کے حکمرانوں کی بیعت کی تھی۔

۳۔ ابوہریرہ:

یہ معاویہ کے نمک خوار تھے اور ان کا شمار معاویہ کے دوستوں میں کیا جاتا تھا۔

مذکورہ بالا افراد کو روایت حدیث میں مرکزی مقام حاصل ہے اور ان کو رسول اکرمؐ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا اگرچہ ان میں سے ابوہریرہ کا عرصہ صحبت انتہائی کم تھا۔ مذکورہ

افراد آنحضرتؐ کے معاصر ضرور تھے لیکن آپ کے مقرب ہرگز نہیں تھے۔

جن لوگوں نے روایات کی جمع و تدوین کی اور راویان حدیث پر جرح و تعدیل کی ان میں زہری، مدینی، یحییٰ بن معین اور سفیان ثوری کو سرفہرست تسلیم کیا گیا۔

زہری، عبدالملک بن مروان کا ندیم خاص تھا اور اس کے بعد آنے والے خلفاء کا بھی خصوصی مصاحب تھا۔ اموی خلفاء زہری پر خصوصی نوازشیں کیا کرتے تھے اور اس کو بے تحاشا انعام و اکرام سے نوازا کرتے تھے اور اس نوازش خسروانہ کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ زہری اپنی احادیث کو عامۃ المسلمین میں خوب پھیلا سکے۔ زہری ہمیشہ رنگین دسترخوان بچھا کر اور لوگوں پر دولت لٹا کر اپنی احادیث کو لوگوں میں متعارف کراتا تھا۔[1]

حدیث کے قبول اور رد کرنے میں مدینی اور ابن معین کو فیصلہ کن شخصیت قرار دیا گیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ جس حدیث کو یہ دو افراد قبول کریں وہ سب کے لئے قابل قبول ہے اور جسے یہ رد کردیں وہ کسی کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ کتب رجال کے مطالعے سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ (تہذیب التہذیب، میزان الاعتدال)

اس مقام پر ہم یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ ابن معین اور مدینی کو رجال کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق کس نے دیا تھا؟

مروزی نے مدینی کے متعلق لکھا ہے: میں نے احمد بن حنبل کو اس کی تکذیب کرتے ہوئے سنا ہے۔

ابراہیم حربی سے پوچھا گیا کہ کیا ابن مدینی پر دروغ گوئی کا الزام عائد کیا گیا تھا تو اس نے کہا: نہیں! البتہ وہ ابن ابی داؤد کو خوش کرنے کے لئے اپنی طرف سے کچھ مطالب کا اضافہ کرتا تھا۔ (تہذیب التہذیب، میزان الاعتدال)

محدثین کی نظر میں سفیان ثوری کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ اس کے متعلق ذہبی نے کہا ہے: سفیان پر تمام محدثین کا اتفاق ہے۔ اگرچہ وہ ضعیف افراد سے نامعلوم روایات نقل کیا

۱۔ زہری کے حالات زندگی کے لئے ابن خلکان کی کتاب وفیات الاعیان، ج ۴، ص ۱۷۷، شمارہ ۵۶۳ اور دیگر کتب رجال کی طرف رجوع فرمائیں۔

کرتا تھا البتہ اس کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ مجہول احادیث نقل کرتا تھا یا وہ جھوٹے افراد کی بیان کردہ احادیث لکھا کرتا تھا۔

ابوداؤد نے اس کے متعلق کہا ہے: اگر اس کے پاس کوئی چیز آجاتی تو وہ چیخنے لگ جاتا تھا (یعنی اس کے پاس کوئی قابل قبول بات نہیں ہوتی تھی۔)

ابن معین کا قول ہے: سفیان ثوری کی مرسل روایات ہوا کی مانند ہیں۔ (تہذیب التہذیب، ج۴، ص۱۱۴ و ۱۱۵)

سفیان کی ثوری نے خود کہا تھا: جس طرح سے ہم نے حدیث کو سنا اگر ہم اسے اس طریقے سے بیان کرنا چاہیں تو ہم ایک بھی حدیث بیان نہ کرسکیں گے۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج۱، ص۲۰۵)

قارئین کرام! یہ تو اس سفیان کا حال ہے جسے امام مالک سے بھی زیادہ موثق قرار دیا جاتا ہے۔ جب ان کے موثق ترین شخص کا یہ حال ہے تو اس سے پست افراد کا حال کیا ہوگا؟ اگر محدثین، ابن مدینی اور ابن معین جیسے تمام افراد پر سوالیہ نشان لگادیں تو پھر حقیقت کہاں ہے اور اسے کہاں سے تلاش کیا جائے اور کیا یہ تمام حقائق مذکورہ افراد کو مشکوک ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں اور کیا ان حقائق کے بعد بھی ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

صحابہ

حضرت رسول اکرمؐ کی ہم نشینی کے مسئلے کا جاننا اسلام کی شناخت کے لئے ضروری ہے اور اسی طرح جدید اسلامی نظریات کی پہچان کے لئے بھی رسول اکرمؐ کی ہم نشینی کے مسئلے کا جاننا ضروری ہے اور صحابہ شناسی متن حدیث کی بجائے اسناد حدیث کی اساس کے لئے ضروری ہے۔

صحابہ شناسی کی ضرورت کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ہمارے کرم فرما تمام صحابہ کو عادل سمجھتے ہیں اور قرآن مجید کی بہت سی آیات اور رسول اکرمؐ کی بہت سی احادیث ان کی طرف منسوب کرتے ہیں اور آیات و احادیث کو ان پر منطبق کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہمارے دوستوں کا یہ عقیدہ ہے کہ صحابہ پر ہلکی سی تنقید دین میں کجی کے مترادف ہے اور صحابہ سے دشمنی دین سے ارتداد اور الحاد کے برابر ہے۔ اپنے اس مطلب کے اثبات اور مسلمانوں کو اصل حقیقت سے ہٹانے کے لئے انہوں نے صحابیت کو اپنے عقیدے کا متن بنا ڈالا۔ (عقیدۃ الواسطیہ، ابن تیمیہ، ص۲۳۶)

طحاوی اپنی کتاب ''عقیدہ'' میں لکھتے ہیں: ہم رسول خداؐ کے تمام اصحاب سے محبت کرتے ہیں اور کسی کی محبت میں افراط و تفریط نہیں کرتے، ان میں سے کسی سے بیزاری کا اعلان نہیں کرتے، جو بھی ان سے دشمنی رکھے یا ان کا برائی سے ذکر کرے تو ہم اس سے دشمنی کرتے ہیں۔ ہم صحابہ کو خیر و بھلائی کے علاوہ یاد نہیں کرتے۔ صحابہ کی محبت دین، ایمان اور احسان ہے اور صحابہ کی دشمنی کفر، نفاق اور ظلم ہے۔ (شرح عقیدہ طحاویہ، ص۴۶۸، مطبوعہ دار الفکر قاہرہ)

صدرالدین حنفی نے اس کے حاشیہ پر مذکورہ الفاظ کی توضیح کرتے ہوئے لکھا: شیخ (طحاوی) نے ان الفاظ سے روافض ونواصب کی طرف اشارہ کیا ہے اوران کی ردفرمائی ہے۔

خدا اور رسولؐ نے صحابہ کو اچھائی سے یاد کیا ہے، ان سے اپنی رضامندی کا اعلان کیا ہے، ان کے ساتھ بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور وہ شخص انتہائی گمراہ ہے جس کے دل میں خدا کے ان برگزیدہ بندوں کا بغض ہو۔ انبیائے کرامؑ کے بعد صحابہ ہی اللہ کے بلند ترین ولی ہیں۔ (**شرح عقیدہ طحاویہ**، ص ۴۶۸، مطبوعہ دارالفکر قاہرہ)

احمد بن حنبل نے کہا:

صحابہ کی غلطیوں کو بیان کرنا ناجائز ہے اور ان میں سے کسی پر تنقید کرنا یا کسی عیب و نقص کا ذکر کرنا ناجائز ہے۔ اگر کوئی ایسا کرے تو اس کی تادیب ہونی چاہئے، اگر وہ توبہ کرے تو اسے آزاد کر دینا چاہئے اور اگر توبہ نہ کرے تو اسے گرفتار کر کے زندان بھیج دیا جائے جہاں اسے کوڑے مارے جائیں اور مرتے دم تک اسے زندان میں رکھا جائے۔ ہاں اگر وہ اپنے عقیدے سے باز آجائے تو اسے رہا کر دینا چاہئے۔ (**کتاب السنۃ احمد بن حنبل و عقیدۃ اہل السنۃ احمد بن حنبل**)

تقدیس صحابہ کے نظریے پر اہلسنت کا اجماع ہے اور اس میں کسی نے آج تک اختلاف نہیں کیا۔ اس عقیدے پر چند سوال اس طرح سے وارد ہوتے ہیں:

۱۔ یہ نظریہ کسی ضابطہ پر مبنی نہیں ہے۔
۲۔ یہ نظریہ اپنے مخالفین کو ڈرانے دھمکانے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔
۳۔ صحابہ خود ایک دوسرے پر تنقید کرتے تھے اور بعض صحابہ نے تو بعض پر لعنت بھی کی۔
۴۔ یہ فیصلہ نص قرآن کے صریحاً خلاف ہے۔

مسئلہ صحابیت کو مزید واضح کرنے کے لئے ہم کتب اہلسنت سے صحابی کا مفہوم بیان کرنا چاہتے ہیں:

ابن حجر نے کہا: اس مسئلے کا صحیح ترین موقف یہ ہے کہ صحابی وہ ہے جس نے حالت ایمان میں پیغمبر اکرمؐ سے ملاقات کی ہو اور اسلام پر اس کی موت واقع ہوئی ہو۔

صحابی ہونے کے لئے حالت ایمان میں ملاقات ضروری ہے۔ ملاقات کے لئے طویل یا مختصر کی کوئی شرط نہیں ہے اور صحابی ہونے کے لئے رسول خداؐ سے روایت کرنے یا نہ

کرنے اور آنحضرتؐ کے ساتھ مل کر جنگ کرنے یا نہ کرنے کی کوئی شرط نہیں ہے۔

صحابیت کے لئے حضورؐ کو ایک بار دیکھ لینا ہی کافی ہے اور اس کے لئے آنحضرتؐ سے ہم نشینی کی بھی کوئی شرط نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص آنحضرتؐ سے ملاقات کرے لیکن کسی بیماری کی وجہ سے آنحضرتؐ کو نہ دیکھ سکے مثلاً وہ نابینا ہو تو پھر بھی وہ صحابی ہے۔ (**الاصابہ فی تمییز الصحابۃ**۔ ج ۱، ص ۷)

ابن حجر نے مزید کہا: بہت سے جنات آنحضرتؐ پر ایمان لائے تھے اور انہوں نے آپ کی زبانی قرآن مجید سنا تھا لہٰذا ایسے جنات بھی صحابی ہیں۔ (**الاصابہ**، ج ۱، ص ۷ تا ۹)

ابن حنبل، بخاری، واقدی اور دیگر محدثین و مورخین نے ابن حجر کے قول کی تائید کی ہے۔ لہٰذا صحابی کا یہی مفہوم ہے اور اسی پر سب کا اتفاق ہے اور اگر کوئی اس مفہوم سے اختلاف کرتا ہے تو وہ اہلسنت سے دور ہے۔ (**الاصابہ**، ج ۱، ص ۷ تا ۹)

ابن حجر نے کہا: اہلسنت کا اس امر پر اجماع ہے کہ تمام صحابی عادل ہیں اور چند نادر اور بدعتی افراد کے علاوہ اس نظریہ کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔

ابن حجر نے کچھ علماء کا یہ قول نقل کیا ہے: اصحاب رسول کی عدالت ثابت اور قطعی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عادل قرار دیا اور ان کی پاکی اور برگزیدہ ہونے کا قرآن مجید میں تذکرہ فرمایا جن میں سے چند آیات یہ ہیں:

۱۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ○ تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۱۰)

۲۔ **وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○** اور مہاجرین و انصار میں سے سبقت کرنے والے اور جن لوگوں نے نیکی میں ان کا اتباع کیا ہے ان سب سے خدا راضی ہوگیا ہے اور یہ سب خدا سے راضی ہیں اور خدا نے ان کے لئے وہ باغات مہیا کئے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور یہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ (سورۂ توبہ: آیت ۱۰۰)

۳۔ لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْیُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ..... یقیناً خدا صاحبان ایمان سے اس وقت راضی ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے۔(سورۂ فتح: آیت ۱۷) (الاصابہ، ج۱، ص ۷ تا ۹)

اہلسنت نے صحابی کی یہ تعریف کر کے آنحضرتؐ کے دور کے لاکھوں افراد کو کسی استثناء کے بغیر دائرۂ صحابیت میں شامل کر دیا اور افراد امت کی نگاہوں میں انہیں انتہائی محترم، جلیل القدر اور عادل قرار دیا اور اس کے بعد انہوں نے دھمکی آمیز فتاویٰ کی بنیاد پر لوگوں کو صحابہ کے متعلق ہر طرح کی تحقیق سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی۔

عہد رسالت کے معاشرے کو فرشتوں کا معاشرہ کہنا محال ہے بلکہ تمام انبیاءؑ میں سے کسی بھی نبی کے دور کا معاشرہ فرشتوں پر مشتمل نہیں رہا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر لوگوں کو فرشتہ بنانے نہیں آئے تھے۔ انبیائے کرام تبلیغ و رہنمائی کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور اس کے ساتھ امت کو انبیاءؑ کی تعلیمات قبول کرنے یا رد کرنے کا پورا اختیار دیا گیا۔

انبیاءؑ پر ایمان لانے والوں کے ایمان کا معیار بھی یکساں نہیں تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عدالت صحابہ کا نظریہ خالصتاً ایک سیاسی نظریہ ہے۔ اگر عدالت کو صحابہ کے مخصوص اور ممتاز افراد سے مخصوص کر دیا جاتا تو ان کے علاوہ کسی اور کو روایت حدیث کی اجازت نہ ہوتی تو بہت بہتر ہوتا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو طبقۂ حکام کو ایسی خود ساختہ روایات کی اشد ضرورت تھی اور طبقۂ حکام کے مفادات کو تحفظ دینے کے لئے فقہاء نے ان سے بھرپور تعاون کیا اور امت کو عدالت صحابہ کے عقیدے کی دعوت دی اور امت کو اس عقیدے کو تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔

تمام صحابہ کی عدالت کا عقیدہ تخلیق کرنے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ بہت سے غلط افراد کو ایمان و وفاداری کی چار دیواری میں داخل کیا جائے، اس کے بعد امت اسلامیہ سے کہا جائے کہ وہ آنکھیں بند کر کے ان کے اقوال قبول کرے۔

عدالت صحابہ کے نظریے کو اختراع کرنے کا اہم مقصد یہ تھا کہ معاویہ کو علیؑ کے مساوی قرار دے کر لوگوں کو معاویہ کی پیروی کی ترغیب دی جائے۔ چنانچہ یہی کچھ ہوا۔ (السیف والسیاسۃ، ص ۱۱۵)

اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کی نسلیں پیدا ہوئیں اور انہوں نے اپنے آباء کو معاویہ کی پیروی کرتے ہوئے پایا تو انہوں نے بھی عدالت صحابہ کو جزو ایمان سمجھتے ہوئے اپنے آبائی عقائد کی پیروی کی اور یوں ملوکیت کے حامی ملاؤں کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے معاویہ کے نظریات کو فروغ حاصل ہوا اور حضرت علیؑ کے نظریات طاق نسیان پر رکھ دیئے گئے۔

ہمیں ان لوگوں پر سخت تعجب ہوتا ہے جو دن رات عدالت صحابہ کے طبع زاد نظریے کا پرچار کرتے رہتے ہیں اور یہ فتویٰ صادر کرتے ہیں کہ جو شخص کسی بھی صحابی کی توہین کرے تو وہ کافر ہے اور اسے زندان میں ڈال دینا چاہئے اور اسے کوڑے مارنے چاہئیں اور اگر کوڑے کھا کر بھی کوئی شخص باز نہ آئے تو اسے قتل کر دینا چاہئے۔

ایسے ہی افراد سے ہمارا سوال ہے کہ حدیث و تاریخ کی کتابوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ معاویہ برسرعام منبر پر حضرت علیؑ کو سب و شتم کرتا تھا اور اس نے اپنی پوری مملکت میں اسی بدعت کو سرکاری فرمان کے ذریعے جاری کیا تھا۔ لہٰذا اگر کسی صحابی کی بے ادبی کرنے والا کافر اور لائق زندان اور لائق قتل ہے تو آپ حضرات معاویہ پر کیا فتویٰ لگائیں گے؟ (اور کیا آپ میں اتنی حرارت ایمانی اور جرأت رندانہ موجود ہے کہ آپ مذکورہ فتویٰ معاویہ پر بھی لگا سکیں؟ اور اگر آپ یہ فتویٰ معاویہ اور دیگر سلاطین بنی امیہ پر لگانے پر آمادہ نہیں ہیں تو کیا یہ فتویٰ صرف شیعوں کے لئے صادر کیا گیا ہے؟) اور کیا ایسے افراد معاویہ سے دوری تلاش کریں گے؟ اور اگر یہ سب کچھ ناممکن ہے تو پھر یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ عدالت صحابہ کے نظریے کی بنیاد قرآن و حدیث پر نہیں ہے۔ یہ نظریہ مخصوص سیاسی مفادات کے لئے اور بالخصوص بنی امیہ کی حکومت کو تحفظ فراہم کرنے کی غرض سے تراشا گیا ہے۔

جی ہاں! عدالت صحابہ کے نظریے کا مقصد حفاظت دین کی بجائے حقیقی عادل افراد کو پامال کرنا اور انہیں منظر عام سے ہٹانا تھا۔

امت اسلامیہ بنی امیہ و بنی عباس کی حکومت کے جال میں پھنسی ہوئی تھی اسی لئے انہیں دکھاوے کے لئے ایسے افراد کی ضرورت تھی جو اگر حقیقت میں نہ سہی تو کم از کم دکھاوے کے طور پر ہی عادل کہلاتے ہوں۔

اگر عدالت صحابہ کے نظریے کو فروغ نہ دیا جاتا تو بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں کا نام ونشان نہ ہوتا اور حضرت علیؑ کا مکتب نگاہوں سے کبھی اوجھل نہ ہوتا۔

اس نظریے کا مقصد دین حقیقی کے خلاف منصوبہ بندی کرنا تھا جسے حکام نے رائج کیا اور ان کے دوستوں نے اسے جاری کیا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد فقہاء آئے تو انہوں نے اس غلط نظریے کی تائید کی اور یوں اصل حقیقت آہستہ آہستہ مسلمان نسلوں کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

اصحاب کی سیرت کو پڑھنے سے انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ رسول خداؐ کی زندگی اور آپ کی وفات کے بعد امت میں جتنے بھی انحرافات پیدا ہوئے وہ سب کے سب صحابہ کے ہی پیدا کردہ تھے اور اگر مذکورہ انحرافات کے علل و اسباب کا جائزہ لیا جائے تو بہت سے اصحاب دائرہ عدالت سے باہر دکھائی دیں گے اور معدودے چند افراد کے علاوہ ایک بھاری اکثریت فتنوں میں ملوث دکھائی دے گی۔

عدالت صحابہ کا نظریہ ہمیں اس لئے بھی مشکوک دکھائی دیتا ہے کہ پالیسی ساز افراد نے اس نظریے کی رو سے ان افراد کے تقدس کو بحال رکھنے کی کوشش کی جنہوں نے غیر مشروط طور پر امیر کی اطاعت کو واجب سمجھا اور باقی افراد کو اطاعت امیر کی ترغیب دی۔ اس گروہ میں ابوہریرہ، ابن عمر، عمرو بن العاص اور معاویہ کے دوسرے وفادار دوست سرفہرست دکھائی دیتے ہیں۔

آنحضرتؐ کی گھریلو اور امور خانہ کی روایات کا زیادہ تر حصہ ام المومنین عائشہؓ، حفصہؓ اور ابوہریرہ جیسے بنی امیہ کے دوست داروں سے مروی ہے۔

لوگوں نے بنی امیہ کے مقام کو اونچا دکھانے والی روایات بھی انہیں افراد سے نقل کی ہیں۔ حد یہ ہے کہ معاویہ نے بھی اس طرح کی روایت بیان کی تھی جسے لوگوں نے قبول کیا تھا۔

بخاری جسے امیر المومنین فی الحدیث کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، نے اپنی کتاب میں یہ روایت درج کی کہ ایک دن معاویہ نے خطاب کیا اور اس نے اپنے خطاب میں کہا: ''خدا کو جس کی بھلائی مطلوب ہوتی ہے تو اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ میں تو تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ عطا کرنے والا ہے یہ امت قیام قیامت تک صحیح راستے پر چلتی رہے گی یہاں تک کہ اللہ کا امر پہنچ جائے۔'' (بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، ج۹، ص۱۲۴)

اور جب حذیفہؓ بن یمان، عمارؓ بن یاسرؓ اور ابوذر غفاریؓ کی روایات کو غور سے دیکھا جائے تو وہ ایک اور اصول کو بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور حکومتی پرچم کے علاوہ ایک اور پرچم بلند کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور اس اختلاف نظر کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ افراد رسول خداؐ کے جاں نثار صحابی اور حضرت علیؑ کے مخلص و وفادار شاگرد تھے۔

ان کی اسی صفت کی وجہ سے انہیں نظرانداز کیا گیا اور ان کی جگہ ایسے افراد کو متعارف کرایا گیا جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی اور محدثین نے حضرت علیؑ کے مخلص دوستوں کی روایات پر اعتراضات کئے اور انہیں مشکوک بنایا اور محدثین کی اس حرکت کا مقصد صرف یہی تھا کہ امت اسلامیہ کو مخلص صحابہ کی تعلیمات سے دور رکھا جائے اور جب امت ان صحابہ سے ہٹ جائے گی تو وہ حضرت علیؑ سے بھی خودبخود دور ہو جائے گی۔

صحیح بخاری جیسی کتابوں کا مطالعہ کرنے والا شخص اس حقیقت کو فوراً بھانپ لیتا ہے کہ بخاری اور اس جیسے دوسرے محدثین نے مخصوص افراد کو مدنظر رکھ کر زیادہ تر روایات انہیں سے نقل کیں اور ایسے صحابہ کو جان بوجھ کر نظرانداز کردیا جو ان سے کہیں بلند مقام کے حامل تھے۔

بخاری اور اس جیسے دوسرے محدثین نے اپنے اسلاف کے خودساختہ اصولوں کی مکمل پیروی کی ہے اور تعدیل و جرح کے جن قواعد سے سیاست کی بو آتی ہے اسے بھی ان محدثین نے جوں کا توں قبول کیا اور عقل کو اس پوری کارروائی سے باہر کئے رکھا۔

مذکورہ محدثین نے اپنی روایات کو عقل کی کسوٹی پر ہرگز نہیں پرکھا اور اپنے خودساختہ قواعد پر ان کا وزن کیا اور اپنی خلاف قرآن وخلاف عقل روایات کو قطعیت کا درجہ دیا اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ اجماع امت اسی پر قائم ہے اسی لئے انہوں نے اس اساس کو تسلیم کیا (اور پھر رطب و یابس قسم کی تمام روایات امت کے گلے میں ڈال دیں۔)

صحیح بخاری کے مطالعے کے دوران پہلی چیز یہ دکھائی دیتی ہے کہ اس نے امام جعفر صادقؑ سے کوئی روایت نقل نہیں کی اور رسول خداؐ کی دختر حضرت فاطمہ زہراؑ سے صرف ایک روایت نقل کی ہے جبکہ اس نے بی بی عائشہؓ سے دو سو بیالیس اور معاویہ سے آٹھ، ابوہریرہ سے چار سو چھیالیس اور ابن عمر سے دو سو ستر اور حضرت علیؑ سے صرف انتیس روایات نقل کی ہیں۔

حضرت علیؑ کے وہ ساتھی جنہوں نے معاویہ سے مقابلہ کیا اور بنی امیہ کی سازشوں کا ساتھ دینے سے انکار کیا تھا ان سے بخاری نے انتہائی کم احادیث نقل کی ہیں۔

اس نے حضرت عمارؓ سے صرف چار، حضرت بلالؓ سے تین، حضرت سلمانؓ سے چار، حضرت مقدادؓ سے ایک، حضرت ابوذرؓ سے چودہ اور حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ سے دو احادیث نقل کی ہیں۔ (ھدی الساری مقدمہ فتح الباری)

(بخاری سے احمد بن حنبل کی حالت کافی بہتر دکھائی دیتی ہے کیونکہ) جب ہم مسند احمد بن حنبل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے آٹھ سو اٹھارہ احادیث کی سند حضرت علیؑ تک پہنچائی جن میں سے اکثر صحیح ہیں۔ (مسند احمد بن حنبل) [1]

محدثین نے اس سلسلے میں خاص احتیاط یہ برتی کہ حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت سلمانؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت علیؑ کے دوسرے دوستوں سے صرف ایسی روایات نقل کیں جن کا تعلق اخلاقیات و وعظ ونصیحت سے تھا اور حد یہ ہے کہ محدثین نے خود حضرت علیؑ سے ایسی روایات بھی نقل کی ہیں جو ان کی مخالفت اور ان کے مخالفین کے فائدہ میں تھیں۔

جب مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ بخاری کی کتاب کو دوسری کتابوں پر فوقیت دینے کا راز کیا ہے اور دوسری کتب حدیث کی بجائے صحیح بخاری پڑھنے کی تاکید کیوں کی جاتی ہے؟

احادیث کی تحقیق ہمیں اس حقیقت تک لے جاتی ہے کہ دائرۂ عدالت اہلبیتؑ میں ہی منحصر ہے اور ان ہی کے متعلق پیغمبر اکرمؐ نے امت کو یہ وصیت کی تھی کہ وہ ان کے بعد ان کے اہلبیتؑ کی طرف رجوع کریں اور احکام دین ان ہی سے معلوم کریں۔

جی ہاں! جب دائرۂ عدالت میں توسیع کر کے دوسروں کو بھی اس میں داخل کر دیا جائے تو اس کا مفہوم یہی ہے کہ دین کی حقیقت کو مسلمانوں کی نسل سے پوشیدہ رکھنے کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ نے رسول خداؐ سے مختلف اور متضاد خیالات کو

۱۔ حضرت علیؑ کی طرف منسوب کچھ زیادہ روایات نقل کرنے کی وجہ سے لوگ مسند احمد بن حنبل میں بھی شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں۔

نقل کیا ہے اور اس کے ساتھ سب پر عادل کا لیبل بھی موجود تھا۔ اسی وجہ سے دشمنان اہلبیتؑ حکام اور ان کے درباری ملاؤں کے لئے امت کو اپنی طرف مبذول کرنا انتہائی آسان ہوگیا اور تاریخ اسلام کے مطالعے سے یہ حقیقت بڑی عیاں ہوکر سامنے آتی ہے اور آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ وہ صحابہ کے علاوہ کسی کو نہیں پہچانتے اور صحابہ کو ہی احکام دین کا منبع تسلیم کرتے ہیں اور یہ سب کچھ عدالت صحابہ کے خودساختہ نظریے کا ثمر ہے۔

لہٰذا نصوص ومتون پر مبنی حقیقی اسلام کی تلاش کے لئے اس نظریے سے دست برداری انتہائی ضروری ہے اور یہ راہ حق کا نقطۂ آغاز ہے۔

حکام وفقہاء کی ان تمام تر کوششوں اور جملہ صحابہ کو ردائے عدالت میں ملبوس کرنے کے باوجود آج بھی کتب خلافت کی کتابوں میں ایسے متعدد واقعات و حالات موجود ہیں جو عدالت صحابہ کے نظریے کے سراسر منافی ہیں اور ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول خداؐ کی وفات کے بعد صحابہ میں نہ صرف انحراف بلکہ ارتداد کے واقعات بھی پیش آئے تھے۔

بخاری نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

میرے اصحاب میں سے کچھ افراد حوض کوثر کے کنارے میرے پاس آئیں گے لیکن انہیں مجھ سے دور کردیا جائے گا۔ اس وقت میں کہوں گا: اے پروردگار! یہ میرے اصحاب ہیں۔ خداوند عالم فرمائے گا: تمہیں معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا تھا؟ یہ لوگ تمہارے بعد مرتد ہوگئے تھے اور الٹے پاؤں پھر گئے تھے۔ (بخاری، کتاب الفتن، باب الحوض، ج۹، ص۵۸)

ایک اور روایت میں یہ الفاظ وارد ہیں: اس وقت میں کہوں گا کہ دوری ہو، دوری ہو، اس کے لئے جو میرے بعد بدل گیا۔ (بخاری، کتاب الفتن، باب الحوض، ج۹، ص۵۸)

اس حدیث کے ضمن میں قسطلانی لکھتے ہیں: رسول خداؐ کے "عن غیر بعدی" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول خداؐ کی یہ بددعا گناہگاروں کے لئے نہیں ہوگی بلکہ آپ کی بددعا ان افراد کے لئے ہوگی جنہوں نے کفر اختیار کیا ہوگا کیونکہ اگر وہ لوگ صرف گناہگار ہوتے تو آپ تو شفیع المذنبین ہیں۔ قیامت کے دن آپ نے امت کے گناہگاروں کی شفاعت

کرنی ہے مگر آنحضرتؐ نے انہیں بددعا دی ہے جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ حوض کوثر سے ہٹائے جانے والے افراد صرف گناہگار ہی نہیں بلکہ کافر ہوں گے۔ (حاشیہ صحیح مسلم طبع استنبول۔ ارشاد الاساری شرح صحیح بخاری، ج۹، ص۳۲۵)

بخاری لکھتے ہیں کہ کسی نے براء بن عازب سے کہا: تم بڑے خوش نصیب ہو تمہیں رسول اکرمؐ کی صحبت نصیب ہوئی اور تم نے درخت کے نیچے رسول اکرمؐ کی بیعت (رضوان) کی تھی۔ انہوں نے کہا: بھائی! تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ہم نے رسول اکرمؐ کے بعد کتنی بدعتیں پیدا کی ہیں۔ (کتاب الفتن۔ صحیح بخاری، ج۵، ص۱۵۹ تا ۱۶۵)

اجماع

مسئلہ اجماع پر تحقیق کرنے والے شخص کو ان حقائق سے آشنائی حاصل ہوتی ہے:

۱۔ مسئلہ اجماع میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

۲۔ اجماع آج تک تاریخ کے کسی دور میں بھی کامل صورت میں منعقد نہیں ہوا اور سچ یہ ہے کہ مستقبل میں بھی اجماع کامل کی کوئی توقع نہیں ہے۔

۳۔ اجماع کی بعض اقسام شکوک وشبہات کو جنم دیتی ہیں۔

۴۔ اگر اجماع کھل کر سامنے آیا تو صرف سیاست سے وابستہ امور اور عقائد اہلسنت کے متعلق آیا ہے۔

اہلسنت کے ہاں اجماع واقع ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے نظریے سے متصادم نظریات پیدا نہ ہوئے ہوں۔ اگر اجماع کا یہ درج بالا مفہوم صحیح ہے تو اہلسنت کو اجماع کا دعویٰ زیب ہی نہیں دیتا کیونکہ صحابہ وتابعین میں ایسے افراد موجود تھے جو حضرت علیؑ کے نظریے کے پیروکار تھے اور اہلسنت کے موجودہ عقائد ونظریات سے ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔

اس کے علاوہ مسلک اہلسنت کے مقابلے میں خوارج اور معتزلہ اور دوسرے فرقے بھی ہر دور میں موجود رہے ہیں اور ہر مذہب کے پاس پیروکاروں کی کوئی کمی نہیں تھی اور یہ تمام فرقے اور مذاہب اہلسنت کے عقائد کے مخالف تھے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب افراد اہلبیت مخالف ہوں اور اہلبیتؑ کے پیروکار جن میں صحابہ وتابعین پیش پیش تھے، وہ بھی مخالف ہوں اور معتزلہ وخوارج بھی مخالف ہوں تو اجماع کا دعویٰ کس بنیاد پر کیا جا رہا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اجماع اہلسنت صرف ایسے مخصوص امور پر ہے جو اُن

کے نظریات کو تقویت دیں اور دوسرے مسالک و نظریات پر انہیں غالب کر سکیں۔

۱۔ اہلسنت کا حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؑ کی خلافت پر اجماع ہے۔

۲۔ تمام صحابہ کی عدلت پر بلا استثناء اجماع ہے۔

۳۔ حکام کی اطاعت کے وجوب پر ان کا اجماع ہے اور طبقۂ حکام کی مخالفت اور ان کے خلاف خروج کے حرام ہونے پر بھی اجماع ہے۔

۴۔ بخاری و مسلم کی لکھی ہوئی کتابوں کے صحیح ہونے پر اجماع ہے۔

۵۔ حضرت عثمانؓ کے جمع کردہ قرآن مجید کی صحت پر اجماع ہے۔

سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا امور پر اجماع تو ہے لیکن کیا حقیقت بھی یہی ہے؟

اس اجماع کو گروہ اہلسنت کا اجماع تو کہا جا سکتا ہے لیکن پوری امت اسلامیہ کا اجماع قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ اجماع دراصل مسلک اہلسنت کی تقدیر سازی کے لئے ضروری ہے اور اس کی مخالفت کا مقصد تسنن کے عقائد و نظریات کا انہدام ہے۔ اگر یہ اجماع نہ ہوتا تو فقہاء مسلمانوں اور ان کی آنے والی نسلوں کو اپنے نظریات و پروگرام سے کبھی مطمئن نہیں کر سکتے تھے۔

محقق موجودہ اسلامی نظریات کے متعلق اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ عقائد و نظریات نصوص کی بجائے اجماع پر قائم ہیں اور مزید یہ کہ شخصیات کو نصوص سے بالاتر تسلیم کیا گیا ہے۔ اجماع کا نظریہ بھی عدالت صحابہ کے نظریے کی طرح کسی دلیل و برہان پر قائم نہیں ہے۔ ان نظریات کا مقصد اپنے رائج اور متداول خط کے مقابلے میں امت کو جھکانا ہے۔

عدالت صحابہ کا نظریہ سیاست کا تراشا ہوا ہے اسی طرح اجماع کا عقیدہ بھی سیاست کا ساختہ پرداختہ ہے اور حکام و فقہاء نے اجماع کی تلوار سے اپنے آپ کو مسلح کر کے اپنے تمام مخالفین کو عمومی دھارے سے باہر کر دیا۔

چار افراد کی خلافت پر اجماع بھی ایک سیاسی چکر ہے اور اس کا مقصد خط اہلبیتؑ کو پامال کرنا ہے اور اس تقسیم بندی میں حضرت علیؑ کو چوتھا درجہ دیا گیا ہے اور تیسرے نمبر پر خاندان بنی امیہ کے اصلی مربی حضرت عثمانؓ کو تسلیم کیا گیا ہے اور دوسرے نمبر پر حضرت عمرؓ اور پہلے نمبر پر حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس تقسیم بندی کا واضح مقصد یہی ہے کہ مذکورہ بالا تینوں

افراد حضرت علیؑ سے افضل تھے اور حضرت علیؑ کوئی مافوق الفطرت قسم کی شخصیت نہیں تھے۔ خلافت کی تقسیم بندی سے اہلبیت کی عظمت کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور انہیں اس طرح سے غیر اہم بنانے کی سعی کی گئی ہے۔

اس عقیدے پر اتنی سختی اور اس عقیدے کو اپنے اصول اعتقاد کا حصہ بنانا اور اس پر اصرار کرنا اور اپنے مخالفین پر اس نظریے کو تسلیم کرانے کے لئے جسمانی تشدد روا رکھنے سے انسان کے شکوک و شبہات کو تقویت ملتی ہے۔ علمائے اہلسنت نے خلافت کی ترتیب کا عقیدہ یوں بیان کیا ہے:

"رسول خداؐ کے بعد ہم حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ اول کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں اور ہم حضرت ابوبکرؓ کو تمام امت سے مقدم اور برتر مانتے ہیں۔ ان کے بعد حضرت عمر بن خطابؓ اور ان کے بعد حضرت عثمان بن عفانؓ اور ان کے بعد حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو خلیفہ مانتے ہیں۔ تمام بزرگوار خلفائے راشدین اور ہدایت کرنے والے امام ہیں۔" **(عقیدنہ طحاویہ،** ص۴۷۳ تا ۴۸۸، طبع الفکر)

ابن تیمیہ کہتا ہے: رسول خداؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ تمام انسانوں سے افضل ہیں۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ، ان کے بعد حضرت عثمانؓ اور پھر ان کے بعد حضرت علیؑ لوگوں سے افضل ہیں۔ اہلسنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؑ سے افضل تھے۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی حضرت علیؑ پر تفضیل ان کے اصول و عقائد کا حصہ نہیں ہے اسی لئے اس عقیدے کے مخالف کو گمراہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ مسئلہ خلافت پر ہدایت اور گمراہی کا دار و مدار ہے۔ اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ رسول خداؐ کے بعد ابوبکرؓ، پھر عمرؓ، پھر عثمانؓ اور پھر علیؑ خلیفہ ہیں اور جو شخص ان میں سے کسی کی خلافت پر بھی اعتراض کرے تو وہ گدھے سے بھی زیادہ گمراہ ہے۔ **(عقیدۂ واسطیہ، ص۲۳۲)**

خلیل ہراس نے اپنے عقیدے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسئلہ خلافت کے متعلق انسان کو یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت صحیح تھی کیونکہ انہیں حضرت عمرؓ کی تشکیل کردہ چھ رکنی شوریٰ نے منتخب کیا تھا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص حضرت عثمانؓ کی خلافت پر اعتراض

کرے اور کہے کہ ان کی نسبت حضرت علیؑ خلافت کے زیادہ حقدار تھے تو ایسا انسان گمراہ اور بدعتی تصور کیا جائے گا اور اس کے متعلق یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ اس پر تشیع کا غلبہ ہے کیونکہ اس گفتگو سے مہاجرین و انصار کی تحقیر اور سبکی لازم آتی ہے۔ (**شرح عقیدۂ واسطیہ**، ص۲۴۴)

اہلسنت نے اس سلسلے میں ایک حدیث وضع کی ہوئی ہے اور وہ ہمیشہ اس حدیث کا سہارا لیتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا: تمہیں میری اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کرنی چاہئے۔ تم ثابت قدمی کے ساتھ ان سے وابستہ رہو۔ (مستدرک حاکم، ج۱، ص۹۶۔ مسند احمد بن حنبل، ج۴، ص۱۲۶)

میں نے اس مسئلے پر خاصی تحقیق کی اور اس کے منابع تلاش کئے تو اس نتیجے پر پہنچا:

۱۔ خلفائے راشدین کی ترتیب خالصتاً سیاست کی اختراع ہے اور نصوص میں ایسی کوئی بات موجود نہیں ہے جو اس نظریے کی مؤید ہو۔

۲۔ حضرت علیؑ کو خلفائے ثلاثہ کے بعد چوتھے نمبر پر ماننا حقائق کو گم کرنے کی غرض سے ہے تاکہ کسی کو شک کرنے کی جرأت پیدا نہ ہو۔

۳۔ خلفائے ثلاثہ ایک ہی راستے کے پیروکار نہیں تھے اور ان میں سے ہر ایک کی اپنی جداگانہ سنت تھی۔

۴۔ حضرت علیؑ کی سنت خلفائے ثلاثہ کی سنت سے بالکل جدا تھی۔

۵۔ اہلسنت نے خلفائے ثلاثہ کی اقتدا کی ہے، حضرت علیؑ کی اقتدا نہیں کی۔

۶۔ خلفائے ثلاثہ نے بنی امیہ کے لئے راستہ ہموار کیا۔

۷۔ خلفائے راشدین کے نظریے سے وفاداری خط بنی امیہ سے وفاداری ہے۔

ان نتائج سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین کے نظریے کو ماننے پر اتنا زور اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اگر یہ عقیدہ ٹوٹ جائے تو بنی امیہ کی حکومت کی سند جواز خود بخود ختم ہو جاتی ہے کیونکہ یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور اگر ان میں سے ایک کڑی ٹوٹ جائے تو سارا سلسلہ ہی زیر و زبر ہو جاتا ہے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کا انکار حضرت عمرؓ کے انکار کا سبب ہے اور حضرت عمرؓ کا انکار حضرت عثمانؓ کا انکار ہے اور حضرت عثمانؓ کا انکار معاویہ کے انکار کا سبب

ہے۔ ان میں ہر ایک دوسرے سے مربوط ہے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین منتخب کیا تھا اور حضرت عمرؓ نے معاویہ کو شام کا والی مقرر کیا تھا اور اپنے بعد عثمانؓ کے لئے راہ ہموار کی تھی اور حضرت عثمانؓ نے حدود شام میں توسیع کر کے معاویہ کو تقویت فراہم کی تھی لہٰذا خلفائے ثلاثہ کے انکار کا نتیجہ اہلبیتؑ کی مدد کرنے کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ خلفائے ثلاثہ کے انکار سے عدالت صحابہ اور اجماع کے نظریات ختم ہوتے ہیں اور یوں مذہب اہلسنت کی پوری عمارت دھڑام سے زمین بوس ہوتی ہے۔ جب مسلک کی پوری عمارت ہی گر جائے تو اس مسلک کے حکام کی حکومتیں تباہ ہوتی ہیں۔ (اور اس تمام تر تباہی سے بچنے کے لئے عدالت صحابہ اور اجماع کے خودساختہ نظریات کا قائم رکھنا ضروری ہے۔)

اگر بالفرض اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے کہ ''تمہیں میری اور خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کرنی چاہئے'' تو پھر ہم یہ سوال کریں گے کہ حضرت علیؑ بھی خلفائے راشدین کے ہی ایک فرد تھے، آخر ان کی سنت پر عمل کیوں نہیں کیا جاتا؟

مذہب تسنن میں سنت علیؑ کا دور دور تک کہیں نشان دکھائی نہیں دیتا اور یوں علمائے اہلسنت نے اپنے عمل سے ہی اس حدیث کی تردید کردی اور اس حدیث کی صحت کے متعلق شکوک و شبہات اس لئے بھی سر اٹھاتے ہیں کہ بخاری و مسلم نے اس روایت کو اپنی کتابوں میں نقل نہیں کیا اور ایسی روایت پر انحصار کرنا اجماع کو توڑنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح علمائے تسنن نے فرقۂ ناجیہ کی جس حدیث پر انحصار کیا ہے اور جس کے تحت انہوں نے اپنے آپ کو فرقۂ ناجیہ کہا ہے، بخاری و مسلم نے فرقۂ ناجیہ کی روایت کو بھی اپنی کتابوں میں جگہ نہیں دی۔

خلفائے ثلاثہ کے قد کو بڑھانے کا مقصد حضرت علیؑ کو چھوٹا بنا کر پیش کرنا ہے اور جو شخص حضرت علیؑ کی عظمت کا قائل ہو جائے گا اسے خلفائے ثلاثہ کو کمتر ماننا پڑے گا۔ اسی طرز فکر کی وجہ سے امت میں فاصلے پیدا ہوئے اور جن لوگوں نے خلفائے ثلاثہ کے خط کو قبول کیا تو انہیں بنی امیہ کا دوست بننا پڑا اور جن لوگوں نے خط علیؑ کو چنا تو انہیں بنی امیہ سے دوری اختیار کرنی پڑی۔

بخاری کی حسب ذیل روایت خلفائے ثلاثہ کے مسئلے کے متعلق ہمارے تجزیے کی

تائید کرتی ہے۔ روایت یہ ہے کہ راوی نے کہا: زمانہ پیغمبرؐ میں ہم ابوبکرؓ کو تمام امت سے بہتر سمجھتے تھے، ان کے بعد عمرؓ اور ان کے بعد عثمانؓ کو سب سے افضل جانتے تھے۔ (صحیح بخاری، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضل ابی بکر، ج۵، ص۵۔ ۹۔ ۱۸)

اس روایت میں حضرت علیؑ کا نام سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ وارد ہیں: ہم کسی کو حضرت ابوبکرؓ کے مساوی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے بعد ہم عمرؓ کو اور ان کے بعد عثمانؓ کو تمام لوگوں سے افضل جانتے تھے۔ ان کے بعد ہم باقی اصحاب کو یکساں قرار دیتے تھے۔ (صحیح بخاری، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضل ابی بکر، ج۵، ص۵۔ ۹۔ ۱۸)

اس روایت کی مزید وضاحت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

مکتب خلافت کے علماء نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو اس عقیدے کی ترغیب کے لئے صرف اجماع ناکافی ہے۔ پھر انہوں نے اسی مفہوم کی روایت تراش کر حضرت علیؑ کی زبانی یہی مفہوم ادا کرانے کی کوشش کی اور اس خودساختہ روایت سے لوگوں کو باور کرایا گیا کہ حضرت علیؑ کے متعلق ہمارا عقیدہ ذاتی پسند اور ناپسند پر مبنی نہیں بلکہ خود حضرت علیؑ کے اعتراف پر مبنی ہے۔

بخاری نے حضرت علیؑ کے فرزند محمد بن حنیفہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ رسول خداؐ کے بعد تمام لوگوں سے افضل کون ہے؟ انہوں نے فرمایا: ابوبکرؓ۔ پھر میں نے پوچھا کہ ان کے بعد کون افضل ہے؟ انہوں نے کہا: عمرؓ۔ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ میرے والد کہیں عثمانؓ کا نام نہ لے لیں اس لئے میں نے پوچھا کہ آپ کا کیا مقام ہے؟ انہوں نے فرمایا: میں تو جماعت المسلمین کا ایک معمولی فرد ہوں۔ (صحیح بخاری، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضل ابی بکر، ج۵، ص۵۔ ۹۔ ۱۸)

ایسے ہی خودساختہ نظریات کے تحفظ کے لئے علمائے اہلسنت مجبور ہیں کہ وہ بخاری اور مسلم کی روایات کو صحیح قرار دیں اور ان کی روایات کو مدنظر رکھ کر اپنے نظریات کی توجیہ کریں اور اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ بخاری اور مسلم ہی عقائد اہلسنت کا سرچشمہ اور منبع ہیں اور اگر بخاری اور مسلم پر تنقید کو جائز قرار دیا جائے تو اس سے سنی مذہب کی عمارت ہی منہدم

ہوتی ہے اور بخاری اور مسلم کی اس خصوصیت کی وجہ سے علمائے اہلسنت نے ماضی اور حال میں ان تمام محققین کی کوششوں کو رد کیا جنہوں نے ان دو کتابوں پر تنقید کی۔[۱]

حجیت اجماع کے متعلق جو چیز ہمیں سب سے زیادہ شک میں ڈالتی ہے وہ یہ ہے کہ علمائے اہلسنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ طبقۂ حکام کی اطاعت ہر سطح پر واجب ہے اور ان کی مخالفت حرام ہے۔ اگرچہ حکام کتنے ہی غلط کار کیوں نہ ہوں اور چاہے وہ کفر کا ارتکاب ہی کیوں نہ کرتے ہوں پھر بھی ان کی اطاعت واجب ہے۔

برادران اہلسنت کے اس اجماع سے سیاست کی بو آتی ہے۔ اسی چیز کو مدنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اجماع کی دوسری اشکال بھی سیاست کی ساختہ پرداختہ ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس مفہوم کی تمام روایات کے ڈانڈے بھی ایوان اقتدار سے ملتے ہیں۔ حضرت رسول خداؐ کو نوروحی سے معلوم تھا کہ لوگ آپ پر جھوٹ باندھیں گے اسی لئے آپ نے اپنی امت کو خبردار کیا تھا کہ وہ ان جھوٹی روایات پر بھروسا نہ کریں۔

مسلم نے حضرت علیؑ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول خداؐ سے نقل کیا: ”مجھ پر جھوٹ نہ باندھو، جو بھی مجھ پر جھوٹ باندھے گا وہ دوزخ میں جائے گا۔“ دوسری روایت میں آنحضرتؐ سے یہ الفاظ مروی ہیں: ”مجھ پر جھوٹ باندھنا دوسروں پر جھوٹ باندھنے کے برابر نہیں ہے جو بھی مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھے تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں سمجھ لے۔“[۲]

یہ حدیث اہلسنت کے ہاں درجۂ تواتر تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس حدیث میں رسول اکرمؐ کے براہ راست مخاطب صحابہ ہی تھے۔ آپ نے صحابہ کو منع کیا کہ وہ آپ پر جھوٹ نہ باندھیں۔ اس کا براہ راست مقصد یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کو صحابہ کے متعلق جھوٹ باندھنے کا اندیشہ تھا اسی لئے حق یہ بنتا تھا کہ جب بھی کسی حدیث کی چھان بین کی جائے تو صحابہ سمیت تمام راویان حدیث کی تحقیق کی جائے لیکن یہاں پر معاملے نے معکوس صورت اختیار کرلی۔ محدثین نے

۱۔ سباعی کی کتاب السنة و مکانتها فی التشریع الاسلامی اور عجاج کی کتاب ابوهریرة راویة الاسلام اور ابوهریرة و اقلام الحاقدین کا مطالعہ فرمائیں۔ واضح رہے کہ مذکورہ کتابیں ابوہریرہ پر تنقید کے جواب میں تحریر کی گئی ہیں۔

۲۔ صحیح مسلم، [illegible] (۱) (المقدمہ) ص۹، ۱۰ حدیث ۳ (۲) (المقدمہ) ص۱۰ حدیث ۲۔ (۲)

تابعین اور تبع تابعین تک جرح و تعدیل کو محدود رکھا اور طبقۂ صحابہ کو عادل کہہ کر انہیں جرح و تعدیل کے قانون سے مستثنیٰ قرار دیا۔ انتقاد حدیث کے لئے یہ ایک خطرناک روش ہے۔ جب تک صحابہ پر جرح و تعدیل کا قانون لاگو نہیں کیا جائے گا اس وقت تک رسول خداؐ کے متعلق ان کی زبانی کہی ہوئی ہر بات تسلیم کی جاتی رہے گی۔ جب صحابہ ہزاروں گناہ کر کے اور دسیوں فتنوں میں ملوث ہو کر اور انحراف و کجروی کے باوجود بھی عادل تسلیم کئے جاتے ہیں تو ان کے بعد کے راویوں نے کون سا قصور کیا ہے کہ ان پر جرح کی جائے اور انہیں غیر عادل سمجھا جائے؟ اور جب مرکزی راویوں یعنی صحابہ کی یہ حالت ہو تو دوسرے راویوں کی کیا حالت ہوگی؟

اسی لئے روایات کے سلسلے میں تمام صحابہ پر بھی جرح و تعدیل کے اصولوں کا نفاذ ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ محدثین کے نزدیک جرح و تعدیل کے لئے صرف سچائی اور امانت کو ہی معیار تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ رواۃ کی سیاسی وابستگیوں کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور راویوں کے متعلق یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان کے روابط کون سے حکمرانوں کے ساتھ تھے اور یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ راوی نے کتنے بے گناہ مسلمانوں کو قتل کیا تھا اور اس کے ساتھ راوی کے ذاتی اوصاف یعنی بخل، بدخلقی اور زود رنجی کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ رواۃ کے متعلق یہ روش صرف اپنے منظور نظر صحابہ کو تحفظ دینے کی غرض سے روا رکھی گئی ہے۔ (کیونکہ اگر رواۃ پر جرح کرتے وقت یہ کہا جائے کہ فلاں راوی فلاں ظالم حاکم کا مصاحب خاص یا مشیر خاص تھا اور اس نے اپنے حاکم کی رضامندی کے لئے اتنے افراد کو قتل کیا تھا تو بعد میں صحابہ کے متعلق بھی اسی تنقید کا دروازہ کھل جائے گا کہ فلاں صحابی فلاں باغی حکمران کا مشیر و مصاحب تھا اور اس نے اس کی حمایت کے لئے اپنے وقت کے خلیفۂ راشد کے خلاف خروج کیا تھا اور بہت سے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا تھا۔ بہرنوع ان تمام سوالات سے بچنے کے لئے راوی کے لئے صرف صداقت و امانت کی شرط رکھی گئی تا کہ کہیں آبگینوں کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔)

المختصر سیاست، اہلسنت کے علم حدیث پر پوری طرح سے حاوی ہے اور سیاست کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے امت اسلامیہ کے اس گروہ نے خوارج، باغیوں اور فرزند رسولؐ کے قاتلوں تک سے روایات نقل کی ہیں۔

شخصیات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا

چند مخصوص شخصیات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اہلسنت کا شیوہ رہا ہے اور اس طریقے سے انہوں نے افراد امت کو آل محمدؐ کی دشمنی کی شاہراہ پر گامزن کیا۔

اگر یہ لوگ حضرت ابوبکرؓ کے لئے مخصوص مقام کے قائل نہ ہوتے اور انہیں تمام افراد امت سے افضل قرار نہ دیتے اور حضرت عمرؓ کو بلند ترین مقام پر فائز نہ کرتے اور بعض اوقات ان کا مقام پیغمبر اکرمؐ کے مقام سے بھی بلند تر نہ کرتے اور اسی طرح سے حضرت عائشہؓ، ابوہریرہ اور ابن عمر عدالت صحابہ اور عشرۂ مبشرہ کی روایات وضع نہ کرتے تو حضرت علیؑ کا مقام اس قدر پست دکھائی نہ دیتا اور ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ، عمار یاسرؓ، حذیفہ یمانیؓ اور حضرت علیؑ کے دوسرے جاں نثار ساتھیوں کا مقام کبھی کم دکھائی نہ دیتا۔

حضرت علیؑ کی شان میں قرآن مجید کی بہت سی آیات اور نبی اکرمؐ کی سیکڑوں احادیث موجود ہیں جن کی وجہ سے اصحاب ثلاثہ اور ام المومنین کے فضائل کی روایات انتہائی کم دکھائی دیتی ہیں۔ چنانچہ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے موضوع روایات، اجماع اور عدالت صحابہ کے نظریات کو فروغ دیا گیا۔ جب تمام صحابہ عادل قرار دیئے گئے تو ان کی زبانی حکمران طبقے کے لئے ایسی روایات نقل کی گئیں جن کی وجہ سے ان کا مقام حضرت علیؑ کے مقام سے بلند و بالا دکھائی دینے لگا۔

مخصوص شخصیات کے مقام کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ افراد امت کو اپنے نظریے کی پیروی پر آمادہ کیا جائے اور حقیقی رہبران اسلام کو رد کرنے اور انہیں فراموش کرنے کے لئے زمین ہموار کی جائے۔

''ترقی دادہ'' شخصیات کی سیرت کو پڑھنے سے انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مذکورہ شخصیات کا تعلق حضرت علیؑ کی حریف جماعت سے تھا اور مزید یہ کہ مذکورہ افراد نے بنی امیہ کے لئے میدان ہموار کیا اور اموی اقتدار کے لئے مددگار ثابت ہوئے۔

حضرت علیؑ کی شخصیت کو چھوٹا ثابت کرنے کی کوششیں

علمائے اہلسنت نے صرف اپنی منظور نظر شخصیات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ انہوں نے اس سے ایک قدم آگے بڑھایا اور حضرت علیؑ کی شخصیت کو کمتر بنانے کی پوری کوششیں کیں۔ انہوں نے رسول خداؐ کی زبانی بھی ایسی روایات وضع کیں جن سے حضرت علیؑ کے مقام کی پستی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

اسی طرح کی روایات وضع کر کے انہوں نے افراد امت کو یہ باور کرایا کہ وہ علیؑ کو ان کے اپنے مقرر کردہ مقام تک ہی محدود سمجھیں۔

بخاری لکھتے ہیں کہ رسول خداؐ نے منبر پر ارشاد فرمایا: ہشام بن مغیرہ کی اولاد اپنی ایک لڑکی کا نکاح علیؑ سے کرنا چاہتے ہیں اور وہ مجھ سے اجازت لینے کے لئے آئے۔ میں علیؑ کو دوسرے نکاح کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، میں ہرگز اجازت نہیں دیتا، میں ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ البتہ اگر ابوطالبؑ کا بیٹا میری بیٹی کو طلاق دے کر ان کی لڑکی سے شادی کرے تو یہ ایک علیحدہ بات ہے کیونکہ فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے۔ جس نے فاطمہؑ کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے فاطمہؑ کو پریشان کیا اس نے مجھے پریشان کیا۔ (صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب ذب الوجل عن ابنته، ج۷، ص۴۷۔ صحیح مسلم، باب فضائل فاطمہؑ، ج۴، ص۱۹۰۲، حدیث۹۳)

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت علیؑ نے حضرت فاطمہؑ کی زندگی میں ابوجہل کی بیٹی کے لئے خواستگاری کی تھی۔ (صحیح بخاری، ج۴، ص۱۰۱۔ صحیح مسلم، ج۴، ص۱۹۰۳، حدیث۹۵)

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا: فاطمہؑ میرے جسم کا حصہ ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اسے کوئی اذیت پہنچے۔ خدا کی قسم کوئی مرد رسول خداؐ کی بیٹی اور دشمن خدا کی بیٹی کو جمع نہیں کرسکتا۔ رسول خداؐ کا یہ فرمان سن کر علیؑ نے خواستگاری سے ہاتھ کھینچ لیا۔ (صحیح مسلم، ج۴، ص۱۹۰۳، حدیث۹۴)

ابن حجر کا قول ہے کہ اس داستان کا صحیح ترین نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کے لئے اپنی بیٹی کے ساتھ ابوجہل کی بیٹی کو حرام کردیا تھا کیونکہ حضرت رسول خداؐ نے فرمایا تھا کہ اس سے مجھے اذیت ہوتی ہے اور فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ رسول خداؐ کو اذیت دینا حرام ہے۔ (فتح الباری، ج۹، ص۲۷۰)

احمد بن حنبل روایت کرتے ہیں کہ رسول خداؐ، علیؑ و فاطمہؑ کے پاس گئے اور انہیں نماز کے لئے بیدار کیا۔ پھر اپنے گھر واپس تشریف لائے اور آپ نے اپنے گھر میں تہجد کا کچھ حصہ ادا کیا لیکن آپ کو علیؑ و فاطمہؑ کی کوئی آواز سنائی نہ دی۔ آپ دوبارہ گئے اور انہیں بیدار کیا اور فرمایا اٹھو اور نماز پڑھو۔ علیؑ کہتے ہیں کہ میں اٹھا اور اپنے ہاتھوں سے آنکھوں کو مسلا اور کہا: خدا کی قسم! ہم واجب نماز کے علاوہ اور نماز نہیں پڑھیں گے۔ ہماری روح خدا کے ہاتھ میں ہے اگر اس نے چاہا تو ہم بیدار ہو جائیں گے۔ (یعنی آپ کے لئے ہمیں جگانا کوئی ضروری نہیں ہے) رسول خداؐ ناراض ہو کر وہاں سے پلٹے اور آپ اپنا ہاتھ ران پر مار رہے تھے۔ (اور علیؑ کے الفاظ دہرا رہے تھے) ''ہم واجب نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں پڑھیں گے، ہم واجب نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں پڑھیں گے۔'' انسان کتنا جھگڑالو ہے۔ (مسند احمد بن حنبل، ج۲۔ (مسند الامام علی) ج۱، ص۹۱)

ترمذی حضرت علیؑ سے نقل کرتے ہیں: مجھے زیادہ مذی آتی تھی۔ میں نے رسول خداؐ سے اس کا حکم دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: منی کے نکلنے پر غسل واجب ہے اور مذی کے نکلنے پر صرف وضو واجب ہے۔ (سنن ترمذی، ج۱، ص۱۹۳، حدیث۱۱۴)

ایک دوسری روایت کے الفاظ ملاحظہ ہوں: علیؑ کہتے ہیں کہ مجھے زیادہ مذی آتی تھی۔ رسول خداؐ کی بیٹی میرے گھر میں تھی اسی لئے مجھے ان سے یہ مسئلہ پوچھتے ہوئے حیا محسوس ہوتی تھی۔ میں نے مقداد سے کہا کہ وہ یہ مسئلہ معلوم کرے۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ مقام خاص کو دھولے اور وضو کرے۔ (سنن ترمذی، ج۱، ص۲۴۷، حدیث۱۷۔ صحیح بخاری، ج۱، ص۴۵۔۵۵و۵۶)

احمد نے علیؑ سے روایت کی: میں یہ سمجھتا تھا کہ پاؤں کے اوپر والے حصے کی بجائے پاؤں کے تلوے کا مسح کرنا بہتر ہے۔ یہاں تک کہ میں نے رسول خداؐ کو پاؤں کے اوپر والے

حصے پر مسح کرتے ہوئے دیکھا۔ (مسند احمد بن حنبل، ج۱، ص۱۱۴۔ ۹۵۔ ۱۴۴)

بخاری نقل کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ سے پوچھا گیا کہ کتاب اللہ کے علاوہ تمہارے پاس کوئی اور وحی بھی موجود ہے؟

حضرت علیؑ نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے دانہ کو شگافتہ کیا اور ذی روح چیزوں کو پیدا کیا، قرآن کے فہم و ادراک کے علاوہ میں اپنے پاس کچھ نہیں پاتا یا میرے پاس ایک صحیفہ ہے جس کا علم میرے پاس موجود ہے۔

راوی نے پوچھا: صحیفہ میں کیا ہے؟

حضرت علیؑ نے کہا: اس میں دیت اور قیدی کی آزادی کے مسائل کے علاوہ یہ مسئلہ درج ہے کہ کسی کافر کے قتل کی وجہ سے کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ (صحیح بخاری، باب کتابۃ العلم، ج۱، ص۳۸، باب فکاک الاسیر، ج۴، ص۸۳۔ مسند احمد بن حنبل)

اس سے قبل ہم بخاری کی یہ روایت نقل کر چکے ہیں کہ حضرت علیؑ نے محمد بن حنفیہؒ سے کہا تھا کہ میں تو مسلمانوں کی جماعت کا ایک عام فرد ہوں۔

بخاری نے لکھا: رسول خداؐ کوہ احد کی چوٹی پر گئے۔ آپ کے ساتھ ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ تھے۔ پہاڑ ان کے پاؤں تلے لرزنے لگا۔ پیغمبر اکرمؐ نے کوہ احد سے مخاطب ہو کر کہا: اے احد! حرکت نہ کر کیونکہ اس وقت تجھ پر ایک پیغمبر اور ایک صدیق اور دو شہید کھڑے ہوئے ہیں۔ (صحیح بخاری، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضائل ابی بکر، ج۱۵، ص۱۱)

بخاری نے حضرت عمرؓ کی زبانی یہ الفاظ نقل کئے: وفات کے وقت رسول خداؐ، علیؑ سے راضی تھے۔ (صحیح بخاری، باب فضائل علی، ج۵، ص۲۲ تا ۲۴)

بخاری نے حضرت علیؑ سے نقل کیا کہ جب انہیں خلافت ملی تو انہوں نے (قاضیوں سے) کہا: جس طرح تم پہلے فیصلے کرتے تھے اسی طرح سے اب بھی فیصلے کرتے رہو کیونکہ میں اختلاف سے گھبراتا ہوں یہاں تک کہ تمام لوگ جمع ہو جائیں یا میں بھی اپنے دوستوں کی طرح سے قتل ہو جاؤں۔ (صحیح بخاری، باب فضائل علی، ج۵، ص۲۲ تا ۲۴)

بخاری نقل کرتے ہیں: علیؑ اور عباس، عمرؓ کے پاس آئے اور عباس نے کہا: اے

امیر المومنین! آپ میرے اور اس شخص کے درمیان فیصلہ کریں۔

ان دونوں کا تنازعہ اس جائیداد کے متعلق تھا جو بنی نضیر سے حاصل ہوئی تھی جسے خدا نے اپنے نبی کو بطور فے عطا کیا تھا۔ علیؑ و عباس نے ایک دوسرے کو خوب برا بھلا کہا۔ (صحیح بخاری، کتاب الفرائض، ج۸، ص۱۸۵ و ۱۸۶، باب۳۔ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، ج۹، ص۱۲۱، باب۵۔ کتاب النفقات، باب۳۔ ترمذی کتاب السیر، ج۴، ص۱۵۸، حدیث۱۶۱۰۔ مسند احمد بن حنبل، ج۱، ص۴۹)

بخاری نے محمد بن حنفیہؒ سے نقل کیا: میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ رسول خداؐ کے بعد تمام لوگوں سے افضل کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ ابوبکر۔ میں نے پوچھا کہ ان کے بعد کون افضل ہے؟ انہوں نے کہا کہ عمر۔ پھر مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ وہ تیسرے مقام پر کہیں عثمانؓ کا نام نہ لے لیں اسی لئے میں نے کہا کہ آپ کو کون سا مقام حاصل ہے؟ آپ نے کہا کہ میں تو جماعت مسلمین کا ایک عام فرد ہوں۔ (صحیح بخاری، کتاب الفضائل الصحابہ، باب فضائل ابی بکر، ج۵، ص۹)

مذکورہ بالا اور ان جیسی دیگر روایات سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ:

۱۔ حضرت علیؑ نے جان بوجھ کر رسول خداؐ کو اذیت دی تھی اور ان کے فرمان پر کان نہ دھرے تھے۔

۲۔ جب رسول خداؐ نے انہیں نماز کے لئے بیدار کیا تو انہوں نے رسول خداؐ سے بہانے بنائے اور نماز تہجد ادا کرنے سے معذرت کر لی۔

۳۔ علیؑ پر جنسی شہوت غالب رہتی تھی۔

۴۔ علیؑ کو احکام وضو کا علم نہیں تھا۔

۵۔ علیؑ نے میراث میں علم پیغمبرؐ میں سے کوئی حصہ نہیں پایا تھا۔

۶۔ علیؑ، خلفائے ثلاثہ کی خلافت کا اقرار کرتے تھے۔

۷۔ علیؑ شہید نہیں تھے۔

۸۔ علیؑ کی خلافت کا جواز عمر کی خلافت کے جواز پر موقوف ہے۔

۹۔ علیؑ خلفائے ثلاثہ کی سنت کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔

۱۰۔ تھوڑی سی جائیداد کی وجہ سے علیؑ نے رسول خداؐ کے چچا کو گالیاں دی تھیں۔

۱۱۔ علیؑ خلفائے ثلاثہ کو اپنے سے افضل جانتے تھے اور ان کی خلافت کے صحیح ہونے کے بھی قائل تھے۔

لیکن کتب اہلسنت کی دوسری روایات اور تاریخی واقعات سے ان نتائج کی تصدیق نہیں ہوتی اور ان میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ (مسند احمد بن حنبل، ج ۲)[1]

مذکورہ روایات کو نقل کرنے کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کے اذہان میں علیؑ کے تقدس کا جو تصور موجود ہے اسے پاش پاش کردیا جائے اور مسلمانوں کے دلوں میں مقام علیؑ کو متزلزل کردیا جائے۔

عشرۂ مبشرہ

علمائے اہلسنت نے دس افراد کے متعلق لکھا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں جنت کی بشارت دی تھی اور ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت ابوبکرؓ (۲) حضرت عمرؓ (۳) حضرت عثمانؓ (۴) حضرت علی (۵) حضرت طلحہ (۶) حضرت زبیر (۷) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (۸) حضرت ابوعبیدہ بن جراح (۹) حضرت سعد بن ابی وقاص (۱۰) حضرت سعید بن زید۔

عشرۂ مبشرہ کی فہرست کا جائزہ لیں تو ان میں آپ کو حضرت علیؑ کا کوئی جاں نثار ساتھی دکھائی نہیں دے گا اور حضرت علیؑ کا نام بھی ان میں بطور تبرک اور وزن شعر پورا کرنے

---

[1] احمد بن حنبل لکھتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن عوف سے پوچھا گیا کہ آپ نے حضرت علیؑ کی بجائے حضرت عثمانؓ کی بیعت کی تھی آخر اس کی وجہ کیا تھی؟ انہوں نے کہا کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا، میں نے ابتدا علیؑ کی بیعت کی تھی اور ان سے کہا تھا کہ میں آپ کی اس شرط پر بیعت کرتا ہوں کہ آپ کتاب وسنت اور سیرت شیخین پر عمل کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ "جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکا۔" پھر میں نے یہی شرائط عثمانؓ کے سامنے پیش کئے تو اس نے فوراً قبول کر لئے۔

معلوم رہے کہ خلافت حاصل کرنے کے بعد حضرت عثمانؓ نے کسی بھی شرط پر عمل نہیں کیا تھا۔

کی غرض سے شامل کیا گیا ہے اور اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ علیؑ کا نام دیکھ کر باقی افراد کے متعلق بھی لوگوں کو جنتی ہونے کا یقین پیدا ہو جائے گا اور پھر اس کتب کے علماء کی مجبوری تھی کہ حضرت علیؑ آخری خلیفہ راشد تھے اور اگر اس فہرست میں انہیں شامل نہ کیا جاتا تو انہیں بہت زیادہ رسوائی اٹھانی پڑتی۔ (ابوداؤد، ج ۴، ص۲۱۱و۲۱۲، حدیث ۴۶۴۹و۴۶۵۰۔ شرح العقیدۃ الطحاویہ، ص۴۸۹)

بہرنوع اہلسنت مذکورہ دس افراد کو انتہائی تعظیم وتوقیر کے لائق سمجھتے ہیں اور انہیں دوسروں پر مقدم جانتے ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ مذکورہ نو افراد حضرت علیؑ کے دشمن تھے اور انہوں نے ایک دن کے لئے بھی حضرت علیؑ کی حمایت نہیں کی تھی۔ لطف یہ ہے کہ "اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے نقل نہیں کیا۔" البتہ اسے ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور یہ حدیث بھی "فرقہ ناجیہ اور کتاب اللہ وسنتی" کی احادیث کی طرح سے طرفہ قسم کی حدیث ہے۔

اب ہم عشرۂ مبشرہ کی حدیث کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ ہمارے قارئین کو معلوم ہو جائے کہ یار لوگوں نے دس افراد معین کرنے میں کتنے ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔

ابوداؤد نے سعید بن زید سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اکرمؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ دس افراد جنت میں جائیں گے۔ پیغمبرؐ جنت میں جائے گا، ابوبکر جنت میں جائے گا، عمر جنت میں جائے گا، عثمانؓ جنت میں جائے گا، سعد بن مالک جنت میں جائے گا، عبدالرحمٰن جنت میں جائے گا اور اگر میں چاہوں تو میں دسویں شخص کا نام بھی بتا سکتا ہوں۔

لوگوں نے کہا: بتائیں وہ کون ہے؟

انہوں نے کہا: سعید بن زید۔ (ترمذی، ج ۵، ص ۶۴۸۔ ابوداؤد، ج ۴، ص ۲۱۲، حدیث ۴۶۴۹)

ترمذی نے عبدالرحمٰن بن عوف سے نقل کیا کہ رسول خداؐ نے فرمایا: ابوبکر جنت میں ہوگا، عمرؓ جنت میں ہوگا، علیؑ جنت میں ہوگا، عثمانؓ جنت میں ہوگا، طلحہ جنت میں ہوگا، زبیر بن

عوام جنت میں ہوگا، عبدالرحمٰن بن عوف جنت میں ہوگا، سعد بن زید جنت میں ہوگا اور ابوعبیدہ بن جراح جنت میں ہوگا۔ (ابوداؤد، ج۵، ص۶۴۷)

پہلی بات جسے دیکھ کر انسان شک میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ یقین آ جاتا ہے کہ یہ روایات صرف دشمنانِ علیؑ کو بلند و برتر ثابت کرنے کیلئے وضع کی گئی ہیں کیونکہ حقائق حسب ذیل ہیں:

۱۔ ان لوگوں کو دس افراد معین کرنے میں سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کبھی عشرۂ مبشرہ میں سعد بن ابی وقاص کو شامل کرتے ہیں اور کبھی اس کی بجائے سعد بن مالک کا نام لیتے ہیں۔

۲۔ پہلی روایت میں حضرت علیؑ اور ابوعبیدہ بن جراح کا نام نہیں ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس حدیث کے سرنامہ میں یہ الفاظ کہے گئے کہ دس افراد جنت میں ہوں گے اور جب آنحضرتؐ نے ان کی گنتی کی تو اپنے سمیت سات افراد کے نام لئے۔ گویا رسول اکرمؐ کو گنتی کرنی بھی نہیں آتی تھی۔

۳۔ پہلی روایت میں رسول اکرمؐ کی طرف سے اپنے آپ کو اہل بہشت میں شامل کرنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ یہ روایت خالصتاً تخلیق بندہ ہے۔

۴۔ جب مذکورہ دس افراد کے حالات زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں کوئی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دیتی۔

۵۔ عشرۂ مبشرہ کی روایت بھی ان میں سے ایک فرد نے کی ہے۔ گویا ایک شخص اپنے آپ کو بشارت دے رہا ہے۔

۶۔ بخاری اور مسلم نے فضائل و مناقب کے باب میں سعد بن زید اور عبدالرحمٰن بن عوف کی فضیلت کے متعلق ایک حدیث بھی نقل نہیں کی (جبکہ دونوں افراد کا تعلق عشرۂ مبشرہ سے ہے)۔

۷۔ جن دس افراد کو عشرۂ مبشرہ کا کہا جاتا ہے ان میں سعد بن مالک شامل نہیں ہیں جبکہ ابوداؤد کی روایت میں ان کا نام موجود ہے۔

۸۔ ترمذی کی روایت میں سعد بن ابی وقاص کا نام موجود نہیں ہے۔

عشرۂ مبشرہ کی روایت سیاست کی ساختہ پرداختہ ہے اور اس سے سیاست کی بو آتی ہے جبکہ صحیح بخاری میں صرف اصحاب ثلاثہ کو جنت کی بشارت کی روایت بیان کی گئی ہے۔

بخاری کی روایت ملاحظہ فرمائیں: ابوموسیٰ اشعری نے کہا کہ آج میں چاہتا ہوں کہ رسول اکرمؐ کا دربان بنوں۔ اسی اثناء میں ابوبکرؓ آئے اور انہوں نے زور سے دستک دی۔ میں نے پوچھا کہ کون ہے؟ انہوں نے کہا ابوبکر ہوں۔ میں نے کہا کہ صبر کرو۔ پھر میں رسول خداؐ کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ یارسول اللہ! ابوبکرؓ اندر آنے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: اسے اندر آنے کی اجازت دو اور اسے جنت کی بشارت دو۔

میں نے ابوبکر سے کہا کہ اندر آجاؤ۔ رسول اکرمؐ تمہیں جنت کی بشارت دیتے ہیں۔

پھر میں اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ایک اور شخص نے دستک دی۔ میں نے پوچھا کہ کون ہے؟ اس نے کہا میں عمرؓ ہوں۔ میں نے کہا کہ صبر کرو۔ پھر میں رسول اکرمؐ کے پاس گیا اور انہیں سلام کیا اور کہا کہ عمر اندر آنے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔

رسول خداؐ نے فرمایا: اسے اجازت دو اور جنت کی بشارت بھی دو۔

میں نے عمر سے کہا کہ اندر آجاؤ۔ رسول اکرمؐ تمہیں جنت کی بشارت دیتے ہیں۔

پھر میں اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا اور دل میں کہنے لگا کہ اگر خدا کو فلاں کی بھلائی مطلوب ہوئی تو وہ اسے ابھی یہاں لے آئے گا۔ پھر اچانک ایک شخص نے دستک دی۔ میں نے پوچھا کہ کون ہے؟ جواب ملا کہ میں عثمان بن عفانؓ ہوں۔ میں نے کہا کہ صبر کرو۔ پھر میں رسول اکرمؐ کی خدمت میں گیا اور کہا کہ عثمانؓ اندر آنے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: اسے اندر آنے کی اجازت دو اور وہ ایک مصیبت سے دوچار ہوگا اسے اس مصیبت کی وجہ سے جنت کی بشارت دو۔

میں واپس آیا اور عثمانؓ سے کہا کہ اندر آجاؤ۔ تم ایک مصیبت سے دوچار ہوگے اس کی وجہ سے پیغمبر اکرمؐ تمہیں جنت کی بشارت دیتے ہیں۔ (صحیح بخاری، ج۵، ص۱۰۔ ج۹، ص۶۹۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل الصحابہ، باب فضائل ابی بکر و مناقب عمر و عثمان، ج۴، ص۱۸۶۸، حدیث۲۹)

بخاری کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ علیؑ ان افراد میں شامل نہیں تھے جنہیں جنت کی بشارت دی گئی تھی۔ لہٰذا انہیں دس بشارت یافتہ افراد میں شامل کرنا صحیح نہیں ہے۔

ان لوگوں کے لئے مقام علیؑ کو پست کر کے دکھانا کوئی مشکل کام نہیں ہے کیونکہ جن لوگوں نے رسول خداؐ کی زندگی میں ان کی توہین کی تھی اور ان کے حضور اپنی جسارت کا مظاہرہ کیا تھا تو ان کے لئے اہلبیت پیغمبرؐ کی توہین وتنقیص انتہائی آسان کام ہے۔

جو لوگ توہین آمیز روایات آنحضرتؐ کی طرف منسوب کرسکتے ہیں اور ان روایات کو دیکھ کر کسی مسلمان کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی تو وہ لوگ اہلبیت پیغمبرؐ کی طرف بھی آسانی سے توہین آمیز روایات منسوب کرسکتے ہیں اور عام مسلمان جو اس قدر بے حس ہیں کہ توہین رسالت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تو وہ توہین اہلبیتؑ کو کیا اہمیت دیں گے؟ عوام کی حالت یہ ہے کہ وہ کسی رد وقدح کے بغیر دشمنی آل محمدؐ پر مبنی روایات کے سامنے سرتسلیم خم کر دیتے ہیں۔

جس معاشرے میں پیغمبر اکرمؐ کی توہین کی جاتی ہو اور جہاں اہلبیت پیغمبرؐ کے متعلق توہین آمیز روایات بیان کی جاتی ہوں تو اس معاشرے میں اہلبیتؑ کے شیعوں اور پیروکاروں کا کون سا احترام ہوگا؟

عشرۂ مبشرہ کی روایت اور اس جیسی بیسیوں روایات جن سے اپنے ممدوح افراد کا قد کاٹھ بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے، ان تمام کوششوں کو مسلم کی اس روایت نے شدید نقصان پہنچایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عشرۂ مبشرہ اور اس جیسی روایات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

مسلم کی مندرجہ ذیل روایات ملاحظہ فرمائیں:

رسول خداؐ نے فرمایا: کوئی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہؐ! کیا آپ بھی؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: جی ہاں! میں بھی۔ جب تک کہ رحمت خداوندی میرے شامل حال نہ ہو۔ (اس وقت تک میں بھی اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں نہیں جاسکتا)۔ (صحیح مسلم، کتاب صفة القیامة والجنة والنار، ج ۴، ص ۲۱۷۰، حدیث ۷۵)

دوسری روایت میں یہ الفاظ وارد ہیں:

رسول خداؐ نے فرمایا: خدا کے قریب ہو جاؤ اور نیک کام کرو لیکن یہ بات جان لو کہ کسی شخص کے اعمال اس کو نجات نہیں دلائیں گے۔

لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہؐ! کیا آپ بھی؟

آپ نے فرمایا: جی ہاں میں بھی۔ جب تک خدا اپنا فضل ورحمت مجھ پر نہ کرے۔ (صحیح مسلم، ج ۴، ص ۲۱۷۰، حدیث ۷۶، وص ۲۱۷۱، حدیث ۷۷)

ایک اور روایت میں مذکور ہے: تم میں سے کسی کے اعمال اسے نہ تو جنت میں لے جائیں گے اور نہ ہی دوزخ سے بچائیں گے اور خود میں بھی اس میں شامل ہوں جب تک رحمت الٰہی شامل حال نہ ہو۔ (صحیح مسلم، ج ۴، ص ۲۱۷۰، حدیث ۷۶، وص ۲۱۷۱، حدیث ۷۷)

اب ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ خدارا ہمیں انصاف سے بتائیں کہ جب آپ کی صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول خداؐ کو بھی اپنے متعلق جنت کا یقین نہیں تھا تو آپ نے دس افراد کی نجات پر کیسے یقین کرلیا اور انہیں جنت کی بشارت کیسے دے دی؟

حضرت عمرؓ بھی عشرۂ مبشرہ میں شامل ہیں، ان کے متعلق بخاری نے لکھا ہے:

جب عمر زخمی ہوئے تو کہنے لگے کہ اے کاش! اگر میرے پاس زمین کے تمام پہاڑوں جتنا سونا ہوتا تو میں خدا کے حضور حاضر ہونے سے پہلے اس کا فدیہ دے کر عذاب الٰہی سے نجات حاصل کرتا۔ (صحیح بخاری، باب مناقب عمر، ج ۵، ص ۱۶)

اب سوال یہ ہے کہ اگر عشرۂ مبشرہ کی روایت صحیح تھی اور حضرت عمرؓ بھی اس جماعت کے ایک فرد تھے تو انہیں اپنی نجات کے متعلق فکرمند ہونے کی کیا ضرورت تھی اور انہیں جزع فزع کرنے کی احتیاج کیوں محسوس ہوئی؟

مسلم لکھتے ہیں کہ رسول خداؐ نے ایک دن خطبہ دیا اور فرمایا:

اے لوگو! تم تنہا اور برہنہ پا محشور کئے جاؤ گے اور اپنے خدا کے حضور پیش کئے جاؤ گے۔ كَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيْدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فَاعِلِيْنَ ○ یعنی جس طرح ہم نے ابتدأ پیدا کیا تھا اسی طرح سے ہم لوٹائیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے اور ہم یقیناً ایسا ہی کریں گے۔

آ گاہ رہو! مخلوقات میں سے جسے سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا وہ ابراہیمؑ ہوں گے۔ آ گاہ رہو! اس وقت میری امت کے کچھ افراد لائے جائیں گے اور انہیں بائیں طرف لے جایا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ پروردگار! یہ میرے صحابی ہیں۔ مجھ سے کہا جائے گا کہ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا بدعات ایجاد کی تھیں؟ پھر میں اس وقت عبد صالح (حضرت عیسیٰؑ) کے الفاظ دہراؤں گا۔ مجھ سے کہا جائے گا کہ جس دن سے تم ان سے جدا ہوئے ہو اسی دن سے یہ جاہلیت اور سابقہ حالت کی طرف پلٹ گئے تھے۔ (صحیح بخاری، ج۶، ص۶۹۔ صحیح مسلم، ج۴، ص۲۱۹۴، حدیث ۵۸)

جو لوگ رسول خداؐ کے بعد الٹے پاؤں پھرے ہوں، انہیں کس بنا پر عادل کہا جاسکتا ہے اور انہیں کس طرح سے جنتی قرار دیا جاسکتا ہے؟

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے متعلق خود یہ کہا تھا: خدا کی قسم! اگر میرا ایک پاؤں جنت میں ہو اور ایک پاؤں باہر ہو تو پھر بھی میں خدا کے مکر (خدا کی پکڑ) سے مطمئن نہیں ہوں گا۔ (طبری، ج۲، سیرت ابن ہشام، کنز العمال، ج۵)

جب حضرت ابوبکرؓ کو اپنے متعلق جنتی ہونے کا یقین نہیں تھا تو ان کے پیروکاروں نے نجانے کس بنا پر انہیں جنتی ہونے کی سند جاری کردی؟

بخاری نے جنت کے دروازوں کی حدیث نقل کی کہ جنت کا ایک دروازہ جہاد کا ہوگا، ایک دروازہ صدقے کا ہوگا اور ایک دروازہ روزے کا ہوگا۔

حضرت ابوبکرؓ نے رسول خداؐ سے کہا: کیا کوئی شخص ایسا بھی ہوگا جسے ان تمام دروازوں سے بلایا جائے؟

رسول خداؐ نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ تم بھی ان افراد میں سے ایک ہوگے۔ (صحیح بخاری، ج۵، کتاب الفضائل الصحابہ، باب فضائل ابی بکر)

ابن حجر نے فقہاء سے نقل کیا: امید خدا سے بھی ہے اور رسول مقبولؐ سے بھی ہے اسی لئے علماء نے اس حدیث کو فضیلت ابوبکر میں شامل کیا ہے۔ (فتح الباری، ج۷، ص۲۱)

مکتب تسنن کے فقہاء نے متن حدیث کو اپنے مفاد میں بدلنے کے لئے تاویلیں کیں

کہ اس حدیث میں لفظ امید، یقین کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور یوں انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے جنتی ہونے یا نہ ہونے کے شبہات کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔

سیدھی سی بات ہے کہ اگر حضرت ابوبکرؓ، پیغمبر اکرمؐ کی نظر میں اتنے ہی بلند و بالا مقام کے مالک ہوتے تو رسول خداؐ انہیں واضح الفاظ میں کہہ دیتے کہ تم بھی ان میں شامل ہوگے اور حضور اکرمؐ اس کی بجائے مبہم الفاظ کبھی ادا نہ کرتے۔

عشرۂ مبشرہ کے افراد کے متعلق ہمارے لئے یہ بحث کرنا ضروری ہے کہ دشمنی آل محمدؐ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ان کی شخصیات کو کتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔

اس بحث کے بعد ہم ایسے صحابہ کے نام بھی پیش کریں گے جو عشرۂ مبشرہ کی فہرست میں شامل نہیں ہیں اور اسی کے ساتھ ہم قارئین سے یہ درخواست کریں گے کہ وہ عشرۂ مبشرہ کے افراد اور کچھ دیگر صحابہ کے فضائل و اعمال کو میزان انصاف پر رکھ کر وزن کریں اور دیکھیں کہ ان میں سے افضل کون ہیں اور مفضول کون ہیں؟

بخاری نے رسول خداؐ سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا:

میرے نزدیک تمام صحابہ میں سے ابوبکرؓ بہتر ہے اور اگر میں خدا کے علاوہ کسی کو دوست بناتا تو ابوبکرؓ کو ہی بناتا لیکن اسلامی اخوت و مودت اس کے لئے مخصوص ہے۔ ابوبکر کے دروازے کے علاوہ مسجد میں کھلنے والے تمام لوگوں کے دروازوں کو بند کردو۔ (صحیح بخاری، ج۵، ص۴، کتاب کتاب فضل ابی بکر)

بخاری کی اس روایت نے فقہاء میں شدید اختلاف پیدا کیا ہے کیونکہ بہت سے فقہاء اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتے کہ حضرت ابوبکرؓ کا گھر مسجد کے قریب تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا گھر مدینہ سے باہر سنح نامی محلے میں واقع تھا۔ اسی لئے بعض حضرات نے اس حدیث کی تاویل کرتے ہوئے کہا کہ دروازے سے مراد خلافت ہے اور بند کرنے سے مراد خلافت کی تمنا کرنا ہے۔

اس توجیہ سے فقہاء نے اپنے تئیں مخالفین ابوبکر کی طرف سے متن حدیث پر کئے جانے والے سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے اور حضرت ابوبکرؓ کے مخالفین کا راستہ روکنے کی سعی کی ہے۔

ابن حجر نے ابن حبان کی تاویل نقل کرتے ہوئے لکھا:

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابوبکرؓ ہی رسول خداؐ کے خلیفہ تھے کیونکہ رسول خداؐ نے جب لوگوں کے دروازے بند کرنے کا حکم دیا تو آپ کے اس حکم سے مطلب مکمل ہوگیا اور آنحضرتؐ نے اپنے ان الفاظ سے دوسروں کی طرف سے خلافت کی تمنا اور توقع کا خاتمہ کردیا۔

اور مزید یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ ان کا گھر مدینہ سے باہر سخ میں تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس روایت کی اسناد ضعیف ہیں اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان کا ایک گھر سخ میں ہو اور دوسرا گھر مسجد نبوی سے متصل ہو۔ (فتح الباری، ج ۷، ص ۷ اور ۲۱)

بخاری کی یہ روایت ازروئے سند بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ بخاری نے اسے دو طریقوں سے نقل کیا ہے:

(۱) فلیح بن سلیمان نے ابو سعید خدری سے روایت کی۔ (فتح الباری، ج ۱، ص ۴۴۲ اور ۴۴۳)

(۲) عکرمہ نے ابن عباسؓ سے روایت کی۔ (فتح الباری، ج ۱، ص ۴۴۲ اور ۴۴۳)

اس روایت کے دونوں راوی یعنی فلیح اور عکرمہ کا تعلق خوارج سے تھا اور وہ مسلمانوں کے قتل کو جائز سمجھتے تھے اور تمام صحابہ سے دشمنی رکھتے تھے اسی لئے فقہائے اہلسنت اور علم الرجال کے ماہرین نے ان کی مذمت کی ہے۔ (میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۹۳ و ۹۷ و ۳۶۵)[۱]

حضرت ابوبکرؓ کے دروازے کھلے رکھنے کی روایت دراصل اُس حدیث صحیح کے جواب میں تراشی گئی جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کے دروازے کے علاوہ باقی تمام لوگوں کے دروازوں کو بند کردیا تھا۔ (ترمذی، ج ۵، حدیث ۳۷۳۲۔ کتاب المناقب مسند احمد، ج ۱، ص ۱۷۵)

بہرنوع ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کے فضائل چھپانے کے لئے

۱۔ ابن معین لکھتے ہیں کہ فلیح ثقہ نہیں ہے۔ احمد نے کہا کہ وہ خوارج کے فرقے صفریہ کے عقائد رکھتا تھا۔ عکرمہ ابن عمر نے تکذیب کی تھی اور اسکے علاوہ ابن مسیب، یحییٰ بن سعید

اس طرح کی حدیث سازی کی گئی تھی۔

بخاری نقل کرتے ہیں کہ عمرو بن العاص نے پیغمبر اکرمؐ سے پوچھا: تمام لوگوں میں سے آپ کو زیادہ محبت کس سے ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: عائشہؓ سے۔ اس نے پوچھا کہ مردوں میں سے آپ کو کون زیادہ محبوب ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کا باپ۔ اس نے پوچھا کہ ان کے بعد کون ہے؟ آپ نے فرمایا: عمر۔ پھر اس کے بعد آنحضرتؐ نے بہت سے لوگوں کے نام لئے۔ (صحیح بخاری، ج ۵، ص ۶، باب فضل ابی بکر)

اس روایت کے رد کرنے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ اس روایت کا راوی عمرو بن العاص ہے جو کہ معاویہ کا دست راست اور امیرالمؤمنین کا بدترین دشمن تھا اور جنگ صفین میں اسی نے نیزوں پر قرآن مجید بلند کرنے کا مشورہ دیا تھا۔[۱]

(روایت کے الفاظ سے تھوڑا سا ہٹ کر سوچیں کہ) کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ کسی شخص سے کوئی غیر شخص پوچھے کہ آپ زیادہ محبت کس سے کرتے ہیں تو وہ جواب میں کہے مجھے اپنی بیوی سے زیادہ محبت ہے۔ اس طرفہ جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو پیغمبر اکرمؐ نے سوال کو اچھی طرح سمجھا نہیں تھا یا یہ کہ آپ بی بی عائشہؓ کے عاشق تھے اور ہر وقت بی بی کا خیال آپ کے اعصاب پر سوار رہتا تھا۔

ہمیں معلوم ہے کہ اہلسنت کا مقصد دوسرا مفہوم ہی ہے کیونکہ وہ اس عشق و محبت کے تعلقات کا رخ بی بی کے والد کی طرف موڑنا چاہتے ہیں۔

رسول خداؐ کی زبانی حضرت ابوبکرؓ کے اس طرح کے فضائل بیان کرنے کا واحد مقصد حضرت علیؑ کو چھوٹا ثابت کرنا ہے۔

راویوں نے خلفائے ثلاثہ کے فضائل میں ایسی بے سروپا روایات وضع کی ہیں اور ایسے پھس پھسے قسم کے واقعات تخلیق کئے ہیں کہ کوئی شخص بھی انہیں سن کر ہرگز مطمئن نہیں ہوتا۔ اسی لئے علمائے تسنن نے یہ فتویٰ جاری کردیا کہ بخاری اور مسلم کی روایات پر بحث و تنقید کرنا

۱۔ السیف والسیاسۃ فی الاسلام، ص ۱۲۹ اور کتب تاریخ بالخصوص طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۳۲ پر عمرو

حرام ہے۔ اس فتوے سے امت اسلامیہ کے عقول پر تالے ڈال دیئے گئے۔

اب ذرا پھس پھسی روایات کی ایک ہلکی سی جھلک ملاحظہ فرمائیں:

بخاری نے ابوہریرہ سے نقل کیا کہ میں نے رسول خداؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

ایک چرواہا اپنی بھیڑوں کو چرا رہا تھا کہ اچانک ایک بھیڑیے نے حملہ کردیا اور ایک بھیڑ کو اٹھا کر لے گیا۔ چرواہے نے اس کا تعاقب کیا اور اس سے بھیڑ چھڑا لی۔ پھر اچانک بھیڑیے نے چرواہے کی طرف رخ کر کے کہا کہ بھیڑوں پر حملہ آور ہونے والے درندوں کے لئے ایک دن مقرر ہے اور آج میرے علاوہ ان کا کوئی چرواہا نہیں ہے۔

اسی طرح ایک دن کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے بیل پر سامان لادا اور بیل کو لے کر چل پڑا۔ بیل نے اس شخص کی طرف منہ کر کے کہا کہ مجھے سامان اٹھانے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ ہل چلانے کی غرض سے پیدا کیا گیا ہے۔ لوگوں نے کہا! سبحان اللہ۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: میں اس داستان پر ایمان رکھتا ہوں اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ (صحیح بخاری، ج۵، ص۶، کتاب فضل ابی بکر)

خدا گواہ ہے کہ اس داستان کو سن کر عقل محوِ حیرت رہ جاتی ہے اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر اس داستان طرازی کی غرض و غایت کیا ہے؟ اور آخر اس داستان میں حضرت ابوبکرؓ کی کون سی فضیلت مضمر ہے؟ اور بھیڑیے اور بیل کی گفتگو پر ایمان کے لئے رسول خداؐ نے اپنے آپ کو اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کو ہی کیوں مخصوص کیا؟ کیا شیخین کے علاوہ باقی مسلمان آنحضرتؐ کی زبانی یہ واقعات سن کر ایمان لانے پر آمادہ نہیں تھے؟

علمائے اہلسنت نے دراصل یہ طرفہ روایات بنا کر لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ رسول خداؐ کی اس بات کو کسی نے بھی قبول نہیں کیا اور ہاں اگر اس کو کسی نے قبول کیا تو وہ صرف ابوبکر و عمر تھے۔ اگر گہرائی سے اس روایت کا جائزہ لیا جائے تو روایت تراشنے والے نے بالواسطہ طور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ علیؑ سمیت تمام سامعین اس بات پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں تھے۔

اس طرفہ روایت کا عجیب پہلو یہ ہے کہ مسلم کی روایت میں مذکور ہے کہ جب رسول خداؐ

نے بھیڑیے اور بیل کا واقعہ سنایا تو اس وقت حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ دربار رسالت میں موجود نہیں تھے۔ (صحیح مسلم، ج۴، ص۱۸۵۷، حدیث ۱۳۔ کتاب فضائل الصحابہ، باب من فضائل ابی بکر)

بخاری لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ میں تنازعہ پیدا ہوا۔ ابوبکر، رسول خداؐ کی خدمت میں اس حال میں حاضر ہوئے کہ انہوں نے اپنے لباس کے گوشے کو بلند کیا ہوا تھا اور ان کے زانو ظاہر تھے۔ پیغمبر خداؐ نے فرمایا کہ تمہارا دوست کچھ دلیری دکھا کر آیا ہے۔

ابوبکر نے سلام کیا اور کہا: یارسول اللہؐ! میرے اور فرزند خطاب کے درمیان ایک چیز کا جھگڑا تھا۔ میں نے جلدی سے اس پر حملہ کیا لیکن میں فوراً پشیمان ہوگیا۔ میں نے اس سے معافی کی درخواست کی اس نے میری درخواست رد کردی۔ اب میں معافی کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔

پیغمبر اکرمؐ نے تین بار فرمایا: ابوبکر! خدا تجھے معاف کرے۔

اس کے بعد عمر پشیمان ہوئے اور وہ ابوبکر کے گھر گئے اور گھر والوں سے پوچھا کہ کیا ابوبکر گھر میں ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ وہ موجود نہیں ہیں۔ اس کے بعد عمر پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ (غصہ کی شدت سے) پیغمبر کا چہرہ متغیر ہوگیا اور اس صورتحال کو دیکھ کر ابوبکر بھی پریشان ہوگئے۔ پھر عمر دوزانو ہو کر پیغمبر اکرمؐ کے سامنے بیٹھ گئے اور دو مرتبہ کہا: یارسول اللہؐ! میں نے ظلم کیا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف روانہ کیا۔ تم نے کہا کہ تو جھوٹ کہتا ہے لیکن ابوبکر نے کہا کہ تو سچ کہتا ہے اور اس نے اپنی دولت اور جان سے میری مدد کی۔ کیا تم لوگ میرے لئے میرے دوست کو باقی نہیں رہنے دوگے؟ اور میرے دوست سے تم ہاتھ نہیں اٹھاؤ گے؟

راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد کسی نے ابوبکر کو اذیت نہ دی۔ (صحیح بخاری، ج۵، ص۶، باب فضل ابی بکر)

اس روایت سے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی کوئی فضیلت ثابت نہیں ہوتی۔ اس روایت سے فضیلت کی بجائے ان کی توہین لازم آتی ہے کیونکہ روایت کے لب ولہجہ سے پتا چلتا

ہے کہ ان دو حضرات کے درمیان اختلاف صرف الفاظ تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ دست و گریبان ہونے تک نوبت جا پہنچی تھی۔

روایت کرنے والوں نے اختلاف کی وجہ تو بیان نہیں کی اور شارحین بخاری نے بھی اپنی شروح میں متنازعہ امر کو بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔ البتہ روایت سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کی توہین کی تھی اور عمر نے بھی ان کی توہین کی تھی اور اس سے شیخین کی سبکی ثابت ہوتی ہے۔

روایت کرنے والوں نے اتنا ضرور بیان کیا کہ رسول خداؐ نے حضرت ابوبکرؓ کی طرفداری کی اور عمر پر ناراض ہوئے۔ اس طرح سے انہوں نے عمر کی قیمت پر حضرت ابوبکرؓ کی آبرو کو محفوظ کرنے کی کوشش کی اور عمر سے بے اعتنائی کرنے سے مقام ابوبکر کو بلند و بالا ثابت کرنے کے لئے جاں فشانی کی گئی۔

حضرت عمرؓ

بخاری نے ابن عباسؓ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

جب حضرت عمرؓ زخمی ہوئے اور انہیں چارپائی پر لٹایا گیا، میں اس وقت لوگوں کے درمیان کھڑا تھا کہ اچانک میرے کندھے پر دو ہاتھ آئے اور کسی نے میرے پیچھے کھڑے ہو کر کہا: خدا تجھ پر رحمت کرے اور مجھے امید ہے کہ خدا تجھے تیرے دو دوستوں کے ساتھ محشور کرے گا کیونکہ ہم نے کئی مرتبہ رسول اکرمؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اور ابوبکرؓ و عمرؓ اکٹھے تھے۔ یا میں نے اور ابوبکرؓ و عمرؓ نے یہ کام کیا۔ یا میں اور ابوبکر و عمر گئے۔ لہٰذا میں امید کرتا ہوں کہ خدا تجھے ان دونوں کے ساتھ محشور کرے گا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ علی بن ابی طالبؑ تھے۔ (صحیح بخاری، ج ۵، ص ۱۴۔ کتاب فضائل الصحابہ، باب مناقب عمر بن الخطاب)

یہ روایت بھی سابقہ روایات کی طرح سے ہے اور ان روایات کا ماحصل یہ ہے کہ شیخین کی خلافت کو حضرت علیؑ کی زبان سے تسلیم کرایا جائے اور ان کے کارناموں کو حضرت علیؑ کی زبانی سراہا جائے۔

علمائے اہلسنت نے ان بزرگوں کو ہر شک و شبہ سے بلند رکھنے کے لئے اس طرح کی روایات ابن عباسؓ، ابوسعید خدریؓ، جابر بن عبداللہ انصاریؓ، عمارؓ بن یاسرؓ، محمد بن حنفیہؒ اور دوسرے شیعیان علیؑ کی زبانی نقل کی ہیں۔

حضرت عمرؓ کے فضائل حضرت ابوبکرؓ کے فضائل کی مانند ہیں اور فضائل کی اکثر روایات میں دونوں بزرگوں کا نام ایک ساتھ بیان ہوا ہے اور دونوں بزرگوں کو یکجا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دونوں بزرگ ایک ہی قدر و منزلت کے مالک تھے۔

لیکن اس نتیجے کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دونوں بزرگ یکساں فضائل کے مالک تھے تو حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عمرؓ پر فوقیت کیوں دی گئی؟

حقیقت یہ ہے کہ دونوں بزرگوں کو فضائل میں ایک دوسرے سے مربوط رکھنا ایک سیاسی چال کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

وفات پیغمبرؐ کے بعد کے حالات کا جائزہ لینے سے ایک محقق انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مذکورہ دو بزرگوں کو باقی اصحاب رسول پر کوئی فوقیت حاصل نہیں تھی اور اگر بالفرض انہیں باقی صحابہ پر کوئی امتیاز حاصل ہوتا تو سقیفہ بنی ساعدہ کے اجلاس میں لوگ ان سے اختلاف نہ کرتے۔ (تاریخ طبری، ج ۳، ص ۲۱۸۔۲۲۳۔ کتاب السیف والسیاسۃ)

حضرت ابوبکرؓ نے برسراقتدار آنے پر ایک خطبہ دیا تھا جس میں یہ الفاظ بھی شامل تھے: مجھے تمہارا حاکم مقرر کیا گیا ہے جبکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ (تاریخ طبری، ج ۳، ص ۲۱۰)

حضرت رسول اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ کی زندگی میں حضرت عمرؓ کے کردار سے لوگ ناخوش تھے اور جب حضرت ابوبکرؓ نے انہیں اپنا جانشین مقرر کیا تو بہت سے صحابہ نے ان پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا: آپ اس شخص کو ہمارا حاکم بنا کر جارہے ہیں جو کہ تندخو، بداخلاق اور سخت دل ہے۔ (تاریخ طبری، ج ۳، ص ۴۳۳۔ کنزالعمال، ج ۵، حدیث ۱۴۱۷۸)

یہ دیکھ کر انسان کو تسلی ہوتی ہے کہ دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے کی حکومت کو سند جواز سے نوازا تھا اور اگر دونوں افراد مل کر کام نہ کرتے تو ان میں سے تنہا کوئی بھی اقتدار حاصل نہیں کرسکتا تھا اور دوسروں کی بہ نسبت ان دونوں شخصیات نے بنی امیہ کی حکومت کے لئے راہ ہموار کی تھی۔ (السیف والسیاسۃ)

اس مفہوم کی زیادہ سے زیادہ وضاحت کی غرض سے ہم فضائل عمر کی چند روایات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

بخاری نے اپنی اسناد سے جابر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میں جنت میں وارد ہوا۔ اچانک وہاں میں نے ابوطلحہ کی بیوی رمیصا کو دیکھا۔ میں نے کچھ آواز سنی تو کہا کون ہے؟ کہا گیا کہ یہ بلال ہے

پھر اچانک میں نے ایک محل دیکھا جس میں ایک زندہ سلامت خوبصورت عورت دکھائی دی۔ میں نے کہا: یہ کس کی بیوی ہے؟ کہا گیا کہ یہ عمر کی بیوی ہے۔ میں نے محل میں داخل ہونا چاہا اور اسے دیکھنے کا ارادہ کیا لیکن عمر مجھے تیری غیرت کا خیال آگیا اسی لئے میں وہاں داخل ہونے سے باز رہا۔

عمر نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! میں آپ کے متعلق تو غیرت نہیں کروں گا۔ (صحیح بخاری، ج ۵، ص ۱۲، باب مناقب عمر)

اس روایت کو پڑھ کر ہر عقل مند اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا مقام رسول اکرمؐ کے مقام سے بلند و بالا ہے کیونکہ جب رسول اکرمؐ نے ان کے محل کو دیکھا تو آپ حیرت زدہ رہ گئے اور اسے دیکھنا چاہا لیکن عمر کی غیرت کو یاد کرکے آپ گھبرا گئے اور اندر قدم رکھنے کی جرأت نہ کی۔

۱۔ کیا پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں ایسی بات کا نقل کرنا صحیح ہے؟

۲۔ کیا جنت و آخرت میں بھی دنیاوی غیرت موجود ہوگی؟

اس حدیث کو نظرانداز کرکے ہم ایک دوسری روایت کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں اور اس روایت کو بھی بخاری نے نقل کیا ہے۔

رسول خداؐ نے فرمایا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میں دودھ پی رہا ہوں اور میں نے اتنا دودھ پیا کہ میرے ناخنوں سے بہنے لگا۔ پھر میں نے وہ دودھ عمر کو پینے کے لئے دیا۔

صحابہ نے آنحضرتؐ سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی تو آپ نے فرمایا: اس سے علم مراد ہے۔ (صحیح بخاری، ج ۵، ص ۱۳)

اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت عمرؓ تمام اصحاب حتیٰ کہ حضرت ابوبکرؓ سے بھی زیادہ عالم تھے۔ لیکن اہلسنت اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ اس کی بجائے ان کا موقف یہ ہے کہ حضرت عمرؓ باقی صحابہ کی بہ نسبت بڑے فقیہ تھے لیکن حضرت ابوبکرؓ سے علم میں کم تھے۔

آیئے دیکھیں حقیقت کیا ہے؟ اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے بعض مقامات پر

اجتہاد کر کے لوگوں کو مشکلات میں مبتلا کیا تھا اور مسائل دین کے حوالے سے آپ اکثر اشتباہ میں مبتلا رہتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں علم و دانش کا کوئی بڑا حصہ نصیب نہیں ہوا تھا۔ (النص والاجتہاد ۔ فقہ الهزيمة)

اگر حضرت عمرؓ فقیہ ہوتے تو رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد تلوار لے کر مدینے کی گلیوں میں یہ اعلان نہ کرتے کہ رسول اکرمؐ کی وفات نہیں ہوئی۔ آپ حضرت موسیٰ کی طرح چند دنوں کے لئے اپنے پروردگار کے پاس گئے ہیں اور عنقریب واپس آجائیں گے اور منافقین کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے۔

بہت سے لوگوں نے انہیں سمجھانا چاہا لیکن وہ باز نہ آئے اور آخر میں حضرت ابوبکرؓ کے سمجھانے پر باز آئے۔ (صحیح بخاری، ج ۵، ص ۹، باب فضل ابی بکر)[1]

اگر حضرت عمرؓ فقیہ ہوتے تو حضرت علیؑ سے ہرگز یہ نہ کہتے: اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ (تاریخ عمر بن الخطاب، ابن جوزی، ص ۱۴۴۔ طبقات ابن سعد، ج ۲، ص ۳۳۹)

اگر حضرت عمرؓ فقیہ ہوتے تو حق مہر کے مسئلے میں انہیں ایک عورت لاجواب نہ کرتی اور انہیں برسر منبر یہ نہ کہنا پڑتا کہ عمر نے غلط کہا اور عورت نے ٹھیک کہا۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی)

اگر حضرت عمرؓ فقیہ ہوتے تو بزرگ صحابہ کو اپنے پاس مدینے میں ٹھہرنے کے لئے مجبور نہ کرتے اور انہیں یہ نہ کہتے کہ مجھے فتوے کے لئے تمہاری مدد کی ہر وقت ضرورت ہے۔[2]

بخاری نے نقل کیا کہ قیس نے عبداللہ سے روایت کی کہ جس دن سے عمر اسلام لائے اس دن سے ہمارے حالات اچھے ہو گئے۔ (صحیح بخاری، ج ۵، ص ۱۴ و ۱۳، باب مناقب عمر)

۱۔ ابن جوزی کی کتاب تاریخ عمر بن الخطاب، ص ۱۴۴۔ طبقات ابن سعد، ج ۲، ص ۳۳۹۔
حضرت عمرؓ ہمیشہ کہا کرتے تھے: "ہم سب سے زیادہ احکام دین کو علیؑ سمجھتے ہیں۔"
سعید بن مسیب نے کہا کہ عمر کہا کرتے تھے: "اللہ مجھے اس مشکل کے لئے زندہ نہ رکھے جس کے حل کے لئے علیؑ موجود نہ ہوں۔"

۲۔ تاریخ عمر بن الخطاب ابن جوزی۔ حضرت عمرؓ نے صحابہ کبار کو مشاورت کے بہانے مدینے میں عملی طور پر نظر بند کیا ہوا تھا اور اس کے علاوہ ان کے کچھ دیگر مقاصد بھی تھے۔

عزت اسلام کو حضرت عمرؓ سے مربوط کرنے والے افراد درحقیقت حضرت علیؑ کے مقام کو گھٹا کر لوگوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی موجودگی کے باوجود اسلام کو عزت و قوت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ البتہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے اسلام کو عزت و شوکت نصیب ہوئی۔

ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ رواۃ نے یہ بات ایک صحابی سے نقل کی ہے اور اسے رسول اکرمؐ سے منسوب نہیں کیا۔

آنحضرتؐ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی وجہ سے اسلام کو کوئی خاص عزت و شوکت نہیں ملی تھی کیونکہ غزوہ احد میں آپؓ نے فرار اختیار کیا تھا اور جب جنگ خندق میں عمرو بن عبدود نے انہیں اپنے مقابلے کی دعوت دی تھی تو انہوں نے اس سے لڑنے کی جرأت نہ کی اور حضرت علیؑ نے اس سے مقابلہ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارا۔ حضرت عمرؓ خیبر کو فتح کرنے میں نہ صرف ناکام ہوئے بلکہ راہ فرار اختیار کی۔ حضرت علیؑ نے خیبر فتح کیا۔

اب ذرا ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیں:

بخاری نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ، پیغمبر خداؐ کے پاس آئے اور دیکھا کہ آپ قریش کی عورتوں سے گفتگو کر رہے تھے اور جب حضرت عمرؓ پہنچے تو عورتیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور انہوں نے حجاب اوڑھ لیا۔

حضرت عمرؓ نے ان سے کہا: اپنی ذات سے دشمنی کرنے والیو! مجھ سے تو ڈر رہی ہو لیکن پیغمبر خداؐ سے نہیں ڈرتیں؟

عورتوں نے کہا: جی ہاں! کیونکہ تو تند مزاج اور بداخلاق ہے جبکہ نبی اکرمؐ ایسے نہیں ہیں۔
پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: اے فرزند خطاب! شیطان تجھے جس راستے پر چلتا ہوا دیکھتا ہے تو وہ اس راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ (صحیح بخاری، ج ۵، ص ۱۴ و ۱۳، باب مناقب عمر)

اس حدیث سے حضرت عمرؓ کی مدح کی بجائے مذمت ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس روایت سے حضرت عمرؓ کی تندخوئی اور درشت مزاجی پر مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے اور روایت کے

لب و لہجے سے محسوس ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی درشت خوئی کی داستانیں صرف مردوں تک ہی محدود نہیں تھیں بلکہ عورتوں کی زبانوں پر بھی ان کی تندخوائی کی داستانیں جاری تھیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ان کے منہ پر یہ کبھی نہ کہتیں کہ تم بداخلاق اور تندخو ہو۔

اس روایت کو دیکھ کر ناطقہ سربگریبان رہ جاتا ہے کہ عورتوں کی بات سن کر رسول خداؐ نے ان سے فرمایا کہ شیطان جس راستے پر تجھے چلتا ہوا دیکھتا ہے تو وہ اپنا راستہ بدل لیتا ہے۔

اس واقعے کا شیطان سے بھلا کیا ربط ہے؟

کیا کہیں ایسا تو نہیں کہ رسالت مآبؐ نے عورتوں کو شیطان قرار دیا ہو جو حضرت عمرؓ کو دیکھ کر بھاگنے پر مجبور ہوگئی تھیں۔ اسی لئے رسول خداؐ نے عمر اور اس کے شیطان کا ذکر کیا ہو؟

روایت کے الفاظ دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اس روایت کے تراشنے والا راوی نوآموز تھا اسی لئے حدیث سازی کے پورے جوہر دکھانے میں ناکام ہوگیا اور اگر وہ ان دو واقعات کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا اور ہر ایک کے لئے جدا جدا روایت وضع کرتا تو اس کی بات میں اچھا خاصا وزن پیدا ہوسکتا تھا۔

ذیل میں صحیح مسلم کی ایک روایت پیش خدمت ہے جس سے ہمارے کرم فرماؤں کی روایات کی تکذیب ہوتی ہے اور ان کی ساختہ پرداختہ احادیث کی قلعی کھل جاتی ہے:

مسلم نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا:

ایک رات رسول اکرمؐ گھر سے باہر نکلے جس پر میری زنانی غیرت جاگ اٹھی۔ جب آپ واپس آئے تو میری حالت دیکھ کر فرمایا: عائشہؓ تجھے کیا ہوا ہے؟ کیا میرے متعلق تیری غیرت جاگ اٹھی ہے؟

میں نے کہا: جی ہاں! مجھ جیسی عورت کو آپ جیسے مرد کے متعلق غیرت کرنی چاہئے۔

آپ نے فرمایا: کیا تیرا شیطان تیرے پاس آیا ہے؟

میں نے پوچھا: کیا میرا بھی ایک شیطان ہے؟

آپ نے فرمایا: جی ہاں۔

میں نے پوچھا: تو کیا ہر انسان کا ایک شیطان ہوتا ہے؟

آپ نے فرمایا: جی ہاں۔

میں نے پوچھا: یارسول اللہؐ! کیا آپ کا بھی ایک شیطان ہے؟

آپ نے فرمایا: جی ہاں! مگر اللہ نے مجھے اس پر مدد عطا فرمائی اور وہ مسلمان ہوگیا۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ وارد ہیں:

وہ (میرا شیطان) مجھے اچھائی کے علاوہ اور کسی چیز کا حکم نہیں دیتا۔ (صحیح مسلم، ج۴، ص۲۱۶۸، حدیث ۷۰۔ کتاب صفة القیامة والجنة والنار، باب تحریش الشیطان)

صحیح مسلم کی روایت پڑھ کر ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب ہر انسان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اور ام المومنین کے پاس بھی شیطان ہوتا تھا اور حد یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کے پاس بھی شیطان ہوتا تھا تو اس قاعدے قانون سے حضرت عمرؓ مستثنیٰ کیوں ہیں؟

جو شیطان پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ رہتا تھا اس کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کی مدد کی تھی اور وہ مسلمان ہوگیا تھا لیکن حضرت عمرؓ کے شیطان کے خلاف ان کی کس نے مدد کی تھی کہ ان کا شیطان انہیں دیکھ کر بھاگنے لگ جاتا تھا؟

حضرت عمرؓ کی فضیلت کی ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیں:

بخاری ابوہریرہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: تم سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے اشخاص ہوتے تھے جن پر وحی نازل ہوتی تھی حالانکہ وہ نبی نہیں ہوتے تھے اور اگر اس امت میں ایسا کوئی فرد موجود ہے تو وہ بس عمر ہے۔ (صحیح بخاری، ج۵، ص۱۵، باب مناقب عمر)

حضرت عمرؓ کی دینی دانش مندی کا مطالعہ کیا جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ اس روایت میں جھوٹ سے کام لیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ خطیب، حکیم اور فلاسفر قسم کے انسان نہیں تھے اگر بالفرض وہ ایسے ہوتے تو لوگ انہیں رسول اکرمؐ کی وفات کے وقت اپنا حاکم مقرر کر لیتے اور یوں حضرت عمرؓ کو حضرت ابوبکرؓ کی حکومت کی راہ ہموار کرنے اور ان کے مخالفین سے جنگ کرنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی۔

احمد بن حنبل، ترمذی اور ابن حبان نے نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا۔

ابن حجر لکھتے ہیں: نبی اکرمؐ نے حضرت عمرؓ کو اس خصوصیت سے اس لئے نوازا کہ پیغمبر اکرمؐ کی زندگی میں کئی بار قرآن مجید نے ان کی رائے کی توثیق کی تھی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ میں نبوت کی صلاحیت موجود تھی لیکن ختم نبوت کی وجہ سے وہ نبی بنتے بنتے رہ گئے تھے تو ان کی موجودگی میں حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ کیوں بنایا گیا؟ (فتح الباری، ج ۷، ص ۴۱)

ویسے بھی یہ سب کہنے کی باتیں ہیں اور پیغمبر اکرمؐ ایسے کلمات کہہ ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ آپ جانتے تھے کہ آپ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔

مسلم نے حضرت عمرؓ کی زبان سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

تین امور میں ہم نے اپنے پروردگار سے موافقت کی: (۱) مقام ابراہیم (۲) حجاب (۳) اسیران بدر۔ (صحیح مسلم، ج ۴، ص ۱۸۶۵، حدیث ۲۴۔ کتاب فضائل الصحابہ۔ باب **من فضائل عمر بن الخطاب**)

ابن حجر لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے جملے "تین امور میں خدا نے میرے ساتھ موافقت کی" کا مطلب یہ ہے کہ تین بار قرآن مجید نے میری رائے کی تصدیق کی۔ حضرت عمرؓ نے ازراہ ادب یہ نہیں کہا کہ تین امور میں اللہ نے میری رائے کی موافقت کی بلکہ انہوں نے یہ کہا کہ تین امور میں ہم نے اللہ سے موافقت کی۔ (فتح الباری، ج ۱، ص ۴۰۱)

اس گفتگو کو سادہ الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید حضرت عمرؓ کی خواہش کے مطابق نازل ہوا۔ اگر یہی بات سچ ہے تو اس کا مقصد تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ، پیغمبر اکرمؐ پر فوقیت رکھتے تھے اور اگر قرآن حضرت عمرؓ کی خواہش پر اترتا تھا تو قرآن کی اہمیت کیا رہ جائے گی اور اس پر کون اعتماد کرے گا؟

نصوص نبوی سے اس بات کی ہرگز تائید نہیں ہوتی کیونکہ قرآن مجید اللہ کے فرمان سے پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوتا تھا اور آپ اس کی تبلیغ فرماتے تھے اور پیغمبر اکرمؐ کو بھی یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ ان پر خدا کی طرف سے کون سا حکم نازل ہونے والا ہے۔ اگر موافقت کی بات ہی ہوتی تو پیغمبر اکرمؐ حضرت عمرؓ کی نسبت اس کے زیادہ مستحق تھے۔

مسلم لکھتے ہیں: جب رئیس المنافقین عبداللہ بن سلول کی موت واقع ہوئی تو اس کا بیٹا عبداللہ، پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے درخواست کی کہ آپ اس کے کفن کے لئے اپنا پیراہن عطا فرمائیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے اپنا پیراہن عطا کیا۔ پھر اس نے آپ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی۔ رسول اکرمؐ جنازہ پڑھنے کے لئے اٹھے تو حضرت عمرؓ نے رسول اکرمؐ کا کرتہ پکڑ لیا اور ناراض ہو کر کہا: یارسول اللہؐ! کیا آپ اس کی نماز جنازہ پڑھتے ہیں جبکہ آپ کا خدا آپ کو اس کی نماز جنازہ سے منع کر چکا ہے؟

رسول اکرمؐ نے فرمایا: اللہ نے مجھے اختیار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ خواہ آپ ان کے لئے مغفرت طلب کریں یا نہ کریں اور اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی مغفرت طلب کریں تو بھی خدا انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا اور میں ستر سے بھی زیادہ مرتبہ ان کے لئے مغفرت طلب کروں گا۔

حضرت عمرؓ نے کہا: وہ منافق ہے۔

پھر رسول اکرمؐ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی جس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ۝ (سورۂ توبہ: آیت ۸۴) آپ ان میں سے کسی مرنے والے کی نماز جنازہ نہ پڑھیں اور نہ ہی اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔ (صحیح مسلم، ج ۴، ص ۱۸۶۵، حدیث ۲۵۔ فضائل عمر)

یہ روایت بہت سے خطرناک مسائل کی طرف اشارہ کرتی ہے جن سے حضرت عمرؓ کی فضیلت کی بجائے شرعی طور پر انہیں سختی میں مبتلا کرتی ہے۔

اہلسنت اس روایت کے ذریعے سے حضرت عمرؓ کی فضیلت ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ اس سے رسول اکرمؐ کی توہین ہوتی ہے۔

اس روایت سے انہوں نے حضرت عمرؓ کی رائے کی قرآن سے موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس روایت سے جہاں حضرت عمرؓ کی موافقت ثابت ہوتی ہے وہاں نعوذ باللہ رسول اکرمؐ کی جہالت ثابت ہوتی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ رسول اکرمؐ کو خدا کی طرف سے ممانعت کا علم نہیں تھا اور حضرت عمرؓ نے انہیں اس کی یاددہانی کرائی۔

۲۔ یاددہانی کے باوجود رسول اکرمؐ قرآن اور حکم قرآن کی مخالفت پر تلے رہے۔

۳۔ حضرت عمرؓ نے آپ کے لباس کو کھینچ کر آپ کو خدا کے فرمان کی خلاف ورزی سے بچانے کی کوشش کی۔

۴۔ پیغمبر اسلامؐ نے نعوذباللہ قرآن کو بازیچۂ اطفال بنایا اور اپنی من مانی تاویل کرتے ہوئے کہا کہ کیا ہوا اللہ نے کہا ہے کہ "اگر آپ ستر بار بھی ان کے لئے مغفرت طلب کریں تو بھی خدا انہیں معاف نہیں کرے گا" میں ستر سے زیادہ مرتبہ ان کے لئے مغفرت طلب کروں گا۔

۵۔ (اس مسئلے میں جیت حضرت عمرؓ کی ہوئی) اور آخرکار حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق قرآن نازل ہوا۔

اس واقعے کا یہ پہلو دیکھ کر انسان کو تعجب اور شک پیدا ہوتا ہے کہ روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے رسول اکرمؐ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ کو اس کی نماز جنازہ پڑھنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اللہ آپ کو منع کرچکا ہے۔ پھر رسول اکرمؐ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ پر آیت نازل فرمائی کہ آپ کسی منافق کی نماز جنازہ نہ پڑھیں۔

یہ آیت تو جنازہ پڑھنے کے بعد نازل ہوئی مگر حضرت عمرؓ کے پاس کون سے ذرائع تھے جن سے انہوں نے معلوم کرلیا تھا کہ اللہ نے اپنے حبیب کو منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع کیا ہے تو کیا حضرت عمرؓ غیب کا علم رکھتے تھے یا وحی کے ساتھ ان کا کوئی خاص تعلق تھا؟

جی ہاں! حضرت عمرؓ کی اس طرح کی جسارت آمیز روایات ان کی قدر و منزلت میں اضافہ کی بجائے کمی کا سبب ہیں کیونکہ اس بات کو کسی بھی طرح سے قبول نہیں کیا جاسکتا کہ ایک صحابی تلخ و تند لہجے میں رسول اکرمؐ پر اعتراض کرے جبکہ خدا کے اوامر و نواہی کا تعلق رسول اکرمؐ

کی ذات سے تھا اور آپ خدائی احکام کو دوسروں سے بہتر جانتے تھے اس کے باوجود ایک صحابی کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ وہ آپ کا پیراہن پکڑ کر آپ کو روکے؟

کیا اس طرز عمل سے رسالت مآبؐ کی نبوت پر سوالیہ نشان تو نہیں لگتا اور کیا اس روایت کو عظمت رسولؐ کو کم کرنے کی سوچی سمجھی سازش تو نہیں کہا جائے گا؟

اس قضیہ کا انتہائی عجیب پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبؐ کی بجائے حضرت عمرؓ کی حمایت کی اور ان کی رائے کے مطابق قرآن مجید کی آیت نازل فرمائی۔

اس تمام تر روایت کا ماحصل کیا یہی قرار نہیں پائے گا کہ پیغمبر اسلامؐ کی ذات پر اللہ کا اعتماد کم ہوگیا تھا؟

حجاج بن مسلم نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہوئے لکھا:

پیغمبر اکرمؐ کی ازواج قضائے حاجت کے لئے رات کے وقت "مناصع" جاتی تھیں کیونکہ وہ ایک وسیع صحرا تھا۔ ایک دن حضرت عمرؓ نے رسول اکرمؐ سے کہا: آپ اپنی بیویوں کو پردہ پہننے کا حکم دیں لیکن رسول اکرمؐ نے ان کی بات پر توجہ نہیں دی۔ ایک رات رسول خداؐ کی بیوی سودہؓ بنت زمعہ جن کا قد لمبا تھا، قضائے حاجت کے لئے گھر سے نکلیں۔ اچانک عمر نے انہیں آواز دے کر کہا: "سودہؓ! ہم نے تجھے پہچان لیا ہے۔" اور ان الفاظ سے عمر حجاب پر اصرار کرنا چاہتے تھے۔ بی بی حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ یوں آیت حجاب نازل ہوئی۔ (صحیح مسلم، ج ۴، ص ۱۷۰۹، حدیث ۱۸۔ کتاب السلام)

دوسری روایت میں یہ الفاظ وارد ہیں کہ عمر نے سودہؓ سے کہا: خدا کی قسم! تو اپنے آپ کو ہم سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتی۔ لہٰذا تجھے دیکھنا چاہئے کہ باہر کس طرح سے جارہی ہے؟ یہ الفاظ سن کر سودہؓ واپس آئیں اور عمر کے الفاظ رسول اکرمؐ کے سامنے دہرائے۔ (صحیح مسلم، ج ۴، ص ۱۷۰۹، حدیث ۱۷۔ حاشیہ ارشاد الساری شرح البخاری ج ۸، ص ۴۷۵)

قسطلانی اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں:

اس حدیث سے حضرت عمرؓ کی بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور یہ روایت صاحبان فضیلت اور عظیم لوگوں کو اس امر کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ وہ اپنے منافع و مصالح کا خصوصی

خیال رکھیں اور یہ روایت انہیں وعظ و نصیحت کرتی ہے۔ (صحیح مسلم، ج ۴، ص ۱۷۰۹، حدیث ۱۷۔ حاشیہ ارشاد الساری شرح البخاری، ج ۸، ص ۴۷۵)

ابن حجر لکھتے ہیں: اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اس بات سے سخت بے چین ہوتے تھے کہ لوگوں کی نگاہیں ازواج پیغمبر پر پڑیں اسی لئے انہوں نے رسول اکرمؐ سے درخواست کی تھی کہ آپ اپنی بیویوں کو حجاب میں ڈھانپ کر رکھیں اور انہوں نے اس کے لئے آپ کو اتنی تاکید کی کہ اللہ تعالیٰ کو آیت حجاب نازل کرنا پڑی۔ (فتح الباری، ج ۸، ص ۴۳۱)

حقیقت یہ ہے کہ اس روایت سے بھی حضرت عمرؓ کی فضیلت کا کوئی پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔ یہ روایت ان کے لئے بہت سی دشواریاں پیدا کرتی ہے۔

علمائے اہلسنت نے حضرت عمرؓ کے لئے فضیلت تراش کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر کی خواہش کے مطابق قرآن نازل کیا لیکن ان لوگوں نے اس روایت کے دوسرے منفی پہلو پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس روایت سے رسول اکرمؐ اور ان کی ازواج کی توہین ہوتی ہے اور اس روایت پر غور کرنے سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱۔ حضرت عمرؓ نے رسول اکرمؐ کو حکم دیا تھا کہ آپ اپنی بیویوں کو پردے میں لپیٹ کر رکھیں۔
۲۔ پیغمبر اسلامؐ نے حجاب کے مسئلے کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔
۳۔ حضرت عمرؓ ازواج پیغمبر کو اذیت دیتے اور انہیں ستاتے تھے۔
۴۔ حضرت عمر رات کے وقت اٹھ کر رسول اکرمؐ کی ازواج کی آمد و رفت پر نظر رکھتے تھے۔
۵۔ وحی حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق نازل ہوئی۔

سوال یہ ہے کہ آخر حضرت عمر حجاب کے حکم کو نازل کرانے کے لئے اتنے بے تاب کیوں تھے اور انہیں کیا پڑی تھی کہ راتوں کو اٹھ کر پیغمبر اسلامؐ کی ازواج کی آمد و رفت پر نظر رکھیں اور ازواج رسول کی توہین کرتے پھریں تاکہ وہ بے چاری ازواج رات کے وقت بھی گھر سے نکلنے نہ پائیں۔

یقیناً اس قسم کی روایت رسول اکرمؐ کی بہت بڑی توہین ہے کیونکہ اس روایت کا مفہوم یہی ہے کہ رسول اکرمؐ کو اپنی ازواج کی کوئی فکر نہیں تھی اور حضرت عمرؓ ان کے نگران بنے رہتے

تھے اور نعوذ باللہ رسول اکرمؐ کو اپنی ناموس کا احساس نہیں تھا اور حضرت عمرؓ ان کی غیرت و ناموس کے رکھوالے تھے۔

اللہ کے نبیؐ کو اپنی بیویوں کی آمد و رفت پر کوئی اعتراض نہیں تھا اور حضرت عمرؓ کو ان کی آمد و رفت اچھی نہ لگتی تھی اور آخرکار اللہ تعالیٰ نے عمر کے نظریے کی توثیق کی اور آیت حجاب نازل فرمائی۔

روایت کے لب و لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ روایت تراشنے والوں نے اس پر خوب محنت کی تھی اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے ام المومنین حضرت سودہؓ کی بلند قامتی کو مدنظر رکھا تھا۔ روایت تراشنے والے اگر ایسا نہ کرتے تو پھر یہ سوال اٹھتا کہ تاریکی شب میں حضرت عمرؓ نے ایک عورت کو کیسے پہچان لیا تھا؟

حضرت عمرؓ کے متعلق فی الوقت ہم ان ہی روایات پر اکتفا کرتے ہیں اور اگلے صفحات پر حضرت عثمانؓ کے فضائل و مناقب کا ایک سرسری جائزہ پیش کریں گے۔

حضرت عثمانؓ

حضرت عمرؓ کے بعد ہم حضرت عثمانؓ کے خود ساختہ فضائل و مناقب کا ایک ہلکا سا جائزہ لیتے ہیں۔

حجاج بن مسلم لکھتے ہیں کہ رسول اکرمؐ، حضرت عائشہؓ کے حجرے میں لیٹے ہوئے تھے اور آپ نے اپنا لباس اوپر کیا ہوا تھا اور آپ کی رانیں ظاہر تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی تو آپ نے انہیں اجازت دی اور ان کے آنے کے باوجود حضور اکرمؐ اسی طرح سے لیٹے رہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے انہیں اندر آنے کی اجازت دی اور اس بار بھی اسی طرح سے لیٹے رہے۔ پھر حضرت عثمانؓ نے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی تو پیغمبر اکرمؐ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنے لباس کو درست کیا۔

ام المؤمنین نے رسول اکرمؐ سے اس کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا: میں بھلا اس سے حیا کیوں نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔ (صحیح مسلم، ج۴، ص۱۸۶۶، حدیث۳۶۔ کتاب فضائل الصحابہ، باب من فضائل عثمانؓ)

اس روایت میں بھی ہمیں حسب سابق یہی نکتہ دکھائی دیتا ہے کہ یار لوگوں نے رسول اکرمؐ کی توہین کر کے حضرت عثمانؓ کی شان کو دوبالا کرنے کی سعی کی ہے اور انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسول اکرمؐ جو کہ حیا کا عظیم پیکر تھے، آپ کو حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی موجودگی میں لباس درست کرنے کا خیال نہ آیا اور رانیں کھلی کر کے لیٹے رہے لیکن جیسے ہی عثمانؓ کا سنا تو آپ کو ان سے شرم و حیا محسوس ہونے لگی۔

اس روایت سے جہاں امام الانبیاءؐ کی توہین کی گئی ہے وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے دونوں شیخین کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور ان کی موجودگی میں آدھے ننگے پڑے رہے۔ کیا اس روایت سے یہ بات بھی ثابت نہیں ہوتی کہ حضرت عثمانؓ کا مقام دونوں شیخین سے بھی بلند و بالا تھا؟

بخاری لکھتے ہیں کہ ایک مصری، ابن عمر کے پاس آیا اور ان سے حضرت عثمانؓ کے متعلق پوچھا: کیا آپ کو معلوم ہے کہ جنگ احد میں عثمانؓ بھاگے تھے؟

ابن عمر نے کہا: جی ہاں۔

اس شخص نے کہا: کیا آپ کو معلوم ہے کہ عثمانؓ جنگ بدر میں شریک نہیں تھے؟

ابن عمر نے کہا: جی ہاں۔

اس شخص نے کہا: کیا آپ کو علم ہے کہ عثمانؓ بیعت رضوان میں بھی شامل نہیں تھے؟

ابن عمر نے کہا: جی ہاں۔

اس شخص نے تعجب سے اللہ اکبر کہا۔

پھر ابن عمر نے اس سے کہا کہ میں تیرے سامنے ان باتوں کی وضاحت کرتا ہوں: جہاں تک جنگ احد سے بھاگنے کا تعلق ہے تو میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا تھی اور جہاں تک ان کی طرف سے جنگ بدر میں شریک نہ ہونے کا تعلق ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے گھر میں رسول اکرمؐ کی دختر تھیں اور اس وقت وہ بیمار تھیں اسی لئے رسول اکرمؐ نے ان سے فرمایا تھا کہ جنگ بدر میں شرکت کرنے والوں کا ثواب ملے گا (یعنی جنگ کی بجائے تم اپنی بیوی کی تیمارداری کرو)۔ اور جہاں تک بیعت رضوان میں شریک نہ ہونے کا تعلق ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر مکے میں عثمانؓ سے زیادہ کوئی شخص ہردلعزیز ہوتا تو رسول اکرمؐ اسے مکہ بھیجتے۔ جب رسول اکرمؐ نے عثمانؓ کو مکہ روانہ کیا تو اس کے بعد بیعت رضوان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آنحضرتؐ نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کر کے فرمایا کہ یہ عثمانؓ کا ہاتھ ہے۔ پھر آپ نے اپنا وہی ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مار کر فرمایا کہ یہ عثمانؓ کی طرف سے بیعت ہے۔ اس کے بعد ابن عمر نے اس سے کہا کہ اب مطمئن ہو کر واپس چلا جا۔ (صحیح بخاری، ج۵، ص۱۸، کتاب فضائل الصحابہ، باب مناقب عثمان)

اس روایت سے درج ذیل نکات ثابت ہوتے ہیں:

۱۔ حضرت عثمانؓ کا دفاع کرنے والے (وکیل صفائی) ابن عمر تھے۔

۲۔ سوالات سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کرنے والا حضرت عثمانؓ کا مخالف تھا۔*

۳۔ ابن عمر نے اقرار کیا کہ جنگ احد میں حضرت عثمانؓ بھاگ گئے تھے۔

۴۔ روایت کرنے والے نے واقعات کی تاریخی ترتیب ملحوظ خاطر نہیں رکھی کیونکہ اسے پہلے جنگ بدر کا اور اس کے بعد جنگ احد کا ذکر کرنا چاہئے تھا کیونکہ جنگ بدر پہلے ہوئی تھی اور جنگ احد بعد میں واقع ہوئی تھی۔

بخاری و دیگر فقہاء کو بھی اس ترتیب کا علم تھا لیکن نہ جانے انہوں نے غیر طبعی ترتیب رکھنے والی روایت کو کیوں قبول کیا؟

تاریخ کے (گہرے) مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کے علاوہ پیغمبر اکرمؐ کی کوئی صاحبزادی نہیں تھیں اور زینبؓ، رقیہؓ اور ام کلثومؓ رسول اکرمؐ کی صلبی بیٹیاں نہیں تھیں۔ یہ آنحضرتؐ کی ربیبہ تھیں۔

۱۔ کیا حضرت عثمانؓ کا نکاح رقیہؓ و ام کلثومؓ سے ہوا تھا یا نہیں؟ اس کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے اور صحیح ترین روایت یہ ہے کہ ایسا نکاح سرے سے ہوا ہی نہیں تھا۔

۲۔ اسی طرح سے یہ بات بھی ثابت نہیں ہے کہ رسول اکرمؐ نے حضرت عثمانؓ کو اپنی طرف سے سفارت کار بنا کر مکہ بھیجا تھا۔

ابن حجر نے بزار سے نقل کیا کہ حضرت عثمانؓ نے عبدالرحمٰن کو سرزنش کی اور اس سے کہا کہ تو اپنی آواز کو مجھ پر بلند کرتا ہے؟ اس کے بعد عبدالرحمٰن نے عثمانؓ کے روبرو ان کے تین عیوب بدر سے تخلف، احد میں فرار اور بیعت رضوان میں عدم شرکت کا تذکرہ کیا لیکن حضرت عثمانؓ اپنے دفاع میں وہ جواب نہ دے سکے جو ابن عمر نے مصری کو دیئے تھے۔ (فتح الباری، ج ۷، ص ۴۷)

بزار کی روایت کی اہمیت زیادہ ہے اور اس سے حضرت عثمانؓ کے خلاف لگائے جانے والے الزامات کی تائید ہوتی ہے کیونکہ یہ الزام کسی دور دراز رہنے والے شخص کی بجائے عبدالرحمٰن

بن عوف نے عائد کئے تھے اور عبدالرحمٰن، حضرت عثمانؓ کے قریبی دوست تھے اور انہوں نے ہی حضرت عثمانؓ کو منصب خلافت پر فائز کیا تھا اس لئے ان کے الزامات کو مسترد کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ یہ گھر کے بھیدی کی طرف سے اظہار حقیقت ہے اور عبدالرحمٰن، حضرت عثمانؓ کی تاریخ کو بخوبی جانتے تھے۔

کتب حدیث بالخصوص بخاری اور مسلم میں ایسی احادیث بکثرت دکھائی دیتی ہیں جن میں خلفائے ثلاثہ کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے پیش کیا گیا ہے اور پھر ایک ہی حدیث کو تینوں افراد کے لئے علیحدہ علیحدہ فضیلت کا سرچشمہ بتایا گیا ہے۔

مثلاً ''کوہ احد'' کی حدیث یوں تراشی گئی کہ رسول اکرمؐ نے پہاڑ سے فرمایا: اپنی جگہ پر قائم رہ، اس وقت تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید موجود ہیں۔

اس طرح سے ابوموسیٰ اشعری کی روایت میں بھی یہی انداز اختیار کیا گیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے بالترتیب ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کے متعلق فرمایا کہ انہیں اندر آنے کی اجازت دو اور انہیں جنت کی بشارت دو اور یہی رنگ ہمیں صحابی کے اس قول میں بھی دکھائی دیتا ہے کہ ہم زمانہ پیغمبر میں ابوبکر کو افضل ترین فرد سمجھتے تھے۔ ان کے بعد عمر اور ان کے بعد عثمانؓ کو تمام لوگوں سے افضل جانتے تھے۔

اس طرح سے محمد بن حنفیہؓ کی حدیث میں بھی یہی طریقہ اپنایا گیا ہے کہ جب انہوں نے اپنے والد حضرت علیؑ سے پوچھا تھا کہ بعد از پیغمبر امت میں افضل کون ہے تو انہوں نے ابوبکر کا نام لیا اور جب ابن حنفیہؓ نے پوچھا کہ ابوبکر کے بعد کس کا درجہ ہے تو حضرت علیؑ نے فرمایا کہ ان کے بعد عمر کا درجہ ہے۔ محمد بن حنفیہؓ نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے والد عمر کے بعد عثمانؓ کا نام لے لیں اس لئے انہوں نے گفتگو کا انداز بدل کر کہا کہ آپ کو اس امت میں کون سا درجہ حاصل ہے؟ حضرت علیؑ نے کہا: میں تو جماعت المسلمین کا ایک عام سا فرد ہوں۔

اس کے قریب قریب ابن عباسؓ کی روایت میں بھی یہی طریقہ اپنایا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ زخمی حالت میں لیٹے ہوئے تھے کہ حضرت علیؑ نے ابن عباسؓ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''اے عمر! امید ہے کہ خدا تجھے تیرے دو دوستوں یعنی رسول اکرمؐ اور ابوبکر سے ملحق فرمائے گا۔''

ان احادیث کے متعلق انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ تینوں بزرگوں کے ناموں کا بار بار جمع ہونا محض اتفاق ہے یا کوئی دست سیاست کارفرما ہے؟ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اتفاق نہیں ہے بلکہ ایک سوچا سمجھا اقدام ہے۔ ایسی روایات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تینوں بزرگ ایک ہی عظمت و مقام کے حامل تھے اور ان کی شان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ لوگوں کو یہ باور کرایا جائے کہ ان میں سے کسی ایک کے متعلق اگر کسی مسلمان کو شک پیدا ہو جائے تو دوسرے دو افراد کی وجہ سے اس کا شک زائل ہو سکے۔

روایت سازوں کو حضرت عثمانؓ کو شیخین کے ساتھ مربوط رکھنے کے لئے بڑی کدو کاوش کرنا پڑی اور یہ سب کچھ "نظریہ ضرورت" کے تحت کیا گیا کیونکہ انہیں علم تھا کہ لوگ حضرت عثمانؓ پر تنقید کرتے ہیں جبکہ شیخین پر بہت کم اعتراض کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کی غلطیوں کو چھپانے اور ان کے مقام کو تحفظ دینے کے لئے انہیں شیخین سے منسلک کر دیا گیا اور جب حضرت عثمانؓ کو شیخین سے مربوط کر دیا گیا تو اس کے ساتھ یہ کہا گیا کہ خبردار کوئی شخص حضرت عثمانؓ پر اعتراض کرنے کی جرأت نہ کرے کیونکہ ان پر اعتراض کرنا شیخین پر براہ راست اعتراض کرنے کے مترادف ہے اور شیخین کے متعلق لوگوں کو بار بار متنبہ کیا گیا کہ ان پر زبان طعن دراز کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے خلفائے ثلاثہ کو ایک مقدس ہالے میں جگہ دی گئی اور پھر اس مفہوم کی بے شمار احادیث بنائی گئیں کہ ان بزرگواروں پر کسی بھی طرح کی تنقید جائز نہیں ہے۔

کہنے کی حد تک تو حضرت علیؑ کو بھی چوتھا خلیفہ تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اہلسنت کے ہاں ان کا کوئی خاص احترام نہیں کیا جاتا اور تمام تر تعظیم و تکریم خلفائے ثلاثہ کیلئے مخصوص دکھائی دیتی ہے جبکہ خلفائے ثلاثہ کے عشر عشیر کے برابر بھی حضرت علیؑ کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ بس انہیں چوتھا خلیفہ کہہ کر دل کو تسلی دی جاتی ہے اور پھر ستم یہ ہے کہ زبانی طور پر انہیں چوتھا خلیفہ تسلیم کرنے لینے کے باوجود بھی ایسی بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں جن سے ان کا مقام مجروح ہوتا ہے اور ان روایات کی وجہ سے حضرت کے علم و عظمت کے متعلق شکوک و شبہات جنم لیتے ہیں۔

ہم حضرت علیؑ کے فضائل کے باب میں یہ بتائیں گے کہ انہیں کم سے کم رتبہ کیوں دیا گیا اور انہیں چوتھے مقام پر کیوں تسلیم کیا گیا؟

مسئلہ خلافت کی موجودہ شکل و صورت اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ یہ ایک سیاسی چکر ہے اور جب ہمارے کرم فرما اسے احادیث سے تطبیق دیتے ہیں تو انہیں سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مسلم لکھتے ہیں کہ ام المومنین عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ یہ بتائیں کہ اگر رسول اکرمؐ کسی کو اپنا خلیفہ مقرر کرتے تو کسے مقرر کرتے؟

ام المومنین نے کہا: ابوبکر کو خلیفہ بناتے۔

پوچھا گیا: ابوبکر کے بعد کس کو خلیفہ نامزد کرتے؟

بی بی نے کہا: عمر کو اپنا خلیفہ نامزد کرتے۔

پوچھا گیا: عمر کے بعد آنحضرتؐ اپنا خلیفہ کسے بناتے؟

بی بی نے کہا: ابوعبیدہ بن جراح کو خلیفہ بناتے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ تین خلفاء کے متعلق جو نظریہ رکھتی تھیں اس میں حضرت عثمانؓ کا کہیں نام تک موجود نہیں تھا اور مجلس شوریٰ کی کارروائی اور بالخصوص عبدالرحمن بن عوف کے خصوصی کردار کی وجہ سے خلافت حضرت عثمانؓ کو ملی۔ اب انسان تصدیق کرے تو آخر کس کی، ام المومنین کی یا لوگوں کی؟

حاکم مستدرک میں لکھتے ہیں کہ ابوہریرہ سے منقول ہے:

رسول اکرمؐ کی بیٹی اور حضرت عثمانؓ کی زوجہ رقیہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں آئیں اور ان کے ہاتھوں میں کنگھی تھی اور انہوں نے آنحضرتؐ کے سر اطہر میں کنگھی کی۔ وہ کہتی ہیں کہ اس اثناء میں رسول اکرمؐ نے مجھ سے فرمایا: تو نے ابوعبداللہ عثمان کو کیسا پایا؟ اس کے بعد رسول اکرمؐ نے فرمایا: اس کا احترام کرنا کیونکہ وہ اخلاق و کردار کے حوالے سے میرے تمام اصحاب کی بہ نسبت میرے زیادہ مشابہ ہے۔ (مستدرک حاکم، ج ۴، ص ۴۸)

حاکم روایت کے آخر میں لکھتے ہیں کہ حدیث کی سند صحیح ہے لیکن اس کا متن بے بنیاد

ہے کیونکہ رقیہ جنگ بدر کے موقع پر فوت ہوئی تھیں اور ابوہریرہ فتح خیبر کے بعد ہجرت کے ساتویں سال مسلمان ہوئے تھے۔ (مستدرک حاکم، ج ۴، ص ۴۸)

ذہبی کہتے ہیں: اس حدیث کا متن قابل قبول نہیں ہے کیونکہ رقیہ بدر کے سال فوت ہوئی تھیں اور ابوہریرہ نے جنگ خیبر کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ (تلخیص مستدرک، ج ۴، ص ۴۸)

مذہب اہلسنت میں اس طرح کی کئی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے اپنے بزرگوں کو عظیم شخصیات بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا ہے۔

ہمارے کرم فرماؤں کا عمومی اصول یہی ہے کہ وہ صرف سند حدیث پر بحث کرتے ہیں اور متن حدیث کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے لیکن اس حدیث کے سلسلے میں ان میں مثبت تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ زیادہ نہ سہی تو کم از کم ایک بار تو متن حدیث کو دیکھنے کی نوبت آئی اور یہ تضاد بیانی کی انتہا ہے۔ کاش! وہ باقی احادیث کے متعلق بھی یہی رویہ اختیار کرتے تو اس سے شخصیات کے متعلق وضع کردہ احادیث سے تو ہماری جان چھوٹ جاتی لیکن سیاست نے ایسا کرنے کی انہیں اجازت نہ دی۔

خلفائے ثلاثہ کے علاوہ عشرۂ مبشرہ کے باقی افراد کے متعلق روایات پڑھنے سے شکوک وشبہات میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور یوں اصل مسئلہ ہی مشکوک دکھائی دینے لگتا ہے۔

بخاری اور مسلم نے فضائل الصحابہ کے باب میں مروان بن حکم کی زبانی زبیر بن عوام کی فضیلت میں ایک روایت نقل کی ہے: مروان کا بیان ہے کہ میں عثمان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس اثناء میں ایک شخص آیا اور ان سے کہا کہ آپ اپنا جانشین مقرر کریں۔

حضرت عثمانؓ نے کہا: کیا لوگوں نے کسی شخص کو معین کیا ہے؟

اس شخص نے کہا: جی ہاں! زبیر کو معین کیا ہے۔

حضرت عثمانؓ نے تین بار کہا: خدا کی قسم! وہ تم میں بہترین شخص ہے۔

اس روایت سے زبیر کی کوئی فضیلت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ یہ تاثرات حضرت عثمانؓ کے ہیں اور حضرت عثمانؓ کو اپنی مدد کے لئے کسی موثر شخص کی ضرورت تھی اس لئے انہوں نے زبیر کی تعریف کی تھی۔

علاوہ ازیں اس روایت کا راوی بھی خیر سے مروان بن حکم ہے اور یہ وہ شخص ہے کہ جس کے باپ پر رسول اکرمؐ نے اس وقت لعنت کی تھی جبکہ وہ ابھی صلب پدر میں تھا۔

بخاری لکھتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے اور زبیر بن عوام میرا حواری ہے۔ اسی طرح سے مزید یہ بھی لکھا کہ پیغمبر اکرمؐ نے زبیر سے کہا تھا کہ میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں۔

زبیر کو حواری کہنے کا اصل مقصد امیرالمومنینؑ کے فضائل کو کم کرنا اور آپ کے فضائل کی تخصیص کو عمومیت میں بدلنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

مسلم نقل کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: ہر امت میں ایک امین ہوتا ہے اور میری امت کا امین ابوعبیدہ بن جراح ہے۔

مسلم نے سعد بن ابی وقاص سے نقل کرتے ہوئے لکھا کہ بی بی عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک رات پیغمبر اکرمؐ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ آپ نے فرمایا: کاش! میرے صحابہ میں سے کوئی نیک صحابی آج رات آتا اور میری حفاظت ونگہبانی کرتا۔

بی بی عائشہؓ کہتی ہیں کہ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دی۔ رسول اکرمؐ نے پوچھا کون ہے؟ جواب ملا کہ میں سعد بن ابی وقاص ہوں اور میں آپ کی حفاظت کے لئے آیا ہوں۔ بی بی عائشہؓ کہتی ہیں کہ اس سے آپ کو اطمینان نصیب ہوا اور آپ گہری نیند سو گئے۔

اس روایت پر چند سوال مرتب ہوتے ہیں:

۱۔ اس رات اگر نبی کریمؐ کو خوف و ہراس تھا تو وہ چیز کون سی تھی جس کی وجہ سے آپ بے چین ہو گئے تھے؟

۲۔ باقی اصحاب کہاں چلے گئے تھے انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کو غیر محفوظ کیوں چھوڑ دیا تھا؟

۳۔ اس رات حضرت عائشہؓ آنحضرتؐ کے پہلو میں موجود تھیں۔ اس کے لئے ہمیں بتایا جائے کہ آنحضرتؐ اس رات گھر میں تھے یا سفر میں؟ اگر آپ گھر میں تھے تو آپ کو گھبرانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور اگر بالفرض آپ کسی جنگ کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے تھے تو آپ کے باقی صحابہ کہاں چلے گئے تھے اور وہ آنحضرتؐ کی

حفاظت سے غافل کیوں رہے تھے؟

۴۔ جب سعد ہتھیار لے کر آئے تو آپ مطمئن ہوگئے۔ کیا ان الفاظ سے یہ بتانا مقصود نہیں ہے کہ حضرت علیؑ نے پیغمبر اکرمؐ کی حفاظت سے ہاتھ اٹھا لئے تھے؟

اسی سعد کے متعلق بخاری لکھتے ہیں کہ کچھ اشخاص نے حضرت عمرؓ کے پاس سعد کی شکایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسے تو نماز پڑھنی بھی نہیں آتی۔

طلحہ کے متعلق بخاری لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ جب رسول اکرمؐ کی وفات ہوئی تو آپ طلحہ سے راضی تھے۔

بخاری نے ابوحازم سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا: میں نے طلحہ کو دیکھا کہ وہ رسول اکرمؐ کی حفاظت کر رہے تھے جبکہ ان کا ایک بازو بیکار ہو چکا تھا۔

عشرۂ مبشرہ کے دوسرے افراد سعید بن زید اور عبدالرحمٰن بن عوف کی فضیلت میں بخاری اور مسلم نے ایک لفظ تک نہیں لکھا۔ جب مذکورہ افراد کے پلّے کوئی فضیلت ہی نہیں تھی تو انہیں عشرۂ مبشرہ کی فہرست میں کیوں شامل کیا گیا؟

اب عشرۂ مبشرہ کی بجائے حضرت علیؑ کے پیروکار صحابہ مثلاً بلالؓ، سلمانؓ، عمارؓ، حذیفہؓ، مقدادؓ اور ابوذرؓ کے متعلق ہم دیکھتے ہیں کہ محدثین نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسلام کی خدمت کے لئے ان کا عمل دخل نہیں تھا۔

جب ہم بخاری پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ اس نے معاویہ کے متعلق ایک باب قائم کیا جس کا نام "باب ذکر معاویہ" رکھا لیکن بخاری کو ابوذرؓ کے متعلق باب قائم کرنے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی اور اس نے ابوذرؓ کے متعلق اپنے لبوں کو سی لیا اور عمارؓ اور حذیفہؓ جیسے جلیل القدر صحابیوں کے لئے اس نے ایک ہی باب قائم کیا اور ان کے متعلق صرف ایک روایت پر ہی اکتفا کی۔

بخاری نے عمارؓ اور حذیفہؓ کے متعلق علقمہ سے نقل کیا کہ میں شام گیا اور میں نے دو رکعت نماز پڑھی پھر میں نے اللہ سے درخواست کی کہ میرے لئے کوئی اچھا ہم نشین بھیج۔ پھر میں ایک گروہ کے پاس آیا اور ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اچانک ایک بوڑھا شخص آیا اور میرے پہلو میں بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو مجھے بتایا گیا کہ یہ ابودرداء ہے۔ میں

نے ان سے کہا کہ اہل کوفہ میں سے کون بہتر ہے؟ اس نے کہا کہ کیا ام عبد کا فرزند اور رسول اکرمؐ کی نعلین اور عصا اٹھانے والا تمہارے پاس نہیں ہے؟ اور کیا تمہارے پاس وہ شخص نہیں ہے جسے خدا نے شیطان سے دور رکھا ہے یعنی عمارؓ تمہارے پاس نہیں ہے؟ اور صاحب سرِ رسول جن کے علاوہ منافقین کے ناموں کا کسی کو پتا نہیں یعنی حذیفہؓ تمہارے پاس نہیں ہیں؟ (صحیح بخاری، ج ۵، ص ۳۱، کتاب فضائل الصحابہ، باب مناقب عمارؓ و حذیفہؓ)

بخاری نے حضرت عمرؓ سے حضرت بلالؓ کے متعلق یہ الفاظ نقل کئے ہیں: ابوبکر ہمارا سردار ہے اور اس نے ہمارے سردار (بلالؓ) کو آزاد کیا۔ (صحیح بخاری، ج ۵، ص ۳۳ و ۳۴، کتاب فضائل الصحابہ، باب مناقب بلالؓ)

بخاری لکھتے ہیں کہ حضرت بلالؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا تھا کہ اگر آپ نے مجھے اپنے لئے خریدا ہے تو مجھے اپنے پاس رکھیں اور اگر خدا کے لئے خریدا ہے تو مجھے خدا کا کام کرنے دیں۔ (صحیح بخاری، ج ۵، ص ۳۳ و ۳۴، کتاب فضائل الصحابہ، باب مناقب بلالؓ)

پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا تھا کہ میں نے تیرے جوتے کی آواز جنت میں سنی۔ (صحیح بخاری، ج ۵، ص ۳۳۔ مسلم، ج ۴، ص ۱۹۱۰۔ کتاب الفضائل، باب من فضائل بلالؓ)

مسلم نے حضرت بلالؓ کے متعلق سابقہ روایت نقل کی اور حضرت ابوذرؓ کے اسلام اور مکہ میں رسول اکرمؐ سے ان کی ملاقات کے متعلق ایک روایت نقل کی۔ مگر اس نے حضرت حذیفہؓ، حضرت عمارؓ اور حضرت علیؑ کے دوسرے وفادار صحابہ کے متعلق کچھ بھی نقل نہیں کیا اور اس کی بجائے ابوہریرہ اور ابن عمر اور ابوسفیان کے لئے ایک مستقل باب قائم کیا۔ (صحیح مسلم، ج ۴، ص ۱۹۲۷۔ ۱۹۳۸۔ ۱۹۴۵)

مسلم نے حضرت بلالؓ، حضرت سلمانؓ اور حضرت صہیبؓ کے متعلق ایک روایت نقل کی ہے جسے ہم سابقہ صفحات پر نقل کر چکے ہیں جس کا لب لباب یہ ہے کہ مذکورہ اصحاب نے ابوسفیان کی توہین کی اور حضرت ابوبکرؓ نے انہیں اس سے منع کرتے ہوئے کہا کہ ابوسفیان قریش کا سردار ہے اس کی اہانت مت کرو۔ یہ کہہ کر ابوبکر رسول اکرمؐ کے پاس آئے اور ان سے اپنی گفتگو نقل کی تو رسول اکرمؐ نے فرمایا: اگر تم نے انہیں ناراض کیا تو گویا خدا کو ناراض کیا

بہرنوع ان روایات سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ حذیفہؓ وعمارؓ کو رسول اکرمؐ کی نظر میں ایک مخصوص مقام حاصل تھا کیونکہ حذیفہؓ، رسول اکرمؐ کے رازوں کے امین تھے اور عمارؓ شرِ شیطان سے محفوظ تھے۔ مگر اس کے باوجود محدثین نے انہیں کوئی خصوصی مقام دینے سے گریز کیا۔

محدثین نے اتنا کہہ کر خاموشی اختیار کرلی کہ حذیفہؓ رسول اکرمؐ کے رازدار تھے اور تمام صحابہ میں سے حذیفہؓ کو ہی منافقین کے نام معلوم تھے۔ البتہ محدثین نے یہ نہیں بتایا کہ انہیں یہ خصوصیت کس بنا پر حاصل تھی؟

حضرت عمرؓ کی زبانی فضیلت بلالؓ کی روایت میں دراصل حضرت بلالؓ کی فضیلت کم اور حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت زیادہ بیان کی گئی ہے۔

حضرت بلالؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے درمیان ہونے والی گفتگو وفات پیغمبر اکرمؐ کے بعد ہوئی تھی [۱] اور یہ گفتگو اس وقت ہوئی تھی جب حضرت بلالؓ سے بیعت ابوبکر کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جواب میں انہوں نے وہ جملے کہے جو ابھی گزر چکے ہیں۔

حضرت بلالؓ کے متعلق پیغمبر اسلامؐ کے فرمان سے ثابت ہوتا ہے کہ بلالؓ کا تعلق اس جماعت سے ہے جسے رسول اکرمؐ نے جنت کی بشارت دی تھی مگر اس کے باوجود محدثین نے ان کا نام عشرۂ مبشرہ میں شامل نہیں کیا۔

حضرت بلالؓ، حضرت سلمانؓ اور حضرت صہیبؓ کے متعلق مسلم کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ان تینوں افراد کا مقام حضرت ابوبکرؓ کے مقام سے کہیں بلند و بالا تھا۔

۱۔ فتح الباری، ج ۷، ص ۹۹ اور طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۲۳۶۔ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد حضرت بلالؓ نے اذان کہنی چھوڑ دی تھی اور انہوں نے مدینہ چھوڑنے کا ارادہ کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے انہیں منع کیا جس پر انہوں نے کہا تھا کہ اگر آپ نے مجھے اپنے لئے خریدا تھا تو اپنے پاس رہنے دیں اور اگر مجھے خدا کے لئے خریدا تھا تو مجھے خدا کے کام کرنے دیں اور میرے لئے رکاوٹ نہ بنیں۔ حضرت بلالؓ اور حضرت علیؑ کے دیگر ساتھیوں کے ساتھ ارباب حکومت کا [illegible] اختلاف تھا۔

تشیع کے اصول و نظریات

کشش کے اسباب

بہت سے عوامل و اسباب نے مجھے خط اہلبیتؑ اور نظریہ تشیع کی طرف مائل کیا۔ ان عوامل میں سے کچھ کا تعلق اہلسنت کے نظریات سے ہے اور بعض کا تعلق اسلامی موقعیت سے ہے اور بعض عوامل کا تعلق ذاتی حالات و واقعات سے ہے اور بعض کا تعلق تشیع کے نظریے سے ہے۔

جہاں تک اہلسنت کے اصول و نظریات کا تعلق ہے تو ہم تفصیل سے اس کا تذکرہ کرچکے ہیں کہ اس مذہب میں سیاست نے دین کی جگہ لے لی ہے اور ان کے ہر مسئلے میں سیاست کے اثرات نمایاں دکھائی دیتے ہیں اور ان ہی اثرات کی وجہ سے اسناد رجال کو متون احادیث پر فوقیت حاصل ہے اور اہلسنت اس غلطی پر کوئی ندامت محسوس نہیں کرتے اور تاحال اپنی اصلاح پر آمادہ نہیں ہیں۔

جہاں تک اسلامی موقعیت کا تعلق ہے تو اس کا مشاہدہ میں اسلامی گروہوں کے ساتھ اپنی طویل وابستگی کے دوران کرچکا ہوں اور میں نے ان کی فکری اور انقلابی مشکلات کا انتہائی قریب سے جائزہ لیا ہے اور ان کی تمام تر مشکلات کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ مذہب تسنن کے پیروکار ہیں۔

جہاں تک میری ذات کا واسطہ ہے تو جب میں سنی تھا تو میں نے وہاں عقل کا پرچم بلند کیا تھا لیکن وہاں عقل کی گنجائش نہیں تھی۔ میرے اس جرم کی وجہ سے میرے خلاف بہت سی تہمتیں تراشی گئیں اور ناجائز الزامات لگائے گئے اور میری توہین کی گئی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا

کہ ان کے نزدیک عقل سے استفادہ زندیقی والحاد اور گمراہی ہے اور ان لوگوں کی کوشش ہے کہ لوگ اپنی عقل کو معطل کر کے ان کے آستانے پر سر جھکا دیں اور تمام حقائق و واقعات سے آنکھیں بند کر کے ان کی پیروی کریں۔

۱۹۸۰ء کے اوائل کی بات ہے۔ اس وقت میں زندان میں تھا تو حزب جہاد کے قائدین نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں ان کے ساتھ فکری تعاون کروں اور زندان میں ان کے نظریات کی تبلیغ کروں۔ میں نے ان کی اس پیشکش کو یہ کہہ کر مسترد کردیا:

۱۔ میں اچھی طرح سوچے سمجھے بغیر کوئی کام کرنے کا عادی نہیں ہوں اور میری یہ عادت تمہارے لئے نقصان دہ ہے۔

۲۔ اگر میں آپ کے ساتھ تعاون بھی کروں تو میرا تعاون دو حالتوں سے خالی نہ ہوگا:

(الف) جن امور میں مجھے آپ کی سوچ سے اختلاف ہوگا تو میں ان امور کے متعلق اپنی سوچ کو لوگوں کے سامنے بیان کروں گا اور اس صورت میں آپ کو مجھ سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوسکے گا۔

(ب) اگر میں آپ حضرات کا تابع مہمل بن کر کام کروں گا تو اس طرح میری شمولیت آپ کے لئے مفید ثابت نہ ہوگی کیونکہ آپ کے پاس ماشاء اللہ پہلے سے ہی تابع مہمل قسم کے افراد موجود ہیں اور ان کی موجودگی میں ایک اور شخص کے اضافے کی آپ کو کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

عقل میں خدا نے بڑی قوت رکھی ہے اور اگر انسان عقل کے ہتھیار سے مسلح ہو تو اس کے لئے چناؤ کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اس شمع عقل کی روشنی کی وجہ سے میں خط اہلبیتؑ تک پہنچا اور عقل نے مجھے مذہب اہلبیتؑ کی پیروی پر مجبور کردیا۔

اگر خدا نے مجھے عقل کے ہتھیار سے مسلح نہ کیا ہوتا تو میں سنی مذہب کی زنجیروں سے آزاد نہیں ہوسکتا تھا۔ عقل نے مجھے اس مذہب سے آزادی فراہم کرنے میں میری مدد کی۔

(العقل المسلم بین اغلال السلف و اوھام الخلف)

نظریہ تشیع نے خط اہلبیتؑ کی طرف میری رہنمائی کی جسکی وضاحت حسب ذیل ہے:

قرآن و عقل

اللہ تعالی نے قرآن مجید کو حکم اور لوگوں کی زندگی کا دستور بنا کر نازل فرمایا لیکن سالہاسال سے لوگ روایات اور اجتہادات کے اس طرح سے اسیر ہوئے کہ روایات نے ان پر اپنا اتنا تسلط قائم کرلیا ہے اور روایات ہی ان کا دین بن چکی ہیں جس کے نتیجے میں لوگوں نے عملی طور پر قرآن کو چھوڑ دیا ہے اور اس نظریے کو حکام نے مزید تقویت دی کیونکہ اس طرح کی بے سروپا روایات ان کے مفاد میں تھیں اور انہوں نے ان روایات کے ذریعے مسلمانوں کو اپنی غیر مشروط اطاعت پر آمادہ کیا۔

مذکورہ روایات اگرچہ قرآن کی متضاد تھیں لیکن حکام کے مفاد میں تھیں اس لئے حکام نے ان روایات کی خوب سرپرستی کی اور یوں قرآن مسلمانوں کی زندگی سے دور ہوگیا اور اگر کسی "سرپھرے" نے اس حالت کے خلاف آواز اٹھائی اور عقل کا نعرہ مستانہ بلند کیا تو اس پر کفر و الحاد کا لیبل چسپاں کردیا گیا اور یوں نہ صرف اس کے وجود بلکہ اس کے نظریات سے بھی آزادی حاصل کرلی گئی۔

حقیقت کا نعرہ بلند کرنے والے بیسیوں مسلمانوں کو حکام وفقہاء نے موت کے گھاٹ اتارا۔ اگر مسلمان روز اول سے ہی قرآن و عقل سے وابستہ رہتے تو آج ان کے حالات یکسر مختلف ہوتے اور وہ حکام کی کاسہ لیسی اور ملوکیت پرستی میں مبتلا نہ ہوتے اور آج مسلمانوں میں یہ اختلاف نہ ہوتا اور خدا پرستی کی بجائے شخصیات پرستی ان کا دین نہ ہوتا۔

جب سے امت نے قرآن کو خیرباد کہا تب سے گمراہ کن روایات کی تخلیق شروع ہوئی اور عقل سے دوری کی وجہ سے ان روایات نے قرآن کا درجہ حاصل کرلیا اور قرآن سے دوری کی وجہ سے حقیقی اسلام کی بجائے ایک نیا اسلام معرض وجود میں آیا۔ عقل سے دوری کی وجہ سے فقہاء نے توجیہ و تاویل کی روش کو اپنایا اور قرآن سے دوری کی وجہ سے "میراث" نے دین کا مقام حاصل کرلیا۔ عقل سے دوری کی وجہ سے فقہاء نے اس "میراث" کی حمایت کی اور قرآن و عقل سے دوری کی وجہ سے مسلمان حکام وفقہاء کے ہاتھوں قیدی بن کر رہ گئے۔

تشیع کی خوبی یہ ہے کہ وہ قرآن و عقل دونوں کو بیک وقت تسلیم کرتی ہے اور قرآن و عقل کو رہنما سمجھ کر اس سے جدید مسائل کا استنباط کرتی ہے اور اسلام کو ایک جامد دین کی بجائے متحرک دین کے طور پر نمایاں کرتی ہے جبکہ سنی نظریات کے تحت اسلام کو ایک جامد اور خشک دین کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس میں کسی طرح کی لچک دکھائی نہیں دیتی اور موجودہ دور کے تقاضوں سے بالکل ہم آہنگ دکھائی نہیں دیتا اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان لوگوں نے قرآن و عقل کو ایک گوشے میں رکھ دیا ہے اور اس کی بجائے انہوں نے اپنے ان نظریات کو تقدس کا جامہ پہنایا جن کی بنیاد کتب حدیث اور بالخصوص بخاری اور مسلم پر رکھی گئی تھی اور پھر بخاری اور مسلم کو باقی کتابوں میں سے تقدس کا درجہ دیا گیا۔

علاوہ ازیں اہلسنت میں تکفیر کا ہتھیار ہر دور میں موثر رہا ہے اور جس نے بھی بخاری اور مسلم کی روایات پر تنقید کی تو اس کے خلاف اس ہتھیار کو بے دریغ استعمال کیا گیا۔ ماضی قریب میں چند عقل مند افراد نے بخاری کی ان روایات پر تنقید کی جن میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اکرمؐ پر جادو کیا گیا تھا لیکن ان بے چاروں کا وہ حشر ہوا کہ خدا کی پناہ اور جب ان بے چاروں نے محسوس کیا کہ عنقریب ان پر الحاد و زندیقی کا فتوئی لگنے ہی والا ہے تو انہوں نے مجبوراً خاموشی اختیار کر لی اور اسی تنقید کی پاداش میں الازہر یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کو ملازمت سے نکال دیا گیا اور اس کا جرم یہی تھا کہ اس نے مذکورہ روایات پر تنقید کی تھی۔

اہلسنت روایات کے اس قدر گرویدہ ہیں کہ وہ روایات کا قرآن مجید سے تقابل کرنا بھی جرم تصور کرتے ہیں اور انہوں نے روایات کو قرآن کے برابر بلکہ اس سے بھی بالا قرار دیا ہے اور انہوں نے ایک خطرناک روش اپنائی ہوئی ہے کہ جو روایت ان کے خودساختہ اصولوں کے مطابق صحیح ہو وہ قابل قبول ہے خواہ وہ روایت قرآن کے مطابق ہو یا مخالف ہو اس سے انہیں کوئی غرض نہیں ہے اور روایت کی طرح سے انہوں نے اپنے خودساختہ اصولوں کو بھی ہر شک و شبہ سے بالا قرار دیا ہے۔ اگر اہلسنت میں عقل کا احترام ہوتا تو وہ ایسی روایات اور ایسے قواعد کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیتے۔

مذہب شیعہ اس لحاظ سے انتہائی ترقی یافتہ مذہب ہے کہ اس میں قرآن و عقل کی

حکمرانی دکھائی دیتی ہے اور وہ پیغمبر اسلامؐ سے مروی روایات اور ائمہ ہدیٰ کے فرامین اور اپنے محدثین و فقہاء کے نظریات کو آنکھیں بند کر کے تسلیم نہیں کرتے بلکہ اسے قرآن و عقل کی کسوٹی پر تولتے ہیں اور جو روایات و فتاویٰ قرآن و عقل کے مطابق دکھائی دیتے ہیں انہیں قبول کرتے ہیں اور جو قرآن و عقل کے خلاف دکھائی دیتے ہیں انہیں رد کر دیتے ہیں اور شیعوں کی اس روش نے مجھے بے حد متاثر کیا۔[۱]

حضرت امام علیؑ کی مقناطیسی شخصیت

کتب اہلسنت کے مطالعے کے دوران امام احمد بن حنبل کے ایک فرمان نے میری توجہ کو اپنی جانب مبذول کیا۔ انہوں نے کہا: "حضرت علیؑ کے دشمن بہت زیادہ تھے اور انہوں نے حضرت علیؑ میں عیب تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں حضرت علیؑ میں کوئی عیب دکھائی نہ دیا۔ ناچار ہو کر انہوں نے ایک ایسے شخص کو تلاش کیا جو کہ حضرت علیؑ کا دشمن تھا۔ حضرت علیؑ کی دشمنی اور کینہ کی وجہ سے انہوں نے اس کی تعریف و توصیف کی۔"

امام احمد بن حنبل نے دشمن علیؑ سے اگر معاویہ مراد لیا ہے تو انہوں نے پوری تاریخ تسنن پر خط تنسیخ کھینچا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ امام احمد کا مقصود معاویہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اہلسنت کی تاریخ بنی امیہ اور بنی عباس کی تائید پر استوار ہے اور مذکورہ دونوں خاندانوں نے ائمہ اہلبیتؑ کو شہید کر کے خط اہلبیتؑ کو ختم کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔

مذہب اہلسنت "میراث" کی تائید کی اساس پر قائم ہے اور وہ میراث حکمرانوں کے ذریعے سے اہلسنت میں منتقل ہوئی اور یہ وہی "میراث" ہے جس کی بنیاد علیؑ اور اہلبیتؑ کی تحقیر پر قائم ہے۔ مذہب اہلسنت ہر دور میں حکمرانوں سے مربوط رہا ہے (اور اگر اسے مذہب اہل حکومت کہا جائے تو غلط نہ ہوگا) اور اس ارتباط کی وجہ سے حضرت علیؑ اور اہلبیتؑ کی دشمنی ان

---

[۱] ماضی قریب میں کتب تشیع کی ضخیم ترین کتاب الکافی کی تلخیص کی گئی اور اس کی ضعیف اور موضوع احادیث کو حذف کیا گیا اور اس طرح سے کتب تشیع کی دوسری عظیم کتاب من لا یحضرہ الفقیہ کی تلخیص و تصحیح کی گئی [illegible]

کے ضمیر و خمیر میں رچ بس گئی اور فطری طور پر ایسا ہی ہونا تھا کیونکہ جن حکام سے ان کا رابطہ رہا ہے وہ حضرت علیؑ اور آل محمدؐ کے بدترین دشمن تھے۔

انہوں نے خلفائے ثلاثہ کو حضرت علیؑ پر مقدم سمجھا۔ انہوں نے ابوسفیان اور اس کے فرزند معاویہ کے مقام کو بلند کر کے علیؑ کے ہم پایہ قرار دیا۔ ان لوگوں نے حضرت علیؑ اور آل محمدؐ کی فضیلت میں وارد ہونے والی نصوص کو تاویل و توجیہ کے ذریعے سے غیر مؤثر بنانے کی کوششیں کیں اور ان کے ماضی و حال کا رویہ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ وہ ازل سے ہی دشمنان آل محمدؐ کی تائید و حمایت کرتے آئے ہیں۔

جب میں اپنے اسلاف کی کتابوں میں یہ واقعات پڑھتا تھا تو اپنے آپ سے پوچھتا تھا کہ آخر ان لوگوں کو حضرت علیؑ سے اختلاف کیوں تھا اور حضرت علیؑ پر جو ظلم و ستم ہوئے ہیں ان کے پس منظر میں کون سے علل و اسباب کارفرما تھے؟

احمد بن حنبل کے الفاظ کو اس سوال کے ایک حصے کا جواب قرار دیا جاسکتا ہے لیکن اسے سوال کا مکمل جواب نہیں کہا جاسکتا، احمد بن حنبل اس سوال کا جواب نہ دے سکے اور اس کا مکمل جواب یہ ہے:

"رسول اکرمؐ کے وصال کے بعد لوگوں نے حضرت علیؑ کی مخالفت کی اور اس مخالفت کی وجہ سے انہوں نے حضرت علیؑ اور ان کے اہلبیتؑ کے متعلق وارد ہونے والی نصوص کا یا تو سرے سے انکار کیا اور جہاں انکار ممکن نہ تھا تو ان کی توجیہ و تاویل کر کے انہیں غیر موثر بنایا اور پھر ان جیسی خودساختہ روایات تیار کر کے اپنے ممدوح افراد کی شان کو سہارا دینے کی کوشش کی۔"

اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ کہا جائے یا اسے صداقت علیؑ کا اثر کہا جائے کہ اتنی احتیاطی تدابیر کے باوجود ان کی زبان پر بعض انتہائی فکر انگیز الفاظ جاری ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ میرا مشاہدہ ہے کہ حضرت علیؑ کے علاوہ وہ کسی خلیفہ کے لئے لفظ "امام" استعمال نہیں کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے کرم فرما یہ بھی بیان کرتے رہتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے حضرت علیؑ کی زندگی میں انہیں اپنا خدا کہا تھا۔ حضرت علیؑ نے ان لوگوں کو جلا کر خاکستر کردیا تھا۔

یہ دو باتیں سن کر مجھے بہت تعجب ہوتا تھا اور میں اپنے آپ سے یہ پوچھا کرتا تھا کہ خلفاء

کی موجودگی میں حضرت علیؑ کو ہی لفظ "امام" سے کیوں یاد کیا جاتا ہے اور ان میں ایسی کون سی خصوصیت تھی جس سے باقی خلفاء محروم تھے اور اس خوبی کی وجہ سے وہ لفظ "امام" سے ملقب ہوئے؟

حضرت علیؑ بھی رسول اکرمؐ کے ایک صحابی تھے لیکن کسی صحابی کو کسی نے خدا تسلیم نہیں کیا۔ آخر حضرت علیؑ میں ایسی کون سی بات تھی جس کی وجہ سے بعض افراد نے انہیں اپنا خدا کہا؟

ان دو سوالات کا جواب حاصل کرنے میں مجھے بہت وقت لگا اور جب میں نے تحقیق کی تو مجھے ایسی نصوص دکھائی دیں جن سے حضرت علیؑ کی خصوصیات واضح ہوتی تھیں اور ان نصوص کی وجہ سے حضرت علیؑ باقی تمام لوگوں سے ممتاز دکھائی دیے۔ حضرت علیؑ کی خصوصیات کا تذکرہ کلام خدا میں بھی موجود ہے اور فرمان رسالت میں بھی آپ کی خصوصیات کی وضاحت موجود ہے۔

حضرت علیؑ کی سب سے پہلی خصوصیت ان کا ہر رجس سے طاہر ہونا ہے اور اسی طہارت کی وجہ سے آپ رسول اکرمؐ کی جانشینی کے حقدار ہیں اور اسی وجہ سے آپ منصب امامت پر فائز ہوئے۔ لوگوں نے حضرت علیؑ میں عصمت و طہارت کا جوہر پایا لیکن سیاست نے اس کے اظہار پر پابندیاں عائد کردیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدیوں کے بعد بھی لفظ "امام" حضرت علیؑ کے لئے مخصوص دکھائی دیتا ہے۔ بعض افراد جنہوں نے حضرت علیؑ کو اپنا خدا مانا تو وہ بھی آپ کے خارق العادت معجزات کی وجہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے لیکن یہ سب کچھ اس صورت میں ہے جب ہم ایسی روایات کو صحیح تسلیم کریں۔[1]

۱۔ صحیح بخاری، ج۹، ص۱۹، باب "حکم المرتد و المرتدۃ" میں مرقوم ہے کہ چند ملحدین کو حضرت علیؑ کے پاس لایا گیا آپ نے انہیں جلا دیا۔ ابن عباسؓ کو حضرت علیؑ کے اس فیصلے کا علم ہوا تو انہوں نے کہا: اگر میں علیؑ کی جگہ ہوتا تو میں یہ فیصلہ کبھی نہ کرتا کیونکہ رسول اکرمؐ کا فرمان ہے کہ "آگ سے عذاب دینے کا حق آگ کے خالق کو ہی ہے۔" میں آگ سے جلانے کے بجائے انہیں قتل کرتا کیونکہ میں نے رسول اکرمؐ سے سنا تھا کہ "جو اپنا دین تبدیل کرے (مرتد ہو جائے) تو اسے قتل کردو۔"

احمد بن حنبل نے بھی یہ روایت مسند، ج۱، ص۲۱۷ پر نقل کیا ہے۔ اس روایت کا مقصد صرف ابن عباسؓ کی زبانی حضرت علیؑ کی توہین کرانا اور ان کے علم و فقہ کو مشکوک بنانا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت علیؑ رسول اکرمؐ کے فرمان کے خلاف فیصلہ کریں اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ابن عباسؓ، حضرت علیؑ سے بڑے عالم ہوں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ابن عباسؓ، حضرت علیؑ کے شاگرد تھے اور وہ کہا کرتے تھے کہ میرا علم علیؑ کے علم کے مقابلے میں سمندر اور قطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہمارے کرم فرما یہ بیان کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے کہ حضرت علیؑ نے اپنی الوہیت کا عقیدہ رکھنے والوں کو زندہ جلا دیا تھا لیکن یہ بیان نہیں کرتے کہ آخر ان لوگوں کی عقل پر پتھر کیوں برسے تھے اور انہوں نے آپ کو خدا کیوں مانا تھا؟

ہمارے احباب زندہ جلانے کی روایت کو اس لئے بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے تئیں اس ذریعے سے شیعیان علیؑ کو بدنام کرتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ ایسے تصورات کو ختم کرنا چاہتے ہیں جن کی وجہ سے حضرت علیؑ کی خصوصیات کا اظہار ہوتا ہو۔

اس روایت سے یہ لوگ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے بھی متداول نظریات کی تائید کی تھی اور جس نے بھی متداول نظریات سے انحراف کیا تو آپ نے اسے زندہ جلا دیا (حق یہ ہے کہ ہمارے احباب سے بات بن نہ سکی کیونکہ جن لوگوں کو حضرت نے جلایا تھا وہ آپ کو سابقہ خلفاء سے صرف افضل نہیں جانتے تھے بلکہ وہ آپ کی الوہیت پر ایمان رکھتے تھے اور کوئی بھی شخص کسی عام فرد کو کبھی بھی خدا تسلیم نہیں کرتا۔ آخر جن افراد نے آپ کو اپنا خدا تسلیم کیا انہوں نے آپ کے معجزات کو دیکھا اور آپ کی عظمت کو دیکھا لیکن وہ کم ظرف تھے اسی لئے ان کا جام چھلک پڑا اور انہوں نے آپ کو امام المتقین کہنے کی بجائے اپنا خدا کہہ دیا)۔

ہمارے کرم فرماؤں نے لوگوں کو یہ باور کرنے کی کوشش کی کہ جب حضرت علیؑ نے ان سرپھروں کو زندہ جلایا تو اس کے بعد کسی نے امامؑ کو باقی خلفاء سے ممتاز کہنے کی جسارت نہ کی اور انہوں نے لوگوں کو یہ درس دیا کہ مذہب شیعہ کی کوئی اساس نہیں ہے اور یہ مذہب دشمنان اسلام کا ساختہ پرداختہ ہے۔[1]

اگر ہم حضرت علیؑ کی باقی خصوصیات کو نظرانداز کردیں اور انہیں من کل الجہات

۱۔ اہلسنت نے ''عبداللہ بن سبا'' کے نام سے ایک جھوٹا کردار تخلیق کیا اور اس کے متعلق لکھا کہ وہ یہودی الاصل تھا اور اس نے اسلام قبول کیا اور اس نے شیعی نظریات کی بنیاد رکھی۔

سنی علماء، مذہب شیعہ کی نسبت عبداللہ بن سبا کی طرف دیتے رہتے ہیں۔ مزید تحقیق کے لئے ''سحاب السیئۃ والسبیئون'' کا مطالعہ فرمائیں۔ (علامہ سید مرتضیٰ عسکری کی کتاب عبداللہ بن سبا (تین جلدیں) اس موضوع پر مفصل کتاب ہے اور اس سے بہتر کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔)

سابقہ خلفاء کی طرح کا ایک فرد مان لیں تو بھی ہمیں حضرت علیؑ اور باقی لوگوں میں فرق روا رکھنا پڑے گا کیونکہ جب باقی خلفاء اور صحابہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے لئے رضی اللہ عنہ کا دعائیہ جملہ کہا جاتا ہے اور جب حضرت علیؑ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے لئے کرم اللہ وجہہٗ کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔

میں نے یہی بات اپنے مذہب کے علماء سے پوچھی کہ آپ حضرت علیؑ کو رضی اللہ عنہ کی بجائے کرم اللہ وجہہٗ کہہ کر کیوں یاد کرتے ہیں؟

علماء نے جواب میں کہا کہ حضرت علیؑ اور باقی صحابہ میں فرق ہے کیونکہ دیگر صحابہ نے اپنی زندگی کے کچھ ایام میں بت پرستی کی تھی جبکہ اللہ نے حضرت علیؑ کے چہرے کو مکرم رکھا تھا انہوں نے کبھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا تھا۔

چنانچہ اس سے مجھے حضرت علیؑ اور باقی صحابہ کے درمیان فرق واضح دکھائی دیا اور یوں حضرت کے لئے لفظ امام کی تخصیص اور چند افراد کی طرف سے حضرت کو خدا ماننے کی طرح سے، لفظ کرم اللہ وجہہٗ نے حضرت کی خصوصیات کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

پھر میں اہلسنت کے نظریے سے بدظن ہوگیا کہ وہ حضرت علیؑ کی ان خصوصیات کے باوجود بھی آپ کو ایک عام انسان مانتے ہیں۔

مجھے یہ جان کر سخت دکھ ہوا کہ یہ لوگ حضرت عثمانؓ کے بہت سے غلط کارناموں کے باوجود بھی انہیں حضرت علیؑ سے مقدم اور افضل مانتے ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ معاویہ جس کا تعلق مکہ کی جماعت طلقاء سے تھا اسے بھی حضرت علیؑ کے مساوی مانتے ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ یہ لوگ صغیرہ اور کچھ کبیرہ گناہوں کی حضرت علیؑ کی طرف نسبت دیتے ہیں۔

ان تمام باتوں نے مجھے ان کی فقہ اور ان کے نظریے سے متنفر کردیا اور مجھے حقیقت کی تلاش پر آمادہ کیا اور جب میں نے حقیقت کی جستجو کی تو مکتب تشیع حقیقت کا آئینہ بن کر میرے سامنے آیا اور اس مذہب کے اصول و نظریات نے مجھے سکون فراہم کیا۔

اس نئے مذہب میں مجھے حضرت علیؑ کی خصوصیات دکھائی دیں اور اہلسنت نے حضرت علیؑ کے جس علم کو صدیوں سے چھپایا ہوا تھا، وہ علم مجھے اس مذہب میں دکھائی دیا۔

اس مذہب کی وجہ سے میں نے حضرت علیؑ کو امام معصوم پایا اور صفت عصمت کو ان کی ایک خصوصیت پایا۔

فقہ اہلسنت کی وجہ سے امام علیؑ کے متعلق میں جن مشکلات سے دوچار تھا، یہاں آکر مجھے ان مشکلات سے رہائی ملی۔ مجھے تب پتا چلا کہ حضرت علیؑ کو آج تک لفظ "امام" کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ کیا تھی؟

یہاں آکر مجھے معلوم پتا چلا کہ حضرت علیؑ کو رضی اللہ عنہ کی بجائے کرم اللہ وجہہٗ کیوں کہا جاتا ہے؟

یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ بعض افراد نے آپ کو اپنا خدا کیوں تسلیم کیا؟

حضرت علیؑ کا مقام آفتاب عالمتاب کی طرح سے چمک رہا ہے۔ البتہ مکتب تسنن کے علماء نے ہر دور میں تاویل و توجیہ کا سہارا لے کر مسلمانوں کی نگاہوں سے اسے مخفی رکھنے کی کوششیں کی ہیں۔

میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ میرے وجود پر آفتاب حقیقت کی ایک جھلک پڑی جس سے مجھے صراط مستقیم دکھائی دیا اور اسی آفتاب کی تجلی کی وجہ سے مجھے عصمت و طہارت کے گھرانے کی راہ دکھائی دی اور اسی آفتاب ہدایت کی چمک نے یہ کمال دکھایا کہ مدت کا خس و خاشاک میری نگاہوں سے دور ہوگیا جس کی وجہ سے میری عقل تاریک کوٹھڑی میں قید تھی اور میں حقائق کے ادراک سے قاصر تھا۔

اجتہاد

دوسرا نکتہ جس نے مجھے تشیع کی جانب مائل کیا وہ اجتہاد کے دروازے کا کھلا رکھنا تھا جبکہ مذہب تسنن میں یہ دروازہ صدیوں سے بند پڑا ہے۔

مذہب تسنن میں مجتہد نہ ہونے سے بہت سے جدید مسائل و احکام ابہام کا شکار ہیں

جبکہ مذہب تشیع میں ایسا کوئی ابہام نہیں پایا جاتا اور مجتہد کی وجہ سے مذہب شیعہ ہر دور میں جمود سے محفوظ رہا اور اس نے علمی پیش رفت کی اور اسی اجتہاد کی بدولت جدید دور کے جملہ مسائل بالعموم اور سود اور بینک کاری کے مسائل کو بالخصوص احسن انداز سے حل کرنے میں مدد ملی۔

مذہب شیعہ میں اجتہاد، نص کے تابع ہے۔ نص کی مخالفت میں اجتہاد جائز نہیں ہے جبکہ مذہب اہلسنت میں دعویٰ تو یہ کیا جاتا ہے کہ "نص میں اجتہاد نہیں ہے" مگر ان کا عمل اس دعویٰ کے برعکس رہا ہے کیونکہ فقہائے اہلسنت نے حضرت عمرؓ کے ان اجتہادات کی تائید کی ہے جو انہوں نے نص کے مقابلے میں کئے تھے اور اس اجتہاد کو یہ کہہ کر حضرت عمرؓ کا خاصہ قرار دیا ہے کہ ان کا تعلق خلفائے راشدین سے تھا اور رسول اکرمؐ نے ان کی تعریف کی تھی۔[1]

مکتب تشیع میں اجتہاد کی بنیاد تین چیزوں یعنی قرآن، سنت اور عقل پر رکھی گئی ہے جبکہ اہلسنت میں اجماع، قیاس اور استحسان وغیرہ کو بھی اساس اجتہاد کہا گیا ہے لیکن تشیع انہیں قبول نہیں کرتی۔

اہلسنت نے مذکورہ مصادر کو اساس اجتہاد تسلیم کر کے غلطی کی کیونکہ ان کی وجہ سے بدعات اور اسلام کی شکل و صورت کو مسخ کرنے والے احکام کے لئے دروازہ کھل گیا۔

مکتب تشیع کے تحت لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک جامع الشرائط مجتہد اعلم کی تقلید کریں اس لئے آپ کو کوئی بھی شیعہ ایسا دکھائی نہیں دے گا جو مجتہد اعلم کا مقلد نہ ہو۔[2]

تقلید کا مفہوم یہ ہے کہ انسان فقہی مسائل میں مجتہد کے فتوئی کے مطابق عمل کرے۔ تقلید کے لئے مطلق پیروی کی ضرورت نہیں ہے اور مقلد کے لئے ضروری ہے کہ وہ خمس و زکوٰۃ کے اموال شرعیہ اپنے مرجع تقلید کے پاس جمع کرائے۔

شیعوں کے نزدیک مسائل فقہی پر بحث کرنا فقہاء و مجتہدین کے ساتھ مخصوص ہے اور

۱۔ مرحوم سید عبدالحسین شرف الدین کی کتاب "النص والاجتہاد" کا مطالعہ فرمائیں۔

۲۔ ہر مرجع کے مختلف ممالک میں وکلاء موجود ہوتے ہیں اور ہر مرجع کا ایک عملیہ ہوتا ہے جس میں عبادات و معاملات کا بیان مذکور ہوتا ہے اور مراجع کے عملیہ جات چند اختلافی مسائل کے علاوہ ایک دوسرے سے یکساں ہوتے ہیں اور ان عملیہ جات میں بینک اور سود جیسے جدید مسائل بھی موجود ہوتے ہیں۔

عوام الناس کے لئے فقہی مسائل پر بحث کرنا ناجائز ہے اور اس نظریے کی وجہ سے شیعوں میں نظم وضبط پایا جاتا ہے اور یہ نظم وضبط انہیں بہت سی بدعات اور کجروی سے محفوظ رکھتا ہے جبکہ مذہب سنی میں ایسی پابندی نہیں ہے اس لئے ان میں بہت سے گروہوں نے جنم لیا اور مذہبی تنازعات کی شدت ان کے ہاں زیادہ دکھائی دیتی ہے۔

اس پراگندگی کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس اسے روکنے کے لئے کوئی قاعدہ وضابطہ نہیں ہے اور اس قضیہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ عوام مسلمین فقہائے اہلسنت پر چنداں اعتماد نہیں کرتے جبکہ اہل تشیع اپنے مجتہد کا بے حد احترام کرتے ہیں اور مسئلہ تقلید کے متعلق یہ عرض کرنا انتہائی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ مکتب تشیع میں صرف زندہ مجتہد کی تقلید کی جاتی ہے اسی لئے جب مرجع تقلید دنیا سے رخصت ہو جائے تو مقلد کو دوسرے مجتہد اعلم کی تقلید کرنا پڑتی ہے اور زندہ مجتہد کی تقلید کا فلسفہ یہ ہے کہ مقلد کا موجودہ حالات سے براہ راست تعلق ہونا چاہئے اور اس کی نظر حال اور مستقبل پر ہونی چاہئے۔

تقلید میت سے اس لئے روکا گیا ہے کہ وہ کہنہ پرستی اور ایک خط پر قائم رہنے کے مترادف ہے جس کی وجہ سے تعصب و جمود جنم لیتا ہے اور یہ تعصب و جمود ہمیں اہلسنت میں بہت زیادہ دکھائی دیتا ہے کیونکہ وہ ابھی تک اہل قبور کے فتاویٰ پر باقی ہیں۔

مکتب تشیع میں باب اجتہاد کھلا رہنے کی وجہ سے واقعیات اور جدید مسائل کو سلجھانے کی زیادہ صلاحیت پیدا ہوئی ہے اور اس بلند فکری کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب شیعہ کے پیروکاروں کو آپ جزوی مسائل میں لڑتا جھگڑتا نہیں پائیں گے جبکہ دروازہ اجتہاد بند ہونے سے مکتب تسنن کے پیروکار جزوی مسائل میں الجھ کر رہ گئے ہیں جیسا کہ آج کل یہ لوگ داڑھی، عربی لباس، زنانہ نقاب، ہنر و فرہنگ کی حرمت، سیاست میں عدم شمولیت اور عیسائیوں سے جھگڑنا جیسے مسائل میں بری طرح سے الجھے ہوئے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ مکتب تسنن زندگی کے حقائق سے بہت دور ہو چکا ہے۔

مذہبی ادارہ

مکتب تشیع کے نزدیک جو چیز مذہبی بنیاد کو مشخص کرتی ہے وہ اس کی حکومت کے اثرات سے آزادی ہے اور حکومتوں سے دور رہ کر تشیع نے ہمیشہ بے باک اور جرأت مندانہ موقف اپنایا جس کی وجہ سے ماحول میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ (آج تک تشیع نے حکومتی بیساکھیوں کا کبھی سہارا نہیں لیا اور مکتب تشیع نے اقتدار کے ایوانوں اور تخت و تاج کے سائے میں پرورش نہیں پائی۔)

مکتب تشیع کے علماء نے حکومتی سرپرستی کو کبھی قبول نہیں کیا۔ حکومت کی بجائے ان کا اپنے عوام سے براہ راست رابطہ رہا اور وہی عوام ان کے فتاویٰ پر عمل کرتے تھے اور اپنے اموال شرعیہ ان کے پاس جمع کراتے اور ان کے احکام کی دل و جان سے پابندی کرتے تھے۔

حقیقت حال کی وضاحت کے لئے بطور مثال یہ سمجھیں آپ کسی مجتہد کے گھر جائیں یا آپ کسی مجتہد کے دفتر میں جائیں تو آپ کو اس کے گھر اور اس کے دفتر میں سربراہ مملکت کی تصویر لگی ہوئی دکھائی نہیں دے گی۔ حوزہ علمیہ کے طلباء کے ہاں بھی آپ کو حکمرانوں کی تصاویر دکھائی نہیں دیں گی۔

عوام کا مذہبی ادارہ سے گہرے روابط کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے لئے ماضی قریب کے ''انقلاب تمباکو'' کی مثال ہی کافی ہے۔

برطانیہ کی کمپنیوں نے مملکت ایران سے تمباکو کا ایک معاہدہ کیا تھا لیکن اس وقت کے مرجع عالی قدر نے محسوس کیا کہ یہ معاہدہ دراصل ایران کے استحصال کا ذریعہ ہے تو انہوں نے تمباکو نوشی کی حرمت کا فتویٰ صادر کر دیا۔

جیسے ہی ان کا فتویٰ جاری ہوا پورے ایران میں لوگوں نے تمباکو نوشی کو ترک کر دیا جس کی وجہ سے برطانیہ کی تمباکو کمپنیوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا اور انہیں اپنے تمام دفاتر بند کرنے میں عافیت دکھائی دی۔

اسی طرح سے ایک مرجع عالی قدر کے ایک چھوٹے سے فتوے نے ملک کو اغیار کی

غلامی اور استحصال سے محفوظ رکھا۔[1]

شیعہ عوام اپنے مراجع سے براہ راست مربوط رہتے ہیں اس کی مثال کے لئے ۱۹۰۶ء کی تحریک مشروطہ کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ تحریک علماء نے چلائی تھی اور عوام نے اس کی بھرپور تائید کی تھی جس کے نتیجے میں حکومت کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ شریعت محمدیؐ اس ملک کا اساسی قانون ہوگی اور قوانین کی وضاحت کے لئے مجتہدین پر انحصار کیا جائے گا۔[2]

ایران کا اسلامی انقلاب دور حاضر کا عظیم معجزہ ہے اور یہ معجزہ عوام کی بھرپور شرکت کی وجہ سے رونما ہوا ہے۔ اگر مجتہدین کا عوام سے براہ راست رابطہ نہ ہوتا تو وہ انقلاب برپا کرنے میں کبھی بھی کامیاب نہ ہوتے۔

شیعہ عوام اپنے معنوی رابطے کی وجہ سے اپنے مراجع کا احترام کرتے ہیں اور اس احترام کے ڈانڈے مسئلہ امامت سے جاکر ملتے ہیں۔ شیعہ اپنے مرجع کا احترام اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اسے اپنے واجب الاطاعت امام غائب کا جانشین تصور کرتے ہیں جبکہ مذہب اہلسنت میں اطاعت کا تعلق دینی رہنماؤں کی بجائے حکام وقت سے ہے اور فقہاء کا تعلق عوام کی بجائے براہ راست حکومت سے ہوتا ہے اور فقہائے اہلسنت حکومت سے تنخواہیں وصول کرتے ہیں اور اس مکتب میں فقیہ ہمیشہ حکومت کے دست نگر ہوتے ہیں اس لئے وہ ہمیشہ فتویٰ دیتے وقت قوم کے مفاد کی بجائے حکام کے مفادات کو ترجیح دیتے ہیں۔

۱۔ فقہائے شیعہ تمباکو نوشی کو حرام نہیں جانتے البتہ ۱۸۹۱ء میں میرزا شیرازی قدس سرہ نے تمباکو کی حرمت کا اعلان کیا تھا اور اس فتویٰ کا پس منظر یہ تھا کہ برطانیہ کی ایک کمپنی نے حکومت ایران سے تمباکو کے متعلق پچاس سالہ معاہدہ کیا تھا اور انگریز اس معاہدے کی آڑ میں ایران کا استحصال کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے میرزا شیرازی نے اس وقت یہ فتویٰ جاری کیا تھا کہ تمباکو کا استعمال حرام اور امام زمانہؑ سے جنگ کے مترادف ہے۔

۲۔ علماء اور ملت ایران کے پرجوش مطالبات اور جلوسوں کے بعد ایران کے شہنشاہ مظفر الدین کو ان کا مطالبہ ماننا پڑا اور ۱۵ اگست ۱۹۰۶ء کو سرکاری اعلامیہ جاری کیا گیا جس میں مذہب شیعہ کو ایران کے سرکاری مذہب کا درجہ دیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ آج بہت سے اسلامی گروہ اس مذہبی ادارے پر تنقید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس کے متعلق ان کا موقف یہ ہے کہ یہ ادارہ اسلام کی بجائے حاکم کی خدمت میں مصروف ہے۔

اس لئے اہلسنت کا مذہبی ادارہ ایک سخت مشکل میں مبتلا ہے اور اسے اپنی بنیادیں ڈانواں ڈول دکھائی دیتی ہیں اور انہیں اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا ہے اور آج یہ ادارہ اپنی وقعت و حیثیت کھوچکا ہے کیونکہ عوام کو اس ادارے پر اعتماد نہیں رہا اور عوام انہیں حاکم کے مفادات کے تحفظ کا ایک ذیلی ادارہ سمجھتے ہیں اور یہ ادارہ قوت عمل سے اس لئے محروم ہے کہ وہ مردہ مجتہدین کی فقہ کے زیر اثر ہے۔

تشیّع پر دو اہم اعتراض

عصمت وغیبت

جب میں شیعہ عقائد کی تحقیق میں مصروف تھا تو شیعیت میں مجھے دو ایسی باتیں دکھائی دیں جنہوں نے ایک عرصہ تک مجھے پریشان کئے رکھا اور وہ تھیں عصمت اور غیبت۔

شیعہ علماء نے ان اشکالات کے انتہائی تسلی بخش جواب دیئے ہیں لیکن اُس وقت جو کتابیں میری دسترس میں تھیں، اُن میں اِن امور کے متعلق کوئی تسلی بخش بحث موجود نہیں تھی جس کی وجہ سے میری حیرانی اور سرگردانی بدستور قائم رہی۔ شیعہ مخالفین کے زیادہ تر اعتراضات کا تعلق بھی انہی دو امور سے ہے اور یوں بائیں بازو والے اور لبرل قسم کے افراد ان دو امور کو شیعوں کی کمزوری بناکر عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بہرنوع ان دو امور کی وجہ سے مجھے بہت سے سوالات کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ میرے لئے ضروری ہوگیا تھا کہ میں ان امور کے متعلق زیادہ سے زیادہ تحقیق کرکے اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کروں۔ تحقیق کے دوران میں بھی چند نتائج پر پہنچتا تھا لیکن ان نتائج کو کسی طور بھی تسلی بخش نہیں کہہ سکتا تھا۔

غلط فہمی کا سرچشمہ

ایک طویل سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جس طریقۂ کار کے تحت میں ان امور کو ایک جداگانہ انداز میں حل کرنا چاہتا ہوں وہ طریقۂ کار ہی بنیادی طور پر غلط ہے۔ اس غلطی کی وجہ یہ تھی کہ میں مذکورہ دونوں امور کو بالکل جداگانہ حیثیت دیتا تھا اور یوں میں بھی دوسرے مخالفین کے ساتھ مل کر ان امور پر بحث کرتا رہتا تھا جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان

دونوں امور کو جداگانہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ یہ دونوں امور مسئلہ امامت سے مربوط ہیں اور شجرۂ امامت کے لئے بمنزلہ ثمر ہیں اور جب تک مسئلہ امامت واضح نہ ہوجائے اس وقت تک یہ امور بھی واضح نہیں ہوسکتے۔

امامت اصل ہے اور عصمت وغیبت اس کی دو شاخیں ہیں اس لئے عصمت وغیبت کی معرفت مسئلہ امامت کی معرفت پر موقوف ہے اور امامت کی معرفت کے بغیر ان امور کو جاننا انتہائی مشکل ہے۔

اس نکتے پر پہنچنے کے بعد میں نے مسئلہ امامت پر دوبارہ تحقیق شروع کی جس کی وجہ سے میں ایک اہم نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا اور وہ نتیجہ یہ ہے کہ عقلی طور پر امامت کو اصول دین میں سے ایک اصل کے عنوان سے تسلیم کرنا ضروری ہے کیونکہ امامت اسلام کا حقیقی ستون ہے اور اگر اسلام سے امامت کو جدا کرلیا جائے تو اسلام کا چہرہ بدنما اور اس کی حقیقت مخفی ہوجائے گی اور یوں اسلام میں تحریف کرنا انتہائی آسان ہوجائے گا اور اسلام کے متون متغیر ہوجائیں گے۔ مسئلہ امامت کو ایک ضمنی مسئلے کے عنوان سے بیان کرنا صحیح نہیں ہے اور اہلسنت نے اس مسئلے کو ایک ضمنی مسئلہ قرار دے کر اسے غیر اہم بنانے کی بڑی کوشش کی ہے مگر اس انکار کے باوجود تاریخی حقائق سے اس مسئلے کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

آیئے! ہم اس مسئلے کا فقہائے اہلسنت کی نظر سے جائزہ لیں:

شہرستانی لکھتے ہیں:

''اسلام کی تاریخ میں جتنا اختلاف مسئلہ امامت کے متعلق پیدا ہوا اتنا کسی اور مسئلے پر دیکھنے میں نہیں آیا۔'' (الملل والنحل، شہرستانی، ج۱، ص۳۰)

شہرستانی کی اس صاف گوئی سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ امامت ایک انتہائی اہم مسئلہ ہے اور اس مسئلے کو غیر اہم کہہ کر اس سے چشم پوشی کرنا صحیح نہیں ہے۔ فقہائے اہلسنت نے امامت اور خلافت کے مفہوم میں تفریق پیدا کی اور مفہوم امامت کو حکومت وسلطنت میں منحصر کردیا اور یہی مفہوم شہرستانی کے مدنظر تھا۔

فقہائے اہلسنت کی نظر میں امامت کی حیثیت ایک اجتماعی امر کی سی ہے، جس کا مقصد

لوگوں پر حکومت کرنا ہے اور امام کے لئے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے:

۱۔ اس کا تعلق نسل قریش سے ہو۔

۲۔ وہ اپنے احکام نافذ کرنے کی قوت رکھتا ہو اور ان دو شرائط کے علاوہ امام کے لئے کسی تیسری شرط کی ضرورت نہیں ہے۔

مذہب اہلسنت میں امام کے لئے عدالت غیر ضروری ہے لہٰذا ایک فاسق اور ظالم کو بھی مسلمانوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے اور مسلمانوں پر اس کی اطاعت فرض ہے۔ اگرچہ حکمراں لوگوں پر ظلم و ستم کرے، انہیں ناجائز تازیانے مروائے، بیت المال کو اپنے ذاتی تصرف میں لائے پھر بھی مسلمانوں کے لئے اس کی اطاعت سے انحراف کرنا جائز نہیں ہے اور اس کے خلاف بغاوت کرنا تو اور بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔

مذہب اہلسنت میں امام کی یہی تصویر ہے اور اس کے متعلق ہمیں زیادہ بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہ تصویر انتہائی قبیح ہے۔ یہ تصویر منصب امامت کے تقاضوں کی نفی کرتی ہے اور اس عظیم منصب کو مشکوک بناتی ہے لہٰذا اگر ایسے بدکردار افراد امت کے امام بن جائیں اور اسلام ایسے لوگوں کا مرہون بن جائے تو اسلام اور امت اسلامی دونوں تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد ایسا ہی ہوا اور بنوامیہ اور بنوعباس کے حکمران امت کے امام کہلائے اور فقہاء نے ان کے متعلق فتویٰ دیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے ان کی حکومت کی بشارت دی تھی اور لوگوں کو ان کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔ ایسے ائمہ کی امامت نے تاریخ میں کون سے گل کھلائے اور ایسی امامت نے امت کی صلاح و فلاح کے لئے کیا کیا؟ اس امامت کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کا نازل کردہ اسلام رخصت ہوگیا اور اس کی جگہ حکمرانوں کا ساختہ پرداختہ اسلام منظر عام پر آیا۔

مذہب اہلسنت میں مسئلہ امامت سیاست کی نذر ہو کر رہ گیا اور امام اور امامت کے متعلق جتنے بھی فرمان تھے ان سب کی توجیہ کچھ اس انداز سے کی گئی جس سے طبقۂ حکام کے مفادات کی تکمیل ہوئی اور ان کی حکومت کو سند جواز فراہم کی گئی۔

حجاج بن مسلم نے اپنی صحیح میں رسول اکرمؐ کی حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرتؐ نے

فرمایا: امر امامت ختم نہ ہوگا تاآنکہ بارہ خلفاء پورے نہ ہو جائیں۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ وارد ہیں: اسلام بارہ خلفاء تک معزز و محترم رہے گا۔

(صحیح مسلم، ج ۳، ص ۱۴۵۲، حدیث ۵، ۷، ۸، کتاب الامارہ، باب الناس تبع القریش)

اس حدیث نے سنی علماء کو انتہائی پریشان کیا اور وہ جستجو کرتے رہے کہ اس سے مراد کون سے بارہ خلفاء ہیں۔ آخرکار انہوں نے بارہ خلفاء کی تعیین کچھ اس طرح سے کی:

(۱) حضرت ابوبکرؓ (۲) حضرت عمرؓ (۳) حضرت عثمانؓ (۴) حضرت علیؑ (۵) معاویہ بن ابی سفیان (۶) یزید بن معاویہ (۷) عبدالملک بن مروان (۸) ولید بن عبدالملک (۹) سلیمان بن عبدالملک (۱۰) یزید بن عبدالملک (۱۱) ہشام بن عبدالملک (۱۲) عمر بن عبدالعزیز۔ (شرح عقیدة الطحاویہ، ص ۴۹۳)

بارہ ائمہ کی حدیث سے بنی امیہ کے بارہ حکمرانوں کو مراد لینے کا صاف مطلب یہی ہے کہ حدیث کے مفہوم میں سیاست کو ملوث کیا گیا ہے اور جس مسلک و مذہب کا چھٹا خلیفہ یزید پلید ہو تو اس مذہب کا خدا ہی حافظ ہے۔

یزید جو کہ منبع فساد تھا، یزید جس نے نواسۂ رسولؐ کو شہید کرایا، یزید جس نے حرم رسولؐ کو قیدی کر کے شہر بہ شہر پھرایا، یزید جس نے مدینہ منورہ پر حملہ کیا، یزید جس نے ہزاروں بے گناہوں کا خون بہایا اور ہزاروں عصمتیں تار تار ہوئیں، یزید جس نے خانۂ کعبہ پر منجنیق سے سنگ باری کرائی اس کے باوجود بھی وہ خلیفہ رسول ہے اور اس کا شمار ان خلفاء میں کیا گیا جن کے متعلق رسول اکرمؐ نے امت کو یہ کہہ کر بشارت دی تھی کہ میرے بارہ خلفاء دین کی عزت و عظمت کے نگہبان ہوں گے۔

اماموں کی مذکورہ بالا فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے اہلسنت کی نظر میں مسئلہ امامت کی کوئی قدر و قیمت اور کوئی بنیاد و اساس نہیں ہے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مذہب اہلسنت میں سیاست کا نفوذ بہت زیادہ ہے۔ یہاں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ:

۱۔ اہلسنت امام سے عدالت کی شرط کی نفی کیوں کرتے ہیں؟

۲۔ اسلام کو ایسے ظالم و فاسق حکمرانوں کا گروی رکھنے پر اتنا اصرار کیوں کرتے ہیں؟

۳۔ خلافت و امامت کو اس طرح سے مربوط کیوں کرتے ہیں؟

تاریخی واقعات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن حکام کو فقہاء نے ائمہ مسلمین ہونے کی سند دی تھی وہ اپنے اپنے دور کے جابر و ظالم حکمران تھے اور عوام مسلمین ان کے کردار کو دیکھ کر یہ ماننے پر آمادہ نہیں تھے کہ یہ وہی ہیں جن کے متعلق رسول اکرمؐ نے اپنی امت کو بشارت دی تھی۔ اس لئے فقہاء نے ان ظالم و غاصب حکمرانوں کو ائمہ حق کا متبادل ثابت کرنے کے لئے عدالت کی شرط کو ہی حذف کردیا۔

اگر امامت کے لئے عدالت کی شرط کو لازمی قرار دیا جاتا تو ایسے ظالم و فاسق حکام کی اسلام میں گنجائش نہیں نکل سکتی تھی کیونکہ مذکورہ حکمران اپنے اپنے دور کے ظالم، فاسق، غاصب اور مسلمانوں کی عزت و ناموس کے لٹیرے تھے اور ان کا اسلامی تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ان کی زندگی کا واحد مقصد اپنی کرسیٔ اقتدار کو مضبوط کرنا تھا۔

پھر ان حکام نے اقتدار مملکت اپنے ہاتھ میں رکھا اور دینی زعامت اپنے کاسہ لیس فقہاء کے ہاتھ میں دیدی اور یوں حکومت اور ملائیت کا گٹھ جوڑ قائم ہوا۔ حکمران اپنے لئے جب بھی کوئی خطرہ محسوس کرتے تھے تو فقہاء سے مدد حاصل کرتے تھے اور فقہاء وضعی و خود ساختہ روایات سے امت اسلامیہ کو مطمئن کرکے پھر گراں خوابی میں مبتلا کردیتے تھے۔

بحیثیت مسلمان اگر ہمارا ختم نبوت پر ایمان ہے اور ہم یہ ایمان رکھتے ہیں کہ رسول اکرمؐ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا تو ہمیں اسلام کی حفاظت اور نگہبانی کے لئے ایسے افراد کی ضرورت محسوس ہوگی جو گفتار رسولؐ اور کردار رسولؐ کے سچے محافظ ہوں جن کا قول رسولؐ کا قول ہو اور جن کا فعل رسولؐ کا فعل ہو۔

نظریۂ ختم نبوت پر ایمان رکھنے کی وجہ سے ہم ظالم حکمرانوں کو پیغمبر اکرمؐ کے جانشین نہیں مان سکتے۔ پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی کے لئے ایک برگزیدہ اور اوصاف حمیدہ رکھنے والے گروہ کی ضرورت ہے جو رحلت پیغمبرؐ کے بعد جانشینی کا منصب سنبھالیں اور تمام اہل ایمان کے لئے مرکز عقیدت ثابت ہوں۔

یہاں سے امامت کا حقیقی چہرہ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے اور امامت کی افادیت کھل کر واضح ہوتی ہے کہ امامت صراط رسولؐ کو جاری رکھنے والی تحریک کا دوسرا نام ...

اگر امامت راہ نبوت کے جاری رکھنے کے لئے ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ امام ایسے شخص کو ہونا چاہئے جو علم و عمل کے بلند ترین مقام پر فائز ہو تاکہ تمام امت اسلامیہ کی محبت و تعظیم کا مرکز بن سکے اور اس کے کردار میں اتنی جاذبیت ہو کہ لوگ اس کی پیروی کریں اور اس سے احکام اسلام معلوم کرکے اطمینان حاصل کریں۔

اس نکتے سے آگاہ ہونے کے بعد جب میں نے مکتب تشیع اور مکتب تسنن میں مسئلہ امامت کا تقابلی مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ امامتِ اہلبیتؑ، حقیقی امامت ہے اور حکام و فقہاء نے مل کر یہ سازش کی کہ لوگوں کو حقیقی رہنماؤں سے دور رکھا جائے۔ حقیقی ائمہ کو پوری طرح سے منظر عام پر ہی نہ آنے دیا جائے اور رسول اکرمؐ نے امت کو جن بارہ ائمہ کی بشارت دی تھی اس سے ائمہ اہلبیتؑ ہی مراد ہیں۔

اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ائمہ اہلبیتؑ بلند ترین مقام رکھتے تھے اور خداوند عالم نے انہیں بہت سی خصوصیات سے نواز کر انہیں منصب امامت کے قابل بنایا تھا اور جب ائمہ ہدیٰ اور ان کے مدمقابل حکمرانوں کی شخصیات کا موازنہ کیا جائے تو ائمہ ہدیٰ کا پلڑا بھاری دکھائی دے گا۔

معاویہ کا حضرت علیؑ اور حضرت حسنؑ سے موازنہ کرنا کسی طور بھی صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح سے یزید بن معاویہ اور امام حسینؑ کا کوئی موازنہ ہی نہیں ہے اور ہشام بن عبدالملک اور امام زین العابدینؑ کا یکساں اور مساوی قرار پانا ناممکن ہے۔

ہشام اور امام محمد باقرؑ، منصور اور امام جعفر صادقؑ، ہارون الرشید اور امام موسیٰ کاظمؑ، مامون الرشید اور امام علی رضاؑ، معتصم اور امام محمد تقیؑ، معتز باللہ اور امام علی نقیؑ، معتمد باللہ اور امام حسن عسکریؑ کو ایک دوسرے کے مساوی قرار دینا صرف ناممکن ہی نہیں بلکہ محال بھی ہے۔

ہمیں اس حقیقت کا شدت سے احساس ہے کہ نور و ظلمت کا کوئی مقابلہ نہیں۔ علم و جہل کا کوئی موازنہ نہیں لیکن کیا کریں جب تک تاریکی کی وحشتناکی سامنے نہ ہو اس وقت تک روشنی کی قدر و قیمت معلوم ہی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح سے جب تک غاصب حکمرانوں کی مکروہ شخصیات سامنے نہ ہوں اس وقت تک ہم دین کے حقیقی ائمہ کو پہچان نہیں سکیں گے۔

جب ہم فریق مخالف کے فسق و فجور کو جان لیں گے تو ائمہ اہلبیتؑ کا زہد و تقویٰ کھل کر ہمارے سامنے آئے گا۔

جب حقیقی ائمہ کے حریف افراد کی دنیا پرستی اور خواہشات پرستی ہمارے سامنے ہوگی تو ائمہ ہدیٰ کی طرف سے آخرت سے محبت اور ابدی جہان سے تعلق ہمارے سامنے واضح ہوسکے گا۔

جب ہمیں غاصب حکمرانوں کا اسلام سے انحراف دکھائی دے گا تو ائمہ ہدیٰ کی دین سے محبت آئینے کی طرح سے ہمارے سامنے آئی گی۔

جب ہم غاصب حکمرانوں کے اسلام کو جان لیں گے تو ہمارے لئے ائمہ ہدیٰ کے اسلام کو سمجھنا انتہائی آسان ہو جائے گا۔

جب ہم سلاطین اور ان کے درباری مفتیوں اور ملاؤں کی پُر تعیش زندگی کو دیکھیں گے اور اس کے مد مقابل ائمہ اہلبیتؑ کو سادہ زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھیں گے تو ہمیں ائمہ کے اسلام اور حکام کے اسلام کا فرق دکھائی دے گا۔

ائمہ ہدیٰ نے ہر دور میں ظلم و ستم برداشت کئے اور ان کی پوری زندگی تکالیف و مصائب سے عبارت تھی مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ خصوصیت عطا کی تھی کہ انہوں نے حکام کی خواہشات کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا اور اسلام کو ہر طرح کے انحراف سے بچائے رکھا۔

یہاں سے مسئلہ عصمت واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ رسول اکرمؐ کے بعد ائمہ ہدیٰ نے اپنے عظیم الشان کردار سے امت کے سامنے اپنی معصومانہ زندگی کو پیش کیا۔

عصمت

مسئلہ امامت پر ایک سطحی اور سرسری نظر ڈالنے سے مسئلہ عصمت کی پہچان کرنا مشکل ہے۔ جس طرح سے ہم نے فقہائے قوم سے اس مسئلے کو سنا ہے اس انداز سے مسئلہ عصمت کی وضاحت بڑی مشکل ہے۔

مسئلہ عصمت کو سمجھنے کے لئے پرانی روش اور سابقہ طرز فکر کو خیر باد کہنا پڑتا ہے اور جب تک انسان حکام کو اپنا امام تسلیم کرتا رہے اور حکام کے علانیہ فسق و فجور کے باوجود بھی یہ

نظریہ رکھے کہ رسول اکرمؐ نے ان ہی کے متعلق اپنی امت کو خوشخبری دی تھی تو اس وقت تک انسان مسئلہ عصمت کو قبول نہیں کرسکتا۔

امامت کی حقیقت اگر انسان پر پوشیدہ ہو اور فقہاء کے وضع کردہ نظریۂ امامت کے علاوہ اسے کچھ معلوم نہ ہو تو اس حالت میں مسئلہ عصمت کو سمجھنا انتہائی مشکل ہے۔

میرے لئے مسئلہ عصمت کو سمجھنا اس لئے مشکل ہوگیا تھا کہ میں نے مسئلہ امامت کا مطالعہ تسنن کی عینک سے کیا تھا اور ائمہ اہلبیتؑ نے جو کچھ امامت کے متعلق فرمایا ہے وہ مطالب میرے ذہن میں موجود نہیں تھے۔

مذہب اہلسنت نے خیر سے جو امام پیش کئے ہیں انہیں دیکھ کر ذہن میں بہت سے شکوک و شبہات جنم لیتے ہیں اور انسانی ذہن یہ مطالبہ کرتا ہے کہ امامت کا دوسرا حقیقی نمونہ تلاش کیا جائے کیونکہ اسلام کو ایسے حکام کے رحم و کرم پر چھوڑا نہیں جاسکتا اور اسلام کے مستقبل کو ان سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ جب فقہاء نے امامت کو حکام کے ساتھ مربوط کیا تو انہوں نے امت کے افراد کو دو چیزوں میں سے ایک کے انتخاب کا حق دیا:

الف: امت اپنا دین حکام سے حاصل کرے۔

ب: یا اپنا دین فقہاء سے حاصل کرے۔

امت نے دوسری شق کو قبول کیا مگر دوسری شق بھی پہلی ہی شق سے مربوط تھی۔ امت نے دین کے لئے فقہاء کو چنا اور فقہاء نے پوری امت کو سلاطین کے دروازوں پر جھکایا۔

حکام و فقہاء کی ملی بھگت کے باوجود بھی حقیقی ائمہ کے موجود نہ ہونے سے جو خلا پڑ گیا تھا وہ پھر بھی پورا ہونے میں نہ آیا۔

اس لئے مسئلہ عصمت کا سمجھنا حقیقی امام کے اثرات کو سمجھنے پر موقوف ہے۔ امامت کے متعلق یہ جاننا ضروری ہے کہ:

کیا امامت حکومت و ریاست کا نام ہے؟

اور کیا امامت اسلام کے نام لینے کا نام ہے؟

یا دونوں کے مجموعے کا نام ہے؟

اگر رسول اکرمؐ کے بعد سلسلۂ نبوت جاری رہتا اور آپ کے بعد انبیاء نے آنا ہوتا تو

ہم پہلے جواب کو قبول کر لیتے اور یہ تسلیم کر لیتے کہ امامت حکومت و ریاست میں منحصر ہے لیکن رسول اکرمؐ پر اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ نبوت ختم کر دیا اور آپ خاتم الانبیاءؐ ہیں اسی لئے منصب امامت کے لئے ایسے افراد کی ضرورت ہے جو رسول اکرمؐ کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کر سکیں اور مسلمانوں کو ارتداد اور رجعت قہقری سے محفوظ رکھ سکیں۔

امام، پیغمبر کا نمونہ ہوتا ہے اور امت اس کے فیض وجود سے مستفید ہوتی ہے اور اگر اس کے برعکس فقہاء کے نظریے کو صحیح مان لیا جائے اور ہر کس و ناکس کو امام مان لیا جائے تو یہ امامت کی توہین ہوگی اور اس نظریے کو تسلیم کر کے ہم درحقیقت امامت کے منصب کو بے کار اور لایعنی قرار دیں گے۔ اگر فاسق و فاجر قسم کے افراد کو منصب امامت پر فائز شخصیت کے عنوان سے تسلیم کر لیا جائے تو ایسا امام امت کی رہنمائی کیسے کر سکے گا؟

ان فقہاء کی ستم رانیوں کا رونا کہاں تک رویا جائے۔ ان لوگوں نے اہلبیتؑ سے امامت کو جدا کیا اور ان کی بجائے حکام کو امامت پر فائز کیا۔ فقہاء کا ظلم صرف یہاں تک محدود نہیں رہا بلکہ ان لوگوں نے امامت کو اسلام سے جدا کیا اور اس طرح سے حکومت اور دین دونوں کو سیاست دانوں کے ہاتھوں میں گروی رکھ دیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام ان کی خواہشات کے درمیان پارہ پارہ ہو کر رہ گیا اور ہوا و ہوس کی قربان گاہ پر مسلمانوں کو بھینٹ چڑھنا پڑا۔ چنانچہ ثابت ہوتا ہے کہ امام دین کا نگہبان ہوتا ہے اور رسول خداؐ کے بعد وہ امت کا رہنما ہوتا ہے اسی لئے اس کا معصوم ہونا ضروری ہے۔

اگر امام غیر معصوم ہو تو اس کے بھٹکنے کا ہر وقت احتمال موجود رہے گا اور وہ اپنی ذمہ داری کو احسن انداز سے ادا کرنے سے قاصر ہوگا۔

اگر امام اور عوام میں کوئی فرق نہ ہو تو اسے عوام پر کوئی امتیاز حاصل نہ ہوگا اور یوں وہ رہبری کی خصوصیت سے عاری متصور ہوگا۔

اگر امام عوام جیسا ہی ایک عام فرد ہو تو رسول خداؐ کی ختم نبوت بیکار ہو جائے گی اور اس صورت میں کسی اور نبی کی ضرورت محسوس ہوگی جو صفات نبوت و عصمت سے آراستہ ہوتا کہ لوگ اس کی رہبری سے مطمئن ہو کر اس کے احکام کو دل و جان سے بجا لائیں۔

امت عرب بھی دیگر امتوں کی طرح سے ایک امت ہے اور جو کچھ دوسری امتوں پر گزرا اس پر بھی گزرنا تھا اور جس طرح سے دوسری امتیں اپنے انبیاء کے بعد ارتداد و انحراف کا شکار ہوتی رہیں اس امت کے متعلق بھی اسی ارتداد و انحراف کا خدشہ موجود تھا اور اللہ تعالیٰ کی سابقہ امتوں سے یہ سنت رہی ہے کہ جب بھی کوئی امت انحراف کا شکار ہوتی تھی تو اللہ تعالیٰ ان کی اصلاح کے لئے نبی بھیج دیتا تھا اور امت اسلامیہ آخری امت ہے اور امت اسلامیہ کے رسولؐ، اللہ کے آخری رسولؐ ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ امت کے انحراف کو روکنے کے لئے کسی نبی و مبعوث نہیں کرے گا البتہ صفات انبیاء رکھنے والے ائمہ کو دین کا نگران بنا کر بھیجے گا۔

جب میں اس حقیقت تک پہنچا تو مسئلہ عصمت میرے لئے حل ہو گیا اور میں شک کے دائرے سے نکل کر منزل یقین پر پہنچ گیا۔

علاوہ ازیں میرے لئے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ ہم میں سے ہر شخص کچھ نہ کچھ عصمت کا حامل ہے اور ہر شخص کی عصمت دوسرے کی عصمت سے جدا ہے اور جتنا جس کا ایمان و تقویٰ بلند ہوتا جائے گا اتنا ہی اس کی عصمت بلند ہوتی جائے گی۔ (اور عصمت کو سمجھنے کے لئے اس مثال پر غور فرمائیں۔)

ایک شخص مسجد کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ راستے میں وہ کئی مے خانوں اور برائی کے مراکز سے گزرتا ہے لیکن وہ نہ تو کسی میخانے کا رخ کرتا ہے اور نہ ہی کسی برائی کے مرکز کی طرف جاتا ہے۔ وہ ان تمام برائیوں سے دامن بچاتا ہوا مسجد میں پہنچ جاتا ہے تو وہ شخص بھی ایک طرح سے معصوم ہے اور اس کے اندر اتنی عصمت کو تسلیم کرنا پڑے گا جس نے اسے برائی کے مراکز سے بخیر و عافیت گزرنے میں مدد دی اور اسے مسجد تک لے گئی۔

اسی وجہ سے جو جوان لذات دنیا کا جوانمردی سے مقابلہ کرتا ہے اور زنا نہیں کرتا، چوری نہیں کرتا اور شراب نوشی سے پرہیز کرتا ہے، وہ جوان بھی معصوم ہے اور اسی طرح سے ایک پاک دامن نوجوان عورت جو اپنے دامن عصمت کو گناہوں سے آلودہ نہیں کرتی اور خواہشات کے سامنے ایک پہاڑ کی سی استقامت کا مظاہرہ کرتی ہے ایسی جوان عورت بھی معصوم ہے۔

غرضیکہ ہماری زندگی میں اس طرح کے ہزاروں نمونے روزانہ دکھائی دیتے ہیں اور

یقیناً یہ سب کے سب عصمت کے چھوٹے بڑے نمونے ہیں۔

ہر انسان اپنے درجۂ عصمت کو بلند سے بلند تر کرسکتا ہے۔ اگر ایک شخص احکام دین کی پابندی کرے زیادہ نمازیں پڑھے اور ہر وقت خدا کو یاد کرے تو یقیناً اس کی زندگی کا زیادہ وقت اطاعت الٰہی میں بسر ہوگا اور اس کی زندگی کا بہت ہی کم وقت گناہوں میں بسر ہوگا۔

اسی طرح سے جب وہ شخص مزید نیک کام کرنے لگ جائے مثلاً چوری سے باز رہے اور اپنا ہر قدم رضائے الٰہی کے لئے اٹھائے اور ہر وقت ذکر الٰہی میں مصروف رہے تو اس کی عصمت میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا۔

ایک باپ جو اپنے بیٹے کو اچھی تربیت دیتا ہے اور اسے ہر طرح کے انحراف سے باز رکھتا ہے تو اس کی تربیت و تادیب سے بچے کی عصمت میں اضافہ ہوگا۔ معلوم ہوا کہ ایک معصوم باپ اپنی اولاد کو عصمت کا درس دیتا ہے اور ایک خراب باپ اپنی اولاد کو تباہی و بربادی کی میراث منتقل کرتا ہے۔

جب عام افراد کا یہ حال ہے تو اماموں کا کیا حال ہوگا؟

یہ نکتہ ہمیشہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ امام کی عصمت کا درجہ عام افراد کی عصمت سے انتہائی ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے کیونکہ:

۱۔ امام خدا کی طرف سے منتخب ہوتا ہے۔ اللہ نبی کو منتخب کرتا ہے اور نبی امام کو۔

۲۔ امام کی تربیت خاندان نبوت میں ہوتی ہے۔

۳۔ امام علم و تقویٰ کی بلند ترین چوٹی پر فائز ہوتا ہے۔

غیبت

مسئلہ غیبت بھی مسئلہ عصمت کی طرح امامت سے مربوط ہے۔ مسئلہ غیبت کو سمجھنے کے لئے مسئلہ امامت کا سمجھنا ضروری ہے۔ غیبت کا تعلق بارہویں امام حضرت مہدی عجل اللہ فرجہ سے ہے اور گیارہ ائمہ پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ بارہویں امامؑ پر بھی ایمان رکھا جائے۔

لہٰذا اس مسئلے کو مسئلہ امامت کے بغیر سمجھنے کی ہر کوشش ناکامی سے دوچار ہوگی اور کسی

ایسے شخص سے غیبت کے مسئلے پر گفتگو کرنا جو امامت کے متعلق کچھ بھی نہ جانتا ہو یا اسے قبول نہ کرتا ہو تو ایسی بحث جہالت و نادانی کہلائے گی اور ایسی بحث کو ''جدال بلانتیجہ'' سمجھا جائے گا۔

جس طرح سے مسئلہ امامت، مسئلہ عصمت کا مقدمہ ہے اسی طرح سے مسئلہ عصمت بھی مسئلہ غیبت کا مقدمہ ہے اور ان مسائل کا ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

سابقہ ائمہ کی بہ نسبت امام زمانہؑ کے لئے عصمت کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ سابقہ ائمہ کا مقابلہ ان کے ادوار کے فتنوں اور خواہشات سے تھا جبکہ امام زمانہؑ کا مقابلہ دور حاضر کے فتنوں سے ہے اور دور حاضر کے فتنوں کے سامنے سابقہ دور کے فتنوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

سابقہ ائمہ ہدیٰ اور امام زمانہؑ کے کردار میں بھی واضح فرق ہے کیونکہ سابقہ ائمہ کی تحریک ایک مخصوص علاقے تک محدود تھی جبکہ امام زمانہؑ سے خدا نے عالمگیر تبلیغ کا کام لینا ہے۔ اسی لئے سابقہ ائمہ کے مخالفین کا تعلق بھی ایک مخصوص علاقے سے ہوتا تھا اور امام زمانہؑ کے مخالفین کا تعلق پورے کرۂ ارض سے ہوگا۔

امام زمانہؑ کی غیبت ان کے عظیم فریضے کی اہمیت کو زیادہ اجاگر کرتی ہے کیونکہ امام علیہ السلام زمانے کی حدود میں محدود نہیں ہیں اور ان کا حدود زمانہ میں محدود نہ ہونا اہل زماں کے مقابلے میں انہیں زیادہ قوت و قدرت عطا کرنے کا موجب ہے۔

امام علیہ السلام کا تعلق اس جہان کی بجائے گویا دوسرے جہان سے دکھائی دے گا جہاں ہمارے یہ مادی پیمانے کام نہیں کرتے اور اس جہان میں جو کچھ بھی ہے وہ ایمان و تقویٰ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

امام زمانہؑ، مادیات زمان کی تمام خس و خاشاک سے پاک ہیں اسی لئے دنیا کی زیب و زینت کو ان کی نظر میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوگی۔

اگر امام زمانہؑ ہمارے ہی معاشرے میں زندگی بسر کرتے اور ان کے آباؤ اجداد کی طرح سے لوگ ان سے واقف ہوتے اور ان کے ظہور کے متعلق لوگوں کو احادیث کے ذریعے سے خبر بھی ہوتی تو آپ کے انقلاب کے دشمن آپ کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کرتے جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ آپ عالمی انقلاب نہ لاسکتے اور دنیا کو عدل و انصاف سے پُر نہ کرسکتے گو اس

طرح سے لوگوں کو آپ کا انتظار نہ کرنا پڑتا لیکن آپ کی اصلاحات میں یقیناً کمی واقع ہو جاتی۔

سابقہ گیارہ امام لوگوں کو امام مہدیؑ کے استقبال کے لئے آمادہ کرتے رہے اور یہ آمادگی خط اہلبیت کی باقی ماندہ جاودانی میراث ہے۔ امام مہدیؑ کی غیبت کا مقصد خط اہلبیت کی غیبت نہیں ہے کیونکہ یہ خط ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اور یہ خط لوگوں کو آپ کے استقبال پر آمادہ کرتا ہے اور یہ خط لوگوں کو آپ کی اتباع کی دعوت دیتا ہے۔

غیبت ہر دور اور ہر زمانے میں خط اہلبیت سے وابستہ مومنین کے لئے ایک معنوی امداد ہے۔ اگر بالفرض امام مہدیؑ کا ظہور ہو چکا ہوتا اور باقی ائمہ کی طرح سے آپ بھی دنیا سے رخصت ہو گئے ہوتے تو یہ امداد و نصرت بھی موقوف ہو گئی ہوتی اور آنے والی نسلیں جو ظلم و جور کے خاتمے کے لئے آپ کی منتظر ہیں تو ان کا یہ شوق اور جذبہ ایمان ختم ہو جاتا۔ (اگر آج ایمانی جذبہ باقی ہے تو وہ آپ کی غیبت کی وجہ سے ہے۔)

اگر غیبت نہ ہوتی تو اہل ایمان کی حالت اس گلے کی سی ہوتی جس کا کوئی چرواہا نہ ہو اور انہیں اصلاح احوال اور پیش رفت کی کوئی امید نہ ہو اور جس مذہب میں غیبت و انتظار کا تصور نہیں ہے ان کی حالت یہ ہے کہ کبھی وہ حکام کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھے اور کبھی فقہاء کے آستانوں پر ذبح ہوئے اور آج کل سیاسی جماعتوں کی خواہشات کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔

معاصر اسلامی جماعتوں کی ناکامی اور استکباری و طاغوتی قوتوں کے مقابلے میں ہمیشہ کی شکست کی وجہ کو بھی غیبت و انتظار کے نہ ہونے میں تلاش کرنا چاہئے جبکہ غیبت و انتظار پر ایمان رکھنے والے افراد اس طرح کی ذہنی شکست سے دوچار نہیں ہیں کیونکہ انہیں یقین ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن ان طاغوتی اور استکباری قوتوں سے خدائی رہبر کی زیر قیادت نجات حاصل کریں گے اور اس یقین کی وجہ یہ ہے کہ اگر حکام مستکبرین زمان ہیں تو ان کا رہبر وہ ہے جو دائرہ زمان سے بلند و برتر ہے۔

انتظار امم سابقہ میں بھی موجود رہا کیونکہ سابقہ امتیں اپنے لئے مصلح اعظم کا انتظار کرتی رہیں جو ان کی رہبری کرے اور انہیں ظلم و ستم اور غلامی کے دائرے سے نکال کر عزت و آزادی عطا کرے۔ اگر یہ امت اسی انتظار سے محروم رہ جائے تو اس کے دامن میں کیا بچے گا؟

(انتظار امید کو جنم دیتی ہے اور عدم انتظار مایوسی کو جنم دیتی ہے۔) انتظار کی قدر و قیمت اتنی زیادہ ہے کہ جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ انتظار کی قدر و قیمت کو معلوم کرنے کے لئے ''بے انتظاری'' کے نقصانات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

کسی بھی الٰہی تحریک کی کامیابی کا راز ایسے رضاکار افراد کی امداد پر ہوتا ہے جو اس عظیم مقصد کے لئے اپنے آپ کو مخصوص کر چکے ہوں تاکہ جب مصلح کا ظہور ہو اور وہ انقلاب لانے کے لئے لوگوں سے مدد طلب کرے تو مخلص رضاکار افراد آگے بڑھ کر اس کی مدد کریں۔

اور اگر مصلح کا ظہور ہو اور لوگوں کو خواب خرگوش میں پائے اور وہ مدد طلب کرے اور اس کی مدد کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس عالم میں وہ ان کے لئے کیا کر سکے گا اور اپنے فعال نقش کو کس طرح سے سرانجام دے سکے گا؟

امام علیہ السلام کا انتظار کرنے والوں اور انتظار نہ کرنے والوں کا بس یہی فرق ہے جو افراد آپ کا انتظار کر رہے ہیں وہ آپ کے بے لوث رضاکار ہیں اور آپ کی صدا پر کان لگائے بیٹھے ہیں اور جن کو آپ کا انتظار نہیں وہ خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

امام کے منتظر ہمیشہ خراب حالات کی اصلاح میں لگے رہتے ہیں اور جو آپ کے منتظر نہیں ہیں ہمیشہ حالات کی گردش کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ یہی انتظار ہی تھا جس کی وجہ سے ایران کا اسلامی انقلاب برپا ہوا اور کامیاب ہو گیا۔

جس معاشرے میں انتظار موجود نہیں ہے وہاں باطل کی قوتوں کو تقویت ملتی ہے اور اس معاشرے میں انقلاب کی روح مردہ ہو جاتی ہے۔ لاریب کہ اگر تمام امت اسلامیہ روح انتظار سے سرشار ہوتی تو ماضی اور حال کا دولت مند طبقہ مسلمانوں کو یرغمال بنا کر ان پر اپنا تسلط قائم نہیں کر سکتا تھا۔

اگر درباری ملا امت اسلامیہ میں موجود نہ ہوتے اور انہوں نے جماعت اور ائمہ کی احادیث کو حکام پر چسپاں نہ کیا ہوتا تو ظالم حکام اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔

نقش اہلبیت پر ایمان اور اس کے تقاضے انسان کو مسئلہ غیبت پر ایمان رکھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ حضرت رسول اللہؐ نے اہلبیت کا عظیم مقام بیان کیا اور انہیں بہت سی خصوصیات

سے مخصوص فرمایا اور انہیں لوگوں کے لئے نمونہ قرار دیا۔ اسی لئے آخری امام اگر ذخیرۂ خداوندی ہوں اور انبیاء کی طرح سے عظیم ذمہ داری کے حامل ہوں تو اس میں ہرگز تعجب نہیں کرنا چاہئے اور جہاں تک امام زمانہؑ کی طویل عمر کا تعلق ہے تو اس مسئلے کی وجہ سے میں کافی دنوں تک پریشان رہا اور کئی دنوں تک مسلسل سوچ بچار کی وجہ سے سو نہ سکا اور کئی دنوں تک اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ لیکن جب میں نے قرآن مجید کی طرف رجوع کیا تو مجھے قرآن مجید نے کئی طویل العمر افراد کا پتا دیا۔ قرآن مجید میں مجھے یہ دکھائی دیا کہ حضرت نوحؑ نے ۹۵۰ سال تک قوم کو تبلیغ کی تھی۔[1]

صاحب قریہ کی داستان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ نے اسے سو برس تک موت دینے کے بعد پھر زندہ کیا۔ (سورۂ عنکبوت: آیت ۱۴)

یاجوج و ماجوج کی داستان میں مجھے یہ بات دکھائی دی کہ جب سے حضرت ذوالقرنین نے ان کے سامنے دیوار کھڑی کی تب سے وہ دونوں قومیں غیبت میں رہ کر زندگی بسر کر رہی ہیں۔ (سورۂ بقرۃ: آیت ۲۵۹)

اصحاب کہف کی داستان میں یہ بات بیان کی گئی کہ وہ غار میں تین سو نو برس تک ٹھہرے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اٹھایا۔ (سورۂ کہف: آیات ۹۴ تا ۹۸)

ہمارے اس استدلال کے مدمقابل ہوسکتا ہے کہ یہ بات کہی جائے کہ حضرت نوحؑ کی عمر سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت نوحؑ نبی تھے جبکہ امام مہدیؑ نبی نہیں ہیں۔ اسی لئے امام مہدیؑ کا حضرت نوحؑ سے موازنہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

۱۔ ان احادیث میں کہا گیا ہے کہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت دور ہو کر مرا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ جو اپنے زمانے کے امام کو پہچان کر نہ مرا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ اس حدیث میں رسول خداؐ نے ایک طرف سے امام کا تذکرہ کیا اور دوسری طرف سے جاہلیت کا ذکر کیا تو اس حدیث کا مفہوم یہ بنا کہ امام کی پیروی کرنے والا اسلام کے دائرے میں شامل ہے اور امام کی پیروی نہ کرنے والا دائرۂ جاہلیت میں ہے۔ رسول اکرمؐ نے امام کو اسلام اور کفر کا معیار بنا کر یہ بتا دیا کہ امام کی پیروی اسلام اور امام کی مخالفت کفر ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلسنت کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ امام سے مراد حکام ہیں کیونکہ ان کے اکثر حکام تو خود جاہلیت کی بنیاد تھے۔ اس سے مراد شریعت کے وہ معصوم امام ہیں جن کی تعداد بارہ ہے۔

اس سوال کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ یہ سوال مقام اہلبیتؑ سے ناآشنائی پر مبنی ہے۔ اس کے باوجود ہم امام مہدیؑ اور حضرت نوحؑ کا موازنہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہم تو صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح سے اللہ نے اپنے ایک ہادی کو لمبی زندگی عطا کی تھی اسی طرح سے وہ اپنے ایک اور ہادی کو بھی طویل زندگی عطا کرسکتا ہے اور اس کے ساتھ ہم یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ حضرت نوحؑ کی تبلیغات سے ہرگز انکار نہیں ہے لیکن آخری زمانے میں امام مہدیؑ کے ہاتھوں جو عظیم انقلاب آنا ہے ایسا انقلاب حضرت نوحؑ کے مقدر میں نہیں تھا۔

البتہ حضرت نوحؑ اور امام مہدیؑ کے نقش اور شرائط قیام میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ حضرت نوحؑ کی دعوت پیدائش بشر کے آغاز میں تھی اور امام مہدیؑ کی دعوت حیات انسان کے آخری حصے میں رونما ہوگی اور جس کی دعوت آغاز میں تھی اللہ نے اسے طویل عمر عطا کی اور جس کی دعوت حیات بشر کے اختتام پر ہوگی اسے بھی طویل ترین عمر کا شرف بخشا۔

قرآن مجید میں صاحب قریہ کی داستان موجود ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کا گزر ایک ویران بستی سے ہوا۔ انہوں نے ازراہ تعجب کہا: خدایا! تو انہیں کیسے زندہ کرے گا؟ اللہ نے انہیں ایک سو سال تک کے لئے موت دے دی۔ پھر انہیں زندہ کیا اور اس ذریعے سے انہیں باور کرایا کہ خدا کی نظر میں مارنا اور زندہ کرنا یکساں حیثیت رکھتا ہے۔

اس واقعے سے استفادہ کرنے والا فرد صرف وہی صاحب قریہ ہی تھا اور اس واقعے کی وجہ سے اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ اس واقعہ کا اثر عقیدۂ بعثت بعد الموت پر ضرور پڑا اور اللہ تعالیٰ نے اس بات کو ثابت کرنے کے لئے صاحب قریہ کو موت کے بعد زندہ کیا تھا۔

اگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کو ثابت کرنے کے لئے ایک شخص کو سو سال تک موت دینے کے بعد دوبارہ زندگی دیدے تو کوئی تعجب نہیں اور اگر وہی خدا اسلام کی عظمت و سربلندی کے لئے ایک امام کو طویل زندگی دیدے تو اس میں تعجب اور انکار کی کیا بات ہے؟

اور اگر اللہ تعالیٰ دو مفسد قوموں یاجوج اور ماجوج کو آہنی دیوار کے پیچھے زندہ رکھے اور قیامت کے قریب ان کی دیوار کو توڑ کر انہیں فساد برپا کرنے کی مہلت دیدے تو اس بات کو

ہر مسلمان تسلیم کر لیتا ہے اور اگر وہی خدا کائنات کے سب سے بڑے مصلح امام مہدیؑ کو چند سو سال زندگی عطا کردے اور اسے پردۂ غیبت میں رکھے تو اس پر مسلمانوں کو تعجب کیوں ہے؟

(جب مفسد ہزاروں برس کی زندگی پاسکتے ہیں اور پردۂ غیبت میں رہ سکتے ہیں تو ایک مصلح غیبت کے پردے میں رہ کر طویل عمر کیوں نہیں پاسکتا؟)

وہ خدا جس نے اصحاب کہف کو تین سو نو برس تک موت دینے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جبکہ اپنی قدرت کے مظاہر دکھانے کے علاوہ ان کے زندہ کرنے کا کوئی مقصد نہیں تھا کیونکہ اصحاب کہف نے اپنا ایمان بچانے کے لئے ایک غار میں پناہ لی تھی لوگوں کو دعوت نہیں دی تھی اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے عہد میں کوئی اثر مرتب نہیں کیا تھا اور جس دور میں وہ زندہ ہوئے تو اس دور میں بھی انہوں نے لوگوں کو تبلیغ نہیں کی تھی کیونکہ اس دور کا معاشرہ ایمانی معاشرہ تھا۔ لہٰذا ان کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ اصحاب کہف نے اپنی زندگی میں معاشرے پر کوئی اثر مرتب نہیں کیا اور نئی زندگی پانے کے بعد بھی معاشرے پر کوئی اثر مرتب نہیں کیا۔

اس واقعے کو تمام مسلمان تسلیم کرتے ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے مدتوں سے امام مہدیؑ کو اپنی نظر میں رکھا ہوا ہے اور وہ ظاہر ہو کر پورے کرۂ ارض پر اسلام کو نافذ کریں گے تو نجانے مسلمانوں کی جبینوں پر شکن کیوں نمودار ہونے لگ جاتی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے منبع شر ابلیس کو طویل زندگی دی ہے اور وہ قیام قیامت (یا وقت معلوم) تک زندہ رہے گا تو کیا خدا کے عدل کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ وہ منبع عدل امام مہدیؑ کو بھی طویل زندگی عطا فرمائے اور آخری زمانے تک ان کی حفاظت کرے؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا: هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ یُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا٥ ''اور وہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اسے سب ادیان پر غالب کردے اور گواہی کے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے۔'' (سورۂ فتح: آیت ۲۸)

اس آیت قرآنی میں مستقبل کا ایک عظیم الشان وعدہ کیا گیا ہے کہ اللہ دین حق کو تمام ادیان پر غالب کریگا اور ادھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے زمانے سے لے کر ابھی تک دین اسلام تمام ادیان پر غالب نہیں ہوا جبکہ خدا کا فرمان بھی ہر شک و شبہ سے بلند ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ایک قوت (امام مہدیؑ) کو زمین پر زندہ رکھا ہوا ہے تاکہ اسؑ کے ذریعے سے اسلام کو تمام ادیان پر غلبہ عطا کرے اور جب خدا کا یہ وعدہ پورا ہوگا تو پوری دنیا میں صرف اسلام ہی دکھائی دے گا۔ اسلام کے علاوہ تمام مذاہب و ادیان ختم ہو جائیں گے اور اس عظیم نقش کا امیدوار امام مہدیؑ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔

کیا یہ عظیم ہدف امام مہدیؑ کی طویل عمر کا سبب ہونے کے لئے کافی نہیں ہے؟

بہر نوع اس نتیجے پر پہنچنے کے باوجود بھی ہر وقت میرے ذہن میں یہ سوال ابھرتا تھا کہ آخر یہ کیوں ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اتنے عرصے تک امام مہدیؑ کو زندہ رکھے جبکہ خدا اس بات پر بھی قادر ہے کہ وقت ظہور وہ کسی شخص کو اس مقصد کے لئے منتخب کرے جو دین کو دیگر ادیان پر غالب کردے تو کیا یہ بہتر نہیں ہے؟

چنانچہ جب میں نے اہلسنت کے سابقہ اور موجودہ حالات کو غور سے دیکھا تو مجھے اس بات کے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ سوال بالکل غیر معقول ہے اور یہ سوال اس لائق ہی نہیں کہ اس کا جواب دیا جائے۔

ہمارے کرم فرما یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ امام مہدیؑ کا تعلق اسی زمانے سے ہوگا یعنی ابھی تک وہ اس دنیا میں پیدا نہیں ہوئے۔

یہ نظریہ رکھنے والے افراد درحقیقت خواب غفلت میں مبتلا ہیں اور انہیں امام مہدیؑ کے متعلق کوئی علم نہیں ہے اور گویا ان کا خیال ہے کہ امام مہدیؑ کا ظہور ہی نہیں ہونا اور ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں ان کے ظہور میں شک ہے اور وہ امام مہدیؑ کے متعلق مروی روایات کا انکار کرتے ہیں۔

اب اگر یہ لوگ ظہور مہدیؑ کے منتظر ہوتے تو ان کے ظہور کے لئے اپنی آمادگی کا اظہار کرتے اور ان کی تشریف آوری کی بشارت دیتے اور ان کی پیروی کا اعلان کرتے لیکن ان کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے اور ان کی حالت کے متعلق جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے بالکل خواب غفلت میں مبتلا ہیں۔ یہ لوگ ماضی میں حکام کی تائید کر کے دشمن مہدیؑ ہونے کا

ثبوت فراہم کر چکے ہیں اور ان کا ماضی و حال اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ خط مہدیؑ کو پامال کرنے کے خواہش مند ہیں اسی لئے اس گروہ کے متعلق تو یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ امام مہدیؑ کا تعلق ان سے ہوگا اور اگر بالفرض امام مہدیؑ کا ظہور ان میں سے ہو بھی جائے تو یہ ان کی شخصیت کو مشکوک بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

یہی وجہ ہے کہ سنی کتب میں مہدویت کے بہت سے دعویداروں نے جنم لیا اور بہت جلد خدا نے ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کردیا۔ یہ لوگ نہ تو امام مہدیؑ کی قوم ہیں اور ان کی حالت بھی ظہور مہدیؑ کی اجازت نہیں دیتی۔ لہٰذا یہ بات تو طے ہے کہ امام مہدی علیہ السلام کا تعلق اس گروہ سے نہیں ہے۔

امام مہدیؑ جنہوں نے رسول خداؐ کی طرح سے ایک عظیم خدائی انقلاب برپا کرنا ہے، وہ خود بھی برگزیدہ شخصیت کے مالک ہوں گے اور خداوند عالم نے انہیں برگزیدہ خاندان ہی میں سے منتخب کیا ہے۔

امام مہدیؑ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس زمانے کے دائرے سے باہر ہوں (بالفاظ دیگر امام مہدیؑ فرزند زمان نہیں بلکہ صاحب الزمان ہیں) کیونکہ وہ اہلبیت نبوت کا آخری ثمر ہیں۔ اللہ تعالی نے انہیں زندگی عطا کی ہے تاکہ وہ اپنے وقت پر ظاہر ہو کر قیام فرمائیں۔ امام مہدیؑ کی طویل عمر خدا کا معجزہ بھی ہے اور امت کی آزمائش کا ذریعہ بھی۔

تشیع کے بعد

میں ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں قید سے رہا ہوا اور اسی دور سے ہی میرے تشیع کا آغاز ہوا۔ ان دنوں مصر میں ایران اور تشیع کے خلاف بہت بڑا محاذ کھلا ہوا تھا اور اس محاذ آرائی کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں ایران عراق جنگ زوروں پر تھی اور مصر پوری طرح سے عراق کا ساتھ دے رہا تھا اور مصر کے تمام ذرائع ابلاغ ایران کے خلاف دن رات پروپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھے۔ اخبارات کو ایران اور تشیع کے خلاف ہر جائز اور ناجائز پروپیگنڈہ کرنے کی پوری چھٹی تھی۔ اس پس منظر میں وہابیت اور عراق دونوں مل کر مصر میں پروپیگنڈے کی جنگ میں مصروف تھے اور ان دنوں تمام مصری روزنامے، ہفت روزے اور ماہنامے مصر کی تمام اسلامی شخصیات اور مصر کی انقلابی جماعتیں اور مساجد کے منابر اور اخبارات کے کالم نگار، بشمول بائیں بازو والے اور لبرل افراد کے اذہان پر شیعہ اور ایران دشمنی چھائی ہوئی تھی اور مذکورہ تمام طبقات مل کر امام خمینی کی شخصیت کو مسخ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔[۱]

اسی زمانے میں جب میں نے شیعہ ہونے کا اعلان کیا تو ہر طرف سے نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں، حکومت کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں، اطلاعات اور پولیس کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں، اخبارات و مجلات تبلیغات کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں اور ان نگاہوں کے ساتھ ساتھ امریکہ اور اسرائیل کی نگاہیں بھی مجھ پر مرکوز ہوگئیں۔ یہ تمام افراد اور یہ تمام ادارے مصر میں تشیع کے خلاف گھات لگائے بیٹھے تھے اور جب میں نے اعلان شیعیت کیا تو انہوں نے اسے اپنی

۱۔ مزید تفصیل کے لئے میری ان عربی کتابوں کا مطالعہ فرمائیں

(۱) مصر میں اسلامی تحریک (۲) مصر میں تشیع (۳) مصر و ایران اور امن وسیاست کی جنگ

شکست سمجھا اور میرے اعلان تشیع کو ختم کرنے کے درپے ہو گئے۔[1]

جب تک عراق ایران جنگ جاری رہی اس وقت تک ایران اور شیعوں کے خلاف دشمنی کا گراف اوپر جاتا رہا اور جب جنگ ختم ہوئی تو دشمنی کا گراف بھی نیچے آ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ دشمنی اور جنگ کا آپس میں کوئی رشتہ تھا اور جنگ کے خاتمے کے بعد شیعوں کے خلاف مصری پولیس کی سرگرمیوں میں کمی واقع ہوئی۔

اہل مصر کی نفسیات

اعلان تشیع کے بعد کے حالات بیان کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہل مصر کی نفسیات پر ہلکی سی بحث کی جائے کیونکہ اس وقت اہل مصر تشیع میں داخل ہو رہے ہیں لیکن ان کا تشیع مصری ثقافت اور روایات سے مشروط ہے۔

جب میں سنی تھا تو میں نے اہل مصر کی نفسیات کو مقدور بھر بدلنے کی کوشش کی لیکن میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا اور جب سے میں شیعہ ہوا ہوں تب سے اہل مصر کی نفسیات کو بدلنے کی کوششوں میں مصروف ہوں لیکن مجھے اس میں خاطر خواہ کامیابی کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔

اہل مصر کی نفسیات یہ ہے کہ وہ تازہ عقائد کو اپنے مزاج اور اپنے کلچر کے مطابق قبول کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ مصری اپنے آپ کو عقیدے میں نہیں ڈھالتے بلکہ عقیدے کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھالنے کے عادی ہیں اور جب وہ کسی عقیدے کو قبول کر لیں تو اس پر مصریت کی چھاپ نمایاں دکھائی دیتی ہے۔

اہل مصر عام طور پر نرم خو اور ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک ہیں اور ان کی صلح پسندی کے نمونے ارکان حکومت اور اسلامی جماعتوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

کچھ عرصے سے وہابیت نے مصر میں اپنے قدم جمانے شروع کئے ہیں اور مصری معاشرے میں اسے کچھ نہ کچھ پذیرائی ملی ہے۔ وہابیت ایک تند خو اور اکھڑ مزاج قسم کا مذہب ہے مگر مصر میں اس کی اکھڑ مزاجی بڑی حد تک کم ہو گئی ہے اور وہابیت پر بھی مصریت کا رنگ

۱۔ ۱۹۸۷ء تا ۱۹۸۹ء مصری شیعہ حکومت کے زیر عتاب رہے۔

چڑھنے لگا ہے۔ وہابیت کے پروردہ چند چھوٹے گروہوں نے ابتدا میں اپنے اکھڑ پن کا مظاہرہ کیا تھا لیکن جلد ہی یہ گروہ معدوم ہو گئے کیونکہ مصری معاشرے میں اس تند مزاجی کی گنجائش نہیں تھی اسی لئے اہل مصر نے انہیں مسترد کر دیا۔

اہل مصر کی نفسیات میں قدامت پرستی کا عنصر پایا جاتا ہے اور مصری اسلام پر بھی قدامت پرستی کے اثرات دکھائی دیتے ہیں اور مصر کی دینی شخصیات کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ گزشتہ شخصیات کے مشابہ دکھائی دیں اور جو سابقہ شخصیات کے جتنا زیادہ مشابہ ہوگا مصری معاشرے میں اتنا ہی قابل احترام تصور کیا جائے گا۔ اہل مصر کی اس روش یعنی ماضی سے محبت اور حال سے فرار کی وجہ سے مصر میں منشیات کے کاروبار کو فروغ ملا اور اس کی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ اہل مصر نشہ میں ڈوب کر موجودہ حقائق سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلے کی عجیب بات یہ ہے کہ مصر میں اگرچہ شراب کافی سستی ہے اور دوسری منشیات اس کے مقابلے میں مہنگی ہیں اس کے باوجود اہل مصر میں سے بہت کم افراد شراب پیتے ہیں جبکہ زیادہ افراد منشیات کے عادی ہیں اور اس کی وجہ بھی اہل مصر کی دینداری ہے کیونکہ اہل مصر کا خیال ہے کہ شراب اور اسلام ایک دوسرے کے متضاد ہیں جبکہ دوسرے قسم کے نشوں کو دینداری کے خلاف نہیں سمجھتے۔

گوشہ نشینی اہل مصر کی نفسیات میں شامل ہے۔ اہل مصر گوشہ نشین اور تنہائی پسند قسم کے لوگ ہیں۔ انہیں کہیں زیادہ آنا جانا اچھا نہیں لگتا۔ اہل مصر گھر میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور اس وجہ سے ان کی معاشی حالت میں کمزوری واقع ہوئی۔ اب انہیں اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑا ہے۔ مگر وہ زیادہ دیر باہر رہنا پسند نہیں کرتے جب بھی کوئی مصری یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے پاس کچھ رقم آ گئی ہے تو وہ غیر ملک کو چھوڑ کر فوراً گھر کا رخ کرتا ہے۔ (کام کے ویزا کے ساتھ)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصری اپنے وطن سے اس وقت تک باہر جانا بھی پسند نہیں کرتا جب تک اس کے پاس باہر جانے کی مکمل سفری دستاویزات نہ ہوں اور اس کی اجرت طے نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی مصری اپنے وطن کو چھوڑ کر افریقہ کے کسی

ملک میں گیا ہو اور اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ انہیں وہاں کام کی یقین دہانی نہیں ہے۔

جب کوئی مصری کہیں باہر چلا بھی جائے تو بھی وہ باہر رہ کر صرف اپنے کام کی حد تک ہی سوچ بچار کرتا ہے اور وہ اپنے رسمی کام سے ہٹ کر اپنی زندگی کو تبدیل کرنے یا دوسرے ملک میں مستقل رہائش کے متعلق نہیں سوچتا۔ وہ اپنے آپ کو اس طرح کے مسائل میں کبھی الجھانا پسند نہیں کرتا۔ اس کے ذہن پر ہمیشہ اس کا وطن سوار ہوتا ہے اور اس کی بس یہی آرزو ہوتی ہے کہ وہ جیب بھر کر اپنے گھر اور اپنے گاؤں واپس چلا جائے جہاں وہ اپنے گاؤں میں اپنے لئے مکان یا اپنے شہر میں اپنے لئے ایک فلیٹ بنا سکے اور پھر اس کے بعد اپنے کام کی جگہ واپس آ کر اپنے کام میں مصروف رہے۔

ایک مصری کی شخصیت کی خطرناک بات یہ ہے کہ وہ فوراً دوسروں کے رنگ میں رنگ جاتا ہے اور اپنی ماہیت میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے اور ہر سیاسی اور اجتماعی تغیر کے وقت وہ بھی فوراً متغیر ہو جاتا ہے۔ جب تک مصر میں بادشاہت کا دور دورہ تھا تو اس وقت مصریوں کی نفسیات شہنشاہیت میں ڈھلی ہوئی تھیں اور جب جمال عبدالناصر نے اقتدار سنبھالا تو مصری اس سے متاثر ہوئے اور اس کے رنگ میں رنگے گئے اور جب اس کے بعد انور السادات نے حکومت سنبھالی تو اہل مصر کی نفسیات پر اس کے نظریات کی چھاپ لگ گئی اور موجودہ دور میں اہل مصر کی وہ نفسیات ہرگز نہیں ہیں جو کہ ناصر اور سادات کے عہد اقتدار میں تھیں۔ الغرض اہل مصر کو اگر کوئی بگاڑنا چاہے تو انہیں بگڑنے میں دیر نہیں لگتی اور اگر کوئی ان کی اصلاح کرنا چاہے تو وہ اصلاح کے عمل کو بھی فوراً قبول کر لیتے ہیں۔[۱]

بالفاظ دیگر اہل مصر ہر دور میں حکومت سے متاثر رہتے ہیں۔ حکومتیں چاہیں تو انہیں بدترین انسان بنا دیں اور اگر حکومتیں چاہیں تو وہ بہترین انسان کے قالب میں ڈھلنے کے لئے ہمیشہ ہی آمادہ دکھائی دیتے ہیں۔

اہل مصر کی ایک اور صفت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں پر انحصار کرنے کے عادی ہیں

۱۔ اسلامی جماعتیں آج کل حج کے نام پر تجارت کر رہی ہیں اور حج وعمرہ کے ویزے سعودی عرب سے منگاتی ہیں۔ ان کا ریٹ حکومتی ریٹ سے پانچ ہزار "مصری جنی" زیادہ ہوتا ہے۔

اور وہ اپنی ذاتی جدوجہد سے محروم رہتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ دکھائی دے گا کہ اہل مصر ہمیشہ دریائے نیل پر ہی انحصار کرتے رہے ہیں اور ان کی زندگی ہمیشہ اس دریا کے کنارے ہی گزری ہے۔ اگر پانی زیادہ آ گیا تو ان کی روزی میں وسعت پیدا ہو گئی اور اگر پانی کم ہوا تو وہ قحط میں مبتلا ہو گئے۔

اہل مصر ذاتی تگ و دو کے کچھ زیادہ قائل نہیں ہیں وہ ہمیشہ حکومتوں اور حکام پر انحصار کرتے ہیں اور وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہر چیز حکام کے ہاتھ میں ہے اسی لئے وہ آنکھ اور کان بند کر کے اپنے آپ کو حکام کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں؟ اور خود کسی تحرک کے بغیر ان کے استبدادی ہاتھوں سے نجات کی امید بھی لگائے رہتے ہیں۔

اہل مصر شاید اپنی اسی نفسیاتی کیفیت کی وجہ سے گورنمنٹ کی ملازمت کرنے کے خواہش مند ہیں اور وہ حکومت کی ملازمت کو باقی ہر طرح کے کاموں پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت کی ملازمت میں رزق کے حصول کی ضمانت موجود ہے جبکہ دوسرے کاموں میں اس طرح کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔

الغرض اہل مصر کی نظر میں رزق روزی کے حصول کو زندگی کے ہدف کی حیثیت حاصل ہے اور وہ دین کو بھی رزق روزی کے دائرے میں ہی دیکھنے کے عادی ہیں اور جو چیز بھی رزق کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے وہ ان کے لئے ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔ اگر کسی مصری کی روزی کسی وجہ سے ختم ہو رہی ہو تو وہ اس چیز کو چھوڑ دے گا اور وہ اس کے بجائے ایسے کام کرے گا جس سے اس کی روزی بحال ہو سکے۔

اسی لئے اہل مصر میں روح شجاعت کہیں دکھائی نہیں دیتی کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی شجاعت ان کی روزی میں رکاوٹ کا سبب بن سکتی ہے۔ اسی لئے مصری اپنے حکام کے خلاف کسی طرح کا احتجاج کرنے کو درست نہیں سمجھتے۔

تاریخی لحاظ سے یہ بات مشہور ہے کہ مصر کے اکثر حکام کا تعلق مصر سے نہیں تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مصر حکومت کرنے کے بھی چنداں خواہش مند نہیں ہیں۔ ان کے ہاں رزق روزی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ انہیں جب تک روزی ملتی رہے اس وقت

تک وہ کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتے۔

انور السادات نے بھی اہل مصر کی اسی نفسیاتی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس نے جب اسرائیل سے امن معاہدہ کیا تھا تو اس نے اہل مصر کو یہ باور کرایا تھا کہ اسرائیل کے ساتھ مصالحت کی وجہ سے ملکی معیشت بہتر ہو جائے گی اور اس سے تمام افراد کے مالی وسائل میں اضافہ ہوگا۔ انورالسادات کی یہ دلیل سن کر نہ صرف اہل مصر خاموش ہوگئے بلکہ اس کے نظریے کی حمایت کرنے لگے۔

اہل مصر کی دینداری بھی سرسری اور ظاہری حد تک محدود ہے اس لئے اہل مصر سے ہر طرح کا اسلامی نعرہ بلند کرانا آسان ہے۔ خواہ حکومت نعرہ بلند کرائے یا اسلامی جماعتیں، اہل مصر ہر وقت نعرہ لگانے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں۔

اس ظاہری دینداری کی خواہش نے "دینی تجارت" کیلئے راستے کھول دیئے ہیں اور چالاک قسم کے افراد نے اسلام کے نام کو کمائی کا ذریعہ بنایا اور کئی ایک نے "کاروان حج وعمرہ" تشکیل دے کر اہل مصر کو خوب لوٹا اور حج سیاحتی کے نام سے لوگوں کی جیبوں پر ڈاکے ڈالے۔

اہل مصر کی اسی نفسیاتی کیفیت کی وجہ سے ان کی دینداری پر بھی مصریت کے رنگ کی چھاپ دکھائی دیتی ہے اور ان کی دینداری کبھی حالات حاضرہ کے رنگ میں ڈھل جاتی ہے اور کبھی حکومتی سیاست کی ہمرنگ دکھائی دیتی ہے۔

اہل مصر کی دینداری کی شہرت کے باوجود ان میں مستقل نمازی بہت کم ہیں۔ البتہ اہل مصر کی اکثریت نماز جمعہ کے اجتماع میں ضرور شریک ہوتی ہے اور انہیں حج بیت اللہ اور روضۂ رسولؐ کی زیارت کا بہت زیادہ شوق ہے مگر حج و زیارت کے باوجود ان کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور حج کرنے کے باوجود بھی ویسے کے ویسے بے نمازی ہی رہتے ہیں۔

اہل مصر حج اور روزے کا بہت اہتمام کرتے ہیں اور اکثر افراد ان دونوں عبادات کو بجالاتے ہیں کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ حج اور روزے سے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے ماہ رمضان المبارک میں مساجد کی رونقیں دوبالا ہو جاتی ہیں اور لوگ روزے کے ساتھ نماز اور تلاوت قرآن میں مصروف دکھائی دیتے ہیں لیکن جیسے ہی ماہ رمضان رخصت ہوتا ہے تو لوگ

اپنی سابقہ عادات کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔

مکہ جانے والا حاجی یہ سمجھ کر مکے میں قدم رکھتا ہے کہ حج کے ذریعے سے اس کے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے اور حج کے بعد وہ گناہوں سے ایسے پاک و پاکیزہ ہو جائے گا جیسے کہ پیدائش کے وقت پاک و پاکیزہ تھا۔

اہل مصر کے دلوں میں اہلبیتؑ کی محبت بھی دکھائی دیتی ہے لیکن اس محبت کی وجہ بھی سیاسی ہے کیونکہ مصر پر فاطمی سلاطین نے ایک طویل عرصے تک حکومت کی تھی۔

بہرنوع محبت اہلبیتؑ کی جڑیں کچھ زیادہ گہری نہیں ہیں اور یہ ولایت حقیقی پر اختتام پذیر نہیں ہوتیں۔ اہلبیتؑ کی سرسری محبت نے بعد میں تصوف کا رنگ اختیار کرلیا تھا اور یوں تصوف کے ایک مستقل گروہ نے اسی سے جنم لیا تھا۔[1]

اہل مصر میں تشیع کی جڑیں بھی دکھائی دیتی ہیں لیکن ان پر بھی مصریت کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اہل مصر کا تشیع عہد بنی امیہ کے تشیع کے مشابہ ہے اور تقیہ کے دبیز پردوں میں لپٹا ہوا ہے جبکہ اس طرح کا تقیہ موجودہ حالات کے منافی ہے اور وہ لوگ ایران کے اسلامی انقلاب سے بھی متاثر ہیں لیکن ان کے متاثر ہونے کی یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ خط انقلاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے متاثر ہونے کی واحد وجہ یہ ہے کہ اس سے انہیں یہ امید پیدا ہوئی ہے کہ شاید ان کے حالات میں بھی کوئی مثبت تبدیلی واقع ہو جائے جبکہ وہ خود کسی طرح کا اقدام کرنے کے خواہش مند نہیں ہیں۔

اور میں سمجھتا ہوں کہ امام غائب کا عقیدہ بھی اہل مصر کو متاثر کرسکتا ہے کیونکہ اہل مصر ہر دور میں اس بات کے خواہش مند رہے ہیں کہ کوئی شخص پردۂ غیب سے آئے اور ان کی زندگیوں میں بہتری پیدا کردے اور امام غائب کے متعلق یہ بات طے ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی خصوصی تائید سے موید ہوں گے اور وہ غیر معمولی قوت کے مالک ہوں گے اور ان کی کامیابی

۱۔ مصر میں اس وقت تصوف کے ستر سے زیادہ مشہور خانوادے ہیں۔ ان کے علاوہ غیر معروف خانوادے بھی موجود ہیں۔ ان میں سے بعض کا خیال یہ ہے کہ وہ تشیع سے مطابقت رکھتے ہیں۔ بہرحال اس وقت مصر میں ایک کروڑ افراد سے زیادہ لوگ صوفیاء کے طرفدار ہیں۔

یقینی ہوگی۔ نیز یہ کہ اہل مصر فطری طور پرست اور کاہل واقع ہوئے ہیں اور ہر کام کے لئے دوسروں پر نظر رکھتے ہیں اسی لئے ان کے لئے امام غائب کے عقیدے میں دلچسپی کا سامان بدرجۂ اتم موجود ہے اور یہ عقیدہ انہیں اپنی طرف مائل کرسکتا ہے۔

جس طرح سے اہلسنت نے دین کو سامان تجارت بنا کر اس کو اپنے ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے تو مصر کے شیعہ بھی ان سے پیچھے نہیں رہے۔ میں کچھ ایسے افراد کو جانتا ہوں جو اپنے تشیع کو اپنی ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

جس دن سے میں نے خط اہلبیت سے وابستگی اختیار کی تو میں نے اپنے سابقہ گناہوں کے کفارے کے لئے یہ فیصلہ کیا کہ میں اپنے ہر واقف کار سے بحث و مباحثہ کر کے مکتب تسنن سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا اور جب میں نے مکتب تسنن کے خلاف تبلیغ شروع کی تو لوگوں میں اس کا شدید ردعمل ہوا۔ بہت سے افراد نے مجھ سے ملاقات کئے بغیر ہی مجھ پر الزامات کی بوچھاڑ کردی۔ کچھ لوگوں نے میری گفتگو کو توجہ سے سنا جس کے نتیجے میں انہیں آل محمدؐ کی معرفت نصیب ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد سے ایک قلیل عرصے کے اندر بہت سے افراد نے مذہب شیعہ قبول کیا اور مذہب شیعہ اختیار کرنے والوں میں حزب التکفیر، حرکت الجہاد، اخوان المسلمین اور سلفی گروہ کے افراد بھی شامل ہیں۔

میں نے اپنے ذہن میں یہ فیصلہ کیا کہ جس طرح میں مکتب تسنن کی تبلیغ کرتا تھا آئندہ اسی طرح سے مکتب تشیع کا پرچار کروں گا۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مصر میں تشیع کو زیادہ تبلیغات کی ضرورت ہے کیونکہ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے آغاز سے تشیع کھل کر منظر عام پر آئی ہے اور اس وقت تشیع کے صحیح عقائد پہنچانے کی شدید ضرورت ہے۔

نظریہ تشیع کو اس وقت مضبوط اور طاقتور تبلیغاتی حمایت کی ضرورت ہے تاکہ ایک طرف سے مخالفین کے پروپیگنڈے کا جواب دیا جاسکے اور دوسری طرف سے مومنین کی صحیح خطوط پر رہنمائی کی جاسکے۔

خوش نصیبی سے مجھے تبلیغاتی مسائل کا تجربہ ہے اسی لئے میں نے اس مقدس فرض کے لئے بیڑا اٹھایا اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے "دارالبدایہ" کے نام سے تبلیغی مرکز قائم کیا۔ یہ مرکز

۱۹۸۶ء کے اواخر میں کچھ عرب شیعہ دوستوں کے تعاون سے قائم ہوا اور ۱۹۸۷ء میں ہم نے اپنے ادارے کی مطبوعات کو قاہرہ کی بین الاقوامی نمائش میں پیش کیا تو ہماری مطبوعات کو دیکھ کر دوست دشمن سب حیران رہ گئے۔

اس کے بعد سلفی وہابی گروہوں نے ہمارے خلاف پروپیگنڈے کا بازار گرم کردیا اور اس مرکز کے خلاف زہرآلود اور گمراہ کن الزامات کی بارش کردی اور مصری مسلمانوں سے درخواست کی گئی کہ وہ اس مرکز سے کسی قسم کا واسطہ نہ رکھیں اور جتنا بھی ممکن ہو اس سے دوری اختیار کریں۔ وہابیوں نے ہمارے مرکز کے خلاف بہت سے پمفلٹ اور ہینڈ بل شائع کئے اور اس سلسلے میں ایک رسالہ لکھا گیا جس کا نام "آغاز شر و خط وحشیاں" رکھا گیا اور اس رسالے میں ہمارے خلاف کھل کر پروپیگنڈہ کیا گیا اور ہمارے مضامین اور ہماری کتابوں پر سخت تنقید کی گئی اور سارا زور قلم صرف کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ "دارالبدایہ" کو ایران کی طرف سے امداد ملتی ہے۔

دارالبدایہ کے خلاف وہابیوں کے حملوں سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں مزید کامیابیاں عطا فرمائیں۔ البتہ مصری شیعوں کے رویے سے ہمیں سخت کوفت ہوئی جب انہوں نے ہماری تبلیغاتی سرگرمیاں ملاحظہ کیں تو انہوں نے ہمیں بزدلی کا درس دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں ان سرگرمیوں کو ترک کردینا چاہئے کیونکہ یہ سرگرمیاں مصر میں اہل تشیع کے لئے وبال جان ثابت ہوں گی۔ لیکن میری سوچ دوسرے مصری شیعوں سے بالکل جدا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہمیں کھل کر اپنی دعوت دینی چاہئے کیونکہ:

(الف) ہمیں خفیہ تبلیغ کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ خفیہ تبلیغ کر کے ہم حالات میں بہتری کی توقع نہیں کرسکتے اور ہم تحریک تشیع کو ایک احتمالی امر کے حوالے نہیں کرسکتے۔

(ب) نہ ہماری تبلیغات حالات حاضرہ کے خلاف ہے اور نہ ہی حکومت کے خلاف اور ہمارے پاس اپنے مقصد کے اثبات کیلئے کھلم کھلا تبلیغ کے سوا کوئی دوسرا راستا نہیں ہے۔

(ج) واقعات سے روبرو ہونے کے اندیشے کو تاخیر میں نہیں ڈالنا چاہئے اور ہمیں اپنے عقائد کا اظہار کرنا چاہئے اور اس سلسلے میں یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ عقائد حکومتوں کے

سامنے نہیں جھکا کرتے۔

(د) مصر میں دعوت تشیع ایک خاص گروہ کے ہاتھوں میں گروی نہیں رہے گی اور تشیع کے مستقبل کا ہم پر ہی دارو مدار نہیں ہے تو پھر ہم حقائق کو کیوں چھپائیں؟

(ہ) اس دوران مصر میں ہمیں جو بھی کامیابی نصیب ہوئی ہے وہ علانیہ دعوت کی وجہ سے ہوئی ہے اور اگر ہم گوشہ نشینی اختیار کرتے تو ہمیں اتنی کامیابی بھی نہ ملتی۔

جب ہم نے تبلیغات کا آغاز کیا تو ہمارے مخالفین نے ہمارے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور انہوں نے دل کھول کر ہمارے خلاف بہت کچھ لکھا اور اللہ کے فضل و کرم سے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی مخالفت کی وجہ سے ہمیں اتنی پذیرائی ملی جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

بہرحال تشیع کے خلاف ایک مرتبہ تو چوطرفہ محاذ سا کھل گیا اور مقالات و خطبات کا عنوان ہی تشیع کی مخالفت قرار پایا اور (۱۹۸۹ء ۔ ۱۹۸۸ء) میں حکومت بھی شیعوں کی مخالفت پر کمر بستہ رہی اور ہمارے تبلیغاتی مرکز "دارالبدایہ" پر پابندی عائد کر دی گئی اور ہم پر یہ الزام لگایا گیا کہ ہم ایران کے ایجنٹ ہیں اور حکومت کے خلاف سازشیں تیار کر رہے ہیں۔

خدا کی مہربانی ہمارے شامل حال ہوئی اور ہماری بے گناہی ثابت ہوگئی اور اس کے کچھ عرصے بعد ہمیں رہا کر دیا گیا۔

مخالفین کے مسلسل پروپیگنڈے کی وجہ سے ہماری شہرت میں اضافہ ہوا اور میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ہمیں بہت بڑا تحفہ دیا ہے اور رہائی کے بعد ہماری تبلیغات زبان زد عوام ہوئیں اور ہماری دعوت کے دائرے میں وسعت پیدا ہوئی۔ اس سے ہمارے حوصلے مزید بلند ہوئے اور ہماری استقامت میں اضافہ ہوا اور اگر ہم تھوڑی قیمت دینے پر راضی نہ ہوتے تو ہمیں اتنی بڑی کامیابی کبھی نہ ملتی اور دعوت و ارشاد کی تاریخ ہمیشہ سے یہی رہی ہے۔

حق کبھی بھی سوال کرنے سے نہیں ملتا اور آزادی مفت میں حاصل نہیں ہوتی، حق اور آزادی کو جدوجہد سے حاصل کیا جاتا ہے۔ میں اپنی زندگی کے طویل تجربات سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں اور ہر تجربہ کار اور عقل مند شخص کے تجربات کا یہی نچوڑ ہے۔

اگر ہم اپنا حق حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور اظہار عقیدہ کی آزادی چاہتے

ہیں اور شکوک و شبہات کے پردوں کو چاک کر کے لوگوں کا اعتماد حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں میدان عمل میں قدم رکھنا ہوگا اور مخالفین سے مباحثہ اور احسن انداز سے مجادلہ کرنا ہی پڑے گا۔

ہمیں اپنی علانیہ تبلیغات کی وجہ سے حسب ذیل فوائد حاصل ہوئے:

۱۔ بہت سے تعلیم یافتہ اور اسلامی جماعتوں کے روشن فکر افراد کے اذہان سے تشیع کے متعلق شکوک و شبہات دور ہوئے۔

۲۔ بہت سے خوش نصیب افراد نے مذہب اہلبیتؑ قبول کیا۔

۳۔ اس سے مذہب اہلبیتؑ کے لٹریچر کو عام کرنے میں مدد ملی۔

۴۔ بہت سے افراد مذہب اہلبیتؑ میں دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔

۵۔ تشیع کے متعلق حکومت اور پولیس کے موقف میں واضح تبدیلی پیدا ہوئی۔

اگر ہم اپنی دعوت کو مخفی رکھتے تو اتنے فوائد اور لوگوں کا اعتماد حاصل نہ کر سکتے۔

"دارالبدایہ" کی بندش کے بعد ہم نے "دارالہدف" کے نام سے اپنا تبلیغاتی مرکز قائم کیا اور ہمارا یہ تبلیغاتی مرکز اس وقت پوری فعالیت سے کام کر رہا ہے اور ہم قاہرہ کے سالانہ بین الاقوامی کتاب میلے میں شرکت کر رہے ہیں اور اس وقت دارالہدف شیعیان مصر کا تبلیغاتی مرکز شمار کیا جاتا ہے۔

اس کے باوجود مجھے انتہائی افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ بعض شیعہ افراد اس مرکز کی مخالفت کر رہے ہیں اور ان کی مخالفت کی وجہ سے چند دنوں کے لئے ہمارا مرکز بند بھی ہوا تھا۔

ہمیں اس وقت حکومت سے کوئی شکوہ نہیں ہے کیونکہ ۱۹۸۹ء سے لے کر اب تک حکومت نے ہمارے تبلیغاتی مرکز کی کوئی مخالفت نہیں کی۔

اور جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ ابتدا میں مجھے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اعلان تشیع کے بعد جب سیاسی اور مذہبی جماعتوں سے میرے مباحثے ہوئے تو پولیس نے مجھے اپنی نگاہوں میں رکھ لیا اور مجھے شیعوں کی اہم ترین شخصیت سمجھ لیا گیا اور میرے متعلق یہ سمجھ لیا گیا کہ میں مصر میں رہ کر ایران کی تبلیغات کر رہا ہوں اور یہ کہ میں ایران کا جاسوس ہوں۔

حکومت نے میرے متعلق اس طرح کے تخمینے میری سابقہ سرگرمیوں کو مدنظر رکھ کر

لگائے تھے کیونکہ میری زندگی کی سابقہ تمام تر سرگرمیاں حکومت کے ریکارڈ میں موجود تھیں۔ حکومت کو اسلامی جماعتوں سے میرے تعلقات کا علم تھا اور میری دس سالہ اسلامی تحریکوں سے وابستگی کا بھی انہیں علم تھا اور حکومت یہ بھی جانتی تھی کہ اس سے قبل میں تین سال تک زندان میں بھی رہ چکا ہوں اور جب پولیس کے ساتھ میرے مذاکرات ہوئے تو میرے متعلق ان کے تمام خدشات دور ہوگئے اور مجھے ایرانی ایجنٹ ہونے کے الزام سے نجات ملی۔

اس سے قبل حکومت مصر کا یہ خیال تھا کہ حکومت ایران شیعیان مصر کی پشت پناہی کر رہی ہے اور مذاکرات کے ذریعے سے ہم نے یہ ثابت کیا کہ یہ صرف الزام ہے اور اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔[1]

پولیس کے علاوہ سیاسی گروہوں سے بھی ہمارے مذاکرات ہوئے جن میں مارکسسٹ اور قوم پرست اور ناصر نواز عناصر شامل تھے۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں ان لوگوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ شیعی نظریات زمانے کے حالات کے عین مطابق ہیں اور جدید حالات کے ساتھ چل سکتے ہیں اور تشیع اسلام کا ایک خوبصورت چہرہ پیش کرتی ہے جبکہ سلفی اور قدامت پسند گروپ اسلام کا وہ چہرہ پیش کرتے ہیں جس سے سیاسی گروہ مدت سے برسرپیکار ہیں۔

بہرحال ہماری گفتگو کا یہ نتیجہ نکلا کہ سیاسی گروہوں نے تشیع سے مصالحت آمیز رویہ کا اعلان کیا اور کتب شیعہ کو لائق استقبال قرار دیا اور انہوں نے ہمیں اپنے اجلاسوں اور کانفرنسوں میں شرکت کی دعوت دی۔

اس طرح کی علمی گفتگو سے جہاں تشیع کا تعارف ہوا وہاں ایران کے متعلق بھی بہت سے شکوک کا ازالہ ہوا اور آج پورے مصر میں بالعموم اور تعلیم یافتہ طبقے میں بالخصوص ایران کے متعلق جب بھی گفتگو ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی تشیع پر بھی گفتگو ہوتی ہے اور یوں ایران اور تشیع دونوں ایک دوسرے کی پہچان بن چکے ہیں اور آج مصر کا ہر تعلیم یافتہ اور باشعور شخص اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ ایران اور تشیع ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں اور ان کا باہمی

۱۔ وزارت داخلہ کا خیال تھا کہ اسلامی جماعتوں کی پشت پناہی ایران کر رہا ہے لیکن تحقیقات کے نتیجے میں یہ بات غلط ثابت ہوئی۔ تفصیلات کے لئے میری کتاب ''مصر و ایران'' کا مطالعہ فرمائیں۔

اتصال نہ صرف مصر کے مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے امید کی کرن ہے اور جب بھی شیعہ اصول و عقائد کی بحث ہوتی ہے تو اسکے ساتھ ایران کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔

اللہ تعالٰی کی مدد سے ہم مصر کے باشعور افراد کے اذہان سے ایران کے متعلق شکوک و شبہات ختم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔[1]

ایک دانشور کی یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا، اس نے مجھ سے کہا تھا کہ خدا کے لئے آپ ہماری معذرت قبول فرمائیں کیونکہ ہمیں ایران کے متعلق صحیح معلومات نہیں تھیں اور ہم نے آج تک ایران کی مخالفت میں باتیں سنی تھیں اور ہم آج تک لاؤڈ اسپیکروں سے ایران مخالف پروپیگنڈہ ہی سنتے رہے تھے۔

اہلبیت طاہرینؑ کی برکت سے آج مصر میں تشیع کی دعوت کو فروغ مل رہا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی مدد اور اہلبیتؑ کی برکت ہمارے شامل حال نہ ہوتی تو ہمیں یہ ترقی اور فروغ کبھی نصیب نہ ہوتا کیونکہ یہاں مصر میں تشیع کے فروغ کے لئے کوئی موثر شخصیت موجود نہیں ہے اور اس کے ساتھ تشیع کے لٹریچر کی بھی بڑی کمی ہے۔ ہمیں سال میں ایک بار قاہرہ کے بین الاقوامی کتاب میلے میں اپنی کتابوں کی نمائش کا موقع ملتا ہے اور وہی کتاب میلہ مکتب تشیع کی تبلیغ کے لئے ایک روزن کا کام دے رہا ہے۔

شیعہ انجمن کی تشکیل

مصر میں تشیع کی دعوت اور پیش رفت کے لئے ایک انجمن کی ضرورت ہمیں شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ ہم نے انجمن کی تجویز پیش کی جسے تمام شیعوں نے سراہا۔ پھر اس کے بعد ہم نے اس کی تشکیل کے لئے ضروری اقدامات کیے۔[2]

ہم نے انجمن کی تشکیل کے وقت مصر کے تمام معروضی حالات کا جائزہ لیا جس میں

۱۔ مجھے کئی بار ایران جانے اور شیعوں کی مختلف شخصیات سے گفتگو کرنے کا موقع ملا جس سے میرے فکری سرمائے میں اضافہ ہوا اور اس کی وجہ سے میں مصر کے اہل علم دوستوں کو ایران کا حقیقی چہرہ دکھانے میں کامیاب ہوا۔

۲۔ مصر کے کثیر الاشاعت روزنامہ ''الیوسف'' نے ہماری انجمن کی تشکیل کی خبر کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ یہ اخبار اس سے پہلے بھی تشیع کے متعلق خبریں شائع کرتا رہا ہے اور یہ سب کچھ ہمارے رابطے کی بدولت ممکن ہوا۔

اہل مصر اور حکومت مصر کا شیعوں سے رویہ جیسے مسائل کو مدنظر رکھ کر ہم نے اپنی انجمن کے لئے حسب ذیل مقاصد و اہداف کا اعلان کیا اور ہم نے اجتماعی امور کو سرفہرست جگہ دی:

۱۔ یہ انجمن مصر کے تمام صوبوں میں رہنے والے شیعوں کی نمائندہ انجمن ہوگی اور حکومتی اور غیر حکومتی معاملات میں اس کا موقف تمام شیعوں کا موقف تصور کیا جائے گا۔
۲۔ یہ انجمن مومنین سے رابطے کا کام دے گی اور ان کے اجتماعی مسائل میں ان سے تعاون کرے گی۔
۳۔ یہ انجمن مساجد اور مذہبی مراکز قائم کرے گی۔
۴۔ یہ انجمن ایک اخبار کا اجرا کرے گی جس میں انجمن کا نکتۂ نظر بیان کیا جائے گا۔
۵۔ یہ انجمن عمومی لائبریریاں قائم کرے گی۔
۶۔ یہ انجمن اسلامی تہوار منائے گی۔
۷۔ یہ انجمن خمس و زکوۃ کے فنڈ کا ایک شعبہ قائم کرے گی۔
۸۔ یہ انجمن مکتب اہلبیتؑ کے فروغ کے لئے کتابیں شائع کرے گی تاکہ لوگوں کو مسلک اہلبیتؑ کی پہچان کرائی جاسکے۔
۹۔ یہ انجمن شیعہ حجاج اور زائرین کے لئے ایک شعبہ قائم کرے گی۔

ہم نے انجمن کے مقاصد کو اجتماعی امور تک محدود رکھا اور انجمن کے مقاصد میں سیاست کے شعبے کو کوئی جگہ نہ دی۔ ایسی انجمن اہل مصر کی نفسیات کے عین مطابق ہے اور کسی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

ایک بار پھر مجھے انتہائی افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ پورے مصر میں جہاں کسی نے ہماری انجمن اور اس کے اغراض و مقاصد کی مخالفت نہیں کی وہاں کچھ شیعوں نے انجمن کی تشکیل پر اعتراض اٹھائے اور ہم اس سلسلے میں انہیں معذور قرار دیتے ہیں کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اہل مصر کی نفسیات یہی ہے کہ وہ چپ چاپ اور غیر متحرک قسم کی زندگی بسر کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر کچھ شیعہ احباب نے انجمن کی تشکیل پر تنقید کی ہے تو اس کی وجہ بھی ان کی گوشہ نشینی اور لوگوں سے دوری کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس وقت مصری شیعوں میں بہت سے دولت مند افراد بھی موجود ہیں جو اگر چاہیں تو تشیع کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں اور دعوت تشیع کے لئے مالی امداد دے کر مذہب تشیع کی ترقی و فروغ کا ذریعہ بن سکتے ہیں لیکن ہمیں ان کی حالت پر انتہائی افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے آج تک مذہب کی ترقی کے لئے کچھ نہیں کیا اور ان کی لاپروائی دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسا کہ ان کا تشیع سے کوئی واسطہ تک نہ ہو۔ ان لوگوں کے متعلق بھی ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ مصری نفسیات کے تحت ایسا کر رہے ہیں۔

میں اس خاموشی اور جمود کو کسی طرح سے بھی پسند نہیں کرتا کیونکہ میں خاموشی اختیار کر کے اپنی کئی سالوں پر محیط زحمات کو تباہ کرنے کا خواہش مند نہیں ہوں اور سنی جماعتوں کے ساتھ کام کر کے میں نے جو تبلیغی تجربہ حاصل کیا ہے اس تجربے کو ختم کرنے کا قائل نہیں ہوں اور میں ساحل کے کنارے کھڑا ہو کر کشتی کو ڈوبتے ہوئے دیکھنے کا ہرگز عادی نہیں ہوں۔ میں دور سے نظارہ کرنے کی بجائے کام کرنے کا خواہش مند ہوں۔

اپنی اسی عادت سے مجبور ہو کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جہاں تک مجھ سے ممکن ہوگا کتب تشیع کی تالیف و تصنیف کروں گا اور پورے خلوص کے ساتھ مذہب اہلبیتؑ کی تبلیغ کروں گا اور مذہب اہلبیتؑ کا دفاع کرتا رہوں گا اور مذہب اہلبیتؑ کے خلاف معاندانہ قسم کے خس و خاشاک کو دور کرتا رہوں گا اور پوری کوشش کر کے مومنین کی غیرت و حمیت کو بیدار کروں گا تاکہ وہ بھی میرے ساتھ مل کر اس مقدس دعوت کو عام کریں اور مذہب اہلبیتؑ کی تبلیغ کریں۔[۱]

۱۔ کویت کے قبضے کے دوران ہم نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام حرکة آل البيت فی مصر ہے۔ اس کے بعد ہماری کتاب الشيعة فی مصر شائع ہوئی اور پھر ہماری کتاب عقائد السنة و عقائد الشيعة منظر عام پر آئی۔ موخر الذکر کتاب میں شیعہ اور سنی عقائد کا موازنہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہماری بہت سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

قرآن

قرآن مجید کی بہت سی آیات نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈالا لیکن جب میں نے کتب تفسیر کی طرف رجوع کیا تو مجھے ان کا کوئی تسلی بخش حل دکھائی نہ دیا۔ ان آیات میں اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًاo کی آیت سرفہرست تھی اور جب میں نے یہ دیکھا کہ اس آیت کو ازواج پیغمبر کی آیات میں جگہ دی گئی ہے تو میرے تعجب کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اور اس ترتیب کا مقصد یہ دکھائی دیا کہ لوگوں نے اہلبیتؑ کی حقیقت کو چھپانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور آیت تطہیر کا سیاق و سباق اہلسنت کے اس نظریے کو تقویت دیتا ہے کہ ازواج رسول اہلبیتؑ کا حصہ تھیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آیت تطہیر کا خطاب ازواج سے ہے اور خدا نے ان سے ہر طرح کے رجس کو دور رکھا ہے تو پھر سورۂ تحریم میں کچھ ازواج رسول کو طلاق کی دھمکی کیوں دی گئی ہے؟ سورۂ تحریم کی آیات اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ اہلبیت تطہیر سے ازواج مراد نہیں ہیں۔ وہ کوئی اور افراد ہیں جن کی طہارت کی خدا نے گواہی دی ہے۔

اس حقیقت کے دریافت ہوتے ہی قرآن مجید کی ترتیب و تدوین کے متعلق میرے ذہن میں بہت سے خدشات نے سر اٹھایا کیونکہ آیت تطہیر کے سیاق و سباق کو دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ کچھ لوگوں نے اس سیاق و سباق سے مقام اہلبیتؑ کو چھپانے کی دانستہ کوشش کی ہے۔

اہلسنت ہمیشہ اسی طرح کی تفسیر کرتے ہیں اور اہلبیتؑ سے مخصوص آیات کی من مانی تفسیر کرتے ہیں اور جب میں نے تاریخ قرآن کی تحقیق کی تو کتب تسنن کے خلاف میرے شکوک و شبہات میں مزید اضافہ ہوا۔ ہماری تحقیق کا خلاصہ یہ ہے:

جمع قرآن

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد سے لے کر حضرت عثمانؓ کے عہد تک صحابہ کے پاس بہت سے قرآن مجید موجود تھے۔ نہ تو کسی صحابی نے ان پر اعتراض کیا اور نہ ہی حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے ان پر کوئی تنقید کی۔ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے اپنے جمع کردہ قرآن کے علاوہ قرآن مجید کے باقی تمام نسخوں کو جلانے کا حکم صادر کیا۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر حضرت عثمانؓ کو کون سی مجبوری لاحق تھی جس کی وجہ سے انہوں نے ایسا کیا اور کیا ان کے اس عمل سے تمام اختلافات کا خاتمہ ہوگیا اور امت کو وحدت نصیب ہوگئی؟

اگر ہم اس بات کو تسلیم کرلیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ حضرت عثمانؓ تمام اختلافات کے موجد تھے جبکہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے اس طرح کی کسی فعالیت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا لیکن اس امر کا اشارہ کچھ دوسرے مسائل کی طرف ہے۔

اہلسنت کے ہاں یہ بات مشہور ہے کہ حضرت عثمانؓ نے مسلمانوں کو ایک قرأت پر متحد کیا تھا اور دوسری قرأتوں کو ممنوع قرار دیا تھا۔

یہ توجیہ و تفسیر یقیناً نامکمل ہے کیونکہ اہلسنت کی صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلسنت قرآن مجید کی سات قرأتوں کو قبول کرتے تھے اور آج بھی اہلسنت کا ساتوں قرأتوں پر ایمان ہے لہٰذا اگر بات یہیں تک محدود ہوتی اور حضرت عثمانؓ نے ایک کے علاوہ باقی قرأتوں کو ممنوع قرار دے کر امت کو ایک قرأت پر مجبور کر دیا تھا تو وہ قرأتیں بعد میں زندہ کیسے رہیں اور ممانعت کے باوجود آج تک باقی کیوں ہیں اور کیا حضرت عثمانؓ نے باقی قرأتوں کو ممنوع قرار دے کر حکم رسولؐ کی تو نافرمانی نہیں کی کیونکہ آنحضرتؐ کا فرمان ہے: ''قرآن سات حرفوں (قرأتوں) پر نازل ہوا ہے۔ تم جس طرح سے چاہو قرآن پڑھو۔'' (صحیح بخاری، ج۶، ص۲۸۸، کتاب فضائل القرآن، باب انزل القرآن علی سبعۃ احرف)

قرأتوں کے متعلق ایک اور اعتراض پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر رسول خداؐ نے

امت کو سات قرأتوں کے مطابق قرآن پڑھنے کی اجازت دی ہوتی تو یہ اس بات کا اعلان ہوتا کہ سات قرأتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے جبکہ ان میں اختلاف موجود ہے۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ قرأتوں کا مسئلہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس کے متعلق کوئی نص وارد نہیں ہوئی۔ سچی بات یہ ہے کہ قرأتوں کے متعلق مروی احادیث کے اسناد اور متن میں بہت زیادہ شک پایا جاتا ہے اور اہل تفسیر میں آج تک اس بات پر اختلاف ہے کہ یہ قرأتیں توفیقی ہیں یا اختیاری ہیں اور مفسرین کا یہ اختلاف اس بات کی دلیل ہے کہ اس سلسلے میں کوئی نص موجود نہیں ہے۔ (فتح الباری، شرح صحیح بخاری، ج۹، ص۲۳)

مذکورہ حقائق کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرأتوں کا مسئلہ اتنا زیادہ اہم نہیں تھا جس کی وجہ سے حضرت عثمانؓ کو قرآن جلانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ اس کے پس منظر میں کوئی سبب کارفرما تھا۔ اس شبہ نے مجھے ازسرنو تاریخ قرآن پڑھنے پر مجبور کردیا کیونکہ روایات میں یہ بات کہی گئی ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو قرآن مجید کی جمع آوری پر مجبور کیا تھا۔

بخاری لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا: جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظ قرآن شہید ہوچکے ہیں اور مجھے یہ خطرہ ہے کہ کسی دوسری جنگ میں بھی حفاظ اسی طرح سے قتل ہوسکتے ہیں اور حفاظ کے چلے جانے سے قرآن کی آیات چلی جائیں گی۔ لہٰذا میں آپ کو یہ تجویز دیتا ہوں کہ آپ فرمان جاری کرکے قرآن کو جمع کریں۔

حضرت ابوبکرؓ نے کہا: میں ایسا کام کیسے کرسکتا ہوں جسے رسول خداؐ نے نہیں کیا تھا۔

حضرت عمرؓ نے کہا: خدا کی قسم! یہ اچھا کام ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ عمر مسلسل اس بات پر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے اس کام کے لئے میرے دل کو کھول دیا اور میں نے عمر کے خیال سے اتفاق کیا۔ (صحیح بخاری، ج۶، ص۲۲۵۔ کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن)

اس روایت سے درج ذیل نتیجہ برآمد ہوتا ہے:

۱۔ رسول خداؐ نے اپنی زندگی میں قرآن مجید جمع نہیں کیا تھا اور جب آپ نے رحلت فرمائی تو اس وقت قرآن مجید لوگوں کے سینوں میں موجود تھا۔

۲۔ جنگ یمامہ کی وجہ سے قرآن مجید کے ختم ہونے کا خدشہ پیدا ہوا تھا۔

۳۔ حضرت ابوبکرؓ اس کام کو کرنے پر تیار نہیں تھے۔

۴۔ حضرت عمرؓ نے انہیں اس ضرورت کا احساس دلایا۔

۵۔ حضرت ابوبکرؓ یہ کہہ کر قرآن جمع نہیں کرنا چاہتے تھے کہ رسول خداؐ نے جمع نہیں کرایا۔

۶۔ حضرت عمرؓ کا اصرار جاری رہا۔

درج بالا تمام نکات کا خلاصہ یہی ہے کہ نعوذباللہ رسول خداؐ نے اپنی ذمہ داری کو صحیح طریقے سے انجام نہیں دیا تھا اور آپ قرآن کو غیر مرتب حالت میں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے تھے جس کی وجہ سے چند ماہ بعد قرآن کے ضائع ہونے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔

ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ رسول خداؐ کے متعلق اس طرح کا عقیدہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ نعوذباللہ آپ اپنے فریضۂ نبوت میں کوتاہی کے مرتکب ہوئے تھے اور جب ہم دوسری روایات کا مطالعہ کرتے ہیں تو زبان رسولؐ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن مجید آپ کی زندگی میں مرتب و مدون ہوچکا تھا اور آپ کے پاس کاتبین وحی موجود رہتے تھے جن میں حضرت علیؑ بھی شامل تھے۔ علاوہ ازیں رسول خداؐ سے بہت سی ایسی احادیث مروی ہیں جن میں آپ نے اپنی امت کو قرآن سے وابستگی اور قرآن کی تلاوت کا حکم دیا۔[1]

اگر قرآن عہد نبوی میں جمع ہی نہیں ہوا تھا تو آپ نے لوگوں کو قرآن سے وابستگی کی ترغیب کیوں دی؟ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول خداؐ نے جمع قرآن کے متعلق ہرگز کوتاہی نہیں کی تھی بلکہ بجائے اس کے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن مجید پہلے سے ہی مرتب حالت میں موجود تھا تو حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کو اس کی ترتیب نو کا خیال کیوں آیا اور جنگ

۱۔ رسول اکرمؐ نے بہت سی احادیث میں تلاوت قرآن کی ترغیب دی اور ایک مشہور حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جس نے خود قرآن پڑھا اور دوسروں کو پڑھایا۔ اسی طرح سے آپ نے ابن عمر سے کہا تھا کہ تم کتنے روز میں قرآن ختم کرتے ہو؟ قرآن مجید کی تلاوت کی تاکید کے لئے حدیث ثقلین انی تارک فیکم کتاب اللہ و عترتی اھل بیتی کی طرف رجوع فرمائیں۔ عہد نبوی میں جمع و تدوین قرآن کے لئے آیت اللہ خوئی علیہ الرحمہ کی البیان فی تفسیر القرآن کا مطالعہ فرمائیں۔

یمامہ کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے ترتیب قرآن کی تجویز کیوں دی؟

بخاری کی روایت بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی تجویز کے باوجود حضرت ابوبکرؓ اس کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرف سے جمع قرآن کی جو تجویز تھی اس کا کوئی دوسرا مقصد تھا۔ اگر اس سے قرآن کی حفاظت ہی مقصود ہوتی تو حضرت ابوبکرؓ ایک لمحے کی بھی دیر نہ کرتے اور یوں حضرت عمرؓ کو اصرار کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ جمع قرآن کا مقصد کچھ اور تھا اور یہ بات بھی ہرگز معقول دکھائی نہیں دیتی کہ حضرت ابوبکرؓ، زید بن ثابت کو بلا کر اس سے کہیں کہ "تو عقل مند شخص ہے اور تجھ پر کوئی تہمت بھی نہیں ہے اور عہد نبوی میں تیرا تعلق کاتبین وحی سے رہا ہے لہٰذا تو قرآن مجید جمع کرنے کی کوشش کر۔"

زید بن ثابت نے کہا: میں نے لیف خرما اور جانوروں کی کھالوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن جمع کیا یہاں تک کہ سورۂ توبہ کی آخری آیات کو ابوخزیمہ انصاری کے پاس پایا۔ اس کے علاوہ وہ آیات کسی اور کے پاس نہیں تھیں۔ اس طرح سے قرآن کا ایک نسخہ مرتب ہوا جو کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہا یہاں تک کہ ان کی وفات ہوئی۔ پھر وہ نسخہ حضرت عمرؓ کے پاس رہا۔ حضرت عمرؓ کے بعد وہ نسخہ ام المومنین حفصہ بنت عمر کے پاس رہا۔ (صحیح بخاری، ج ۶، ص ۲۲۵۔ کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن)

قرآن مجید کی اس طرح جمع آوری شکوک و شبہات کو جنم دیتی ہے کیونکہ اس صورت میں بعض آیات کا لکھنے سے رہ جانا اور بعض آیات کی ترتیب بدل جانے کا اندیشہ موجود تھا کیونکہ ایک عام انسان نے اسے جمع کیا اسی لئے ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ زید بن ثابت آیات کی صحت کے اثبات کے لئے دو گواہ طلب کرتے تھے۔ (فتح الباری، ج ۹، کتاب فضائل القرآن)

جمع قرآن کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ جمع قرآن کی تمام تر ذمہ داری فرد واحد زید بن ثابت کو سونپی گئی۔

۲۔ قران کریم کی آیات لیف خرما، جانوروں کی کھالوں اور لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھیں (اس لئے زید کو قرآن جمع کرنے کے لئے بڑی زحمت اٹھانا پڑی)۔

۳۔ سورۂ توبہ کی آخری آیات صرف ایک صحابی ابوخزیمہ کے پاس تھیں۔

۴۔ جب قرآن مجید جمع ہوگیا تو جمع شدہ نسخہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس رکھا گیا۔ ان کے بعد وہی نسخہ حضرت عمرؓ کے پاس رہا۔ پھر وہی نسخہ جناب حفصہ بنت عمر کے پاس رکھا گیا۔

اس مقام پر چند سوالات جنم لیتے ہیں:

۱۔ کیا زید بن ثابت جیسے نوجوان کو جمع قرآن کی عظیم ذمہ داری دینا کافی تھا؟

۲۔ حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عمرؓ نے خود یہ ذمہ داری قبول کیوں نہ کی؟

۳۔ یہ بیان کرنے کا آخر مقصد کیا ہے کہ سورۂ توبہ کی آخری آیات ابوخزیمہ کے پاس تھیں اور کیا اس سے یہ معنی مراد لیا جائے کہ آیات قرآن کو اصحاب میں تقسیم کردیا گیا تھا اسی لئے ہر صحابی کے پاس جدا جدا آیات تھیں؟

۴۔ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے پاس کیا قرآن مجید کی کوئی آیات نہیں تھیں؟

۵۔ جمع آوری کے بعد قرآن مجید کا نسخہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس ہی کیوں رہا اور انہوں نے امت اسلامیہ کے سامنے اسے پیش کیوں نہ کیا؟

۶۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی پالیسی کو کیوں بحال رکھا؟

۷۔ کیا جناب حفصہ بنت عمر کے پاس قرآن کا نسخہ رکھوانے میں کوئی خاص مصلحت تھی؟

۸۔ قرآن مجید کی جمع آوری میں حضرت علیؑ کا کردار کیا تھا اور اس سلسلے میں ان کے کردار کو یکسر فراموش کیوں کیا گیا جبکہ حضرت علیؑ کا تعلق کاتبین وحی سے تھا؟

جمع قرآن کی مذکورہ روایات کو مدنظر رکھا جائے تو انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جمع قرآن کے نام پر جو کوشش کی گئی تھی اس کا مقصد قرآن کی حفاظت کے علاوہ کچھ اور تھا کیونکہ اس وقت تک قرآن مجید منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ (جیسا کہ روایت میں مذکور ہے) اور اسی روایت کا عجیب پہلو یہ ہے کہ سرکاری ہدایت پر بڑی تگ و دو کے بعد قرآن مجید جمع کیا گیا اور اس وقت مسلمانوں کے پاس قرآن کا کوئی نسخہ موجود ہی نہیں تھا مگر جمع شدہ نسخہ حضرت ابوبکرؓ کی تحویل میں دے دیا گیا اور کسی مسلمان کو اس سے استفادہ نہ کرنے دیا گیا۔

اگر ایسے ہی حالات ہوتے جیسا کہ روایت میں کہا گیا ہے تو مسلمان حضرت ابوبکرؓ

سے شدید احتجاج کرتے کہ آپ نے قرآن کا نسخہ اپنی تحویل میں کیوں رکھا ہے جبکہ ہمیں اپنی رہنمائی کے لئے قرآن کی شدید ضرورت ہے مگر تاریخ میں ہمیں ایسے کسی احتجاج کا سراغ نہیں ملتا اور احتجاج نہ کرنے کی وجہ بھی سورج کی طرح سے ظاہر ہے۔ مسلمانوں نے اس لئے احتجاج نہیں کیا تھا کیونکہ لوگوں میں قرآن موجود تھا اور بعض اصحاب کے پاس کامل شکل میں محفوظ تھا۔

حالات و قرائن سے پتا چلتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے قرآن مجید کو ایک خصوصی انداز و ترتیب سے جمع کرایا تھا اور حضرت عثمانؓ کے عہد حکومت میں اس کا اظہار کیا گیا تھا۔ فقہائے اہلسنت کا بیان ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے قرآن جمع کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے اُمّ المومنین حفصہ کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ جمع شدہ قرآن کے تمام صفحات ان کے پاس روانہ کریں، جسے انہوں نے بھی قبول کیا۔ (صحیح بخاری، ج ۶، ص ۲۲۶۔ فتح الباری، ج ۹ ص ۱۵)

ایک اور روایت میں مذکور ہے کہ ابتدا میں حضرت حفصہ نے حضرت عثمانؓ کے فرمان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر انہوں نے اس شرط پر وہ نسخہ دینے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا کہ عثمانؓ اسے نقل کر کے اصل نسخہ انہیں لوٹا دیں گے۔ (تاریخ القرآن، مؤلفہ زنجانی، ص ۳۷ و عبدالصبور شاہین)

سوال یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے بی بی حفصہ کا نسخہ ہی طلب کیوں کیا تھا؟ اور کیا اس وقت پورے مدینے میں کسی اور کے پاس کوئی نسخہ موجود نہیں تھا؟ اگر اس وقت صرف ایک ہی نسخہ تھا تو باقی اسلامی صوبوں اور شہروں میں قرآن مجید کے نسخے کہاں سے آ گئے تھے؟ حضرت حفصہ کو یہ شرط عائد کرنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ حضرت عثمانؓ نقل کرنے کے بعد اصل نسخہ انہیں لوٹا دیں گے۔

اس وقت دوسرے شہروں میں بھی قرآن مجید کے نسخے موجود تھے اور وہ نسخے مدینے سے ہی ان شہروں کو منتقل ہوئے تھے۔ اس وقت بہت سے اصحاب کے پاس قرآن مجید کے نسخے موجود تھے جو انہوں نے رسول خداؐ کی زبان سے سن کر مرتب کئے تھے اور یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ اس وقت حضرت حفصہ کے نسخہ کے علاوہ اور بھی نسخے موجود تھے مگر حضرت عثمانؓ نے صرف حضرت حفصہ کے نسخہ کو ہی طلب کیا تھا اور جب حضرت عثمانؓ

حضرت حفصہ کے قرآن کو نقل کرا چکے تو انہوں نے اصل نسخہ حضرت حفصہ کے پاس بھیج دیا اور حکم جاری کیا کہ اس قرآن کی نقول تیار کی جائیں اور اس کے علاوہ قرآن مجید کے دوسرے نسخوں کو جلا دیا جائے۔ (فتح الباری، ج ۹، ص ۱۶۔۱۷۔ صحیح بخاری، ج ۶، ص ۲۲۶)

حضرت عثمانؓ نے اس طرح سے امت کو ایک قرآن پر جمع کیا اور یہ قرآن مجید کا وہی نسخہ تھا جسے حضرت ابوبکرؓ کے حکم پر جمع کیا گیا تھا اور اس کے علاوہ صحابہ کرام کے باقی نسخوں کو جلا کر ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کو قرآن جلانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمیں صحابہ کرام کے قرآنی نسخوں کا جائزہ لینا ہوگا۔

صحابہ کے قرآنی نسخے

حضرت علیؑ کے پاس قرآن مجید کا مکمل نسخہ موجود تھا۔ ابی بن کعب، ابن عباس اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کے پاس بھی قرآن مجید کے مکمل نسخے موجود تھے۔

یہ حضرت عثمانؓ کے عہد کے مشہور نسخے تھے۔ حضرت علیؑ کے قرآن مجید کا نسخہ ترتیب نزول کے مطابق تھا اور وہ سورۂ اقرأ سے شروع ہوتا تھا۔ حضرت کے قرآنی نسخے کی سات منازل تھیں جن کی ترتیب اس طرح سے تھی:

اول	سورۂ بقرہ سے سورۂ بینہ تک
دوم	سورۂ آل عمران سے سورۂ قریش تک
سوم	سورۂ نساء سے سورۂ نحل تک
چہارم	سورۂ مائدہ سے سورۂ کافرون تک
پنجم	سورۂ انعام سے سورۂ تکاثر تک
ششم	سورۂ اعراف سے سورۂ نصر تک
ہفتم	سورۂ انفال سے معوذتین تک

ابی بن کعبؓ کا نسخہ سورۂ فاتحہ سے شروع ہوتا تھا اور سورۂ والناس پر ختم ہوتا تھا مگر اس

کی ایک سو پانچ سورتوں کی ترتیب موجودہ ترتیب سے مختلف تھی۔ ابن مسعودؓ کا قرآن ایک سو آٹھ سورتوں پر مشتمل تھا اور اس میں سورۂ فاتحہ اور معوذتین شامل نہیں تھیں۔ ابن عباسؓ کا قرآنی نسخہ سورۂ اقرأ سے شروع ہوتا تھا اور وہ ایک سو چودہ سورتوں پر مشتمل تھا۔

قرآن مجید کے ان نسخوں سے مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا کیونکہ مذکورہ اصحاب نے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق انہیں ترتیب دیا تھا اور ان سب نے رسول خداؐ سے قرآن مجید پڑھا تھا۔

حضرت عثمانؓ کو وہ نسخے اس لئے ناپسند تھے کہ ان کے حاشیہ پر بہت سی قرآنی آیات کی تفسیر لکھی ہوئی تھی جس سے آیات کو سمجھنے میں مدد ملتی تھی جبکہ مصحف حفصہ میں کوئی تفسیر نہیں تھی اور اس کی سورتوں کی ترتیب دوسرے نسخوں سے مختلف تھی۔

حضرت عثمانؓ نے مصحف حفصہ کو رائج کیا جس میں کسی طرح کی تفسیر نہیں تھی اور اس طرح سے فہم قرآن میں مشکلات پیدا ہوئیں اور نصوص کے مفہوم میں اختلاف نے جنم لیا جس سے مختلف مذاہب اور فرقے وجود میں آئے۔

حضرت عثمانؓ کے بہی خواہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک قرآن رائج کر کے مسلمانوں کی وحدت کا تحفظ کیا لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ان کا ہدف پورا نہ ہوا بلکہ اس سے مزید اختلافات پیدا ہوئے اور عہد عثمانی میں ابن مسعودؓ سمیت بہت سے صحابہ نے حضرت عثمانؓ کے اس اقدام کی مخالفت کی اور انہوں نے ان کے مرتب کردہ قرآن کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا[1]

بخاری نقل کرتے ہیں: ایک دن عبداللہ ابن مسعودؓ خطبہ دے رہے تھے اور انہوں نے اپنے خطبے کے درمیان کہا کہ خدا کی قسم! میں نے ستر سے کچھ زیادہ سورتیں رسول خداؐ سے براہ راست حاصل کی تھیں۔ خدا کی قسم! اصحاب پیغمبر کو معلوم ہے اگرچہ میں ان میں سے افضل نہیں ہوں پھر بھی ان سب سے قرآن مجید کا زیادہ علم رکھتا ہوں۔

---

[1] فتح الباری، ج۹، ص۳۸، باب القراء من اصحاب النبی۔ صحابہ کرام حضرت عثمانؓ کو قرآن جلانے والے کے نام سے یاد کرتے تھے۔

شقیق (راوی) کہتا ہے کہ میں مجمع میں بیٹھ کر اس بات کا انتظار کرتا رہا کہ کوئی اس کی تردید کرے گا لیکن کسی نے بھی اس کی تردید نہیں کی۔ (صحیح بخاری، ج۶، ص۲۲۹، کتاب فضائل القرآن، باب القراء من اصحاب النبی)

دوسری روایت میں ابن مسعودؓ سے یہ الفاظ منقول ہیں: اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! میں سب لوگوں سے زیادہ آیات کے شان نزول کو جانتا ہوں اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ کتاب خدا کو جانتا ہے تو میں زحمت برداشت کر کے اپنے آپ کو اس کے پاس پہنچاتا اور اس سے استفادہ کرتا۔ (صحیح بخاری، ج۶، ص۲۳۰)

عبداللہ ابن مسعودؓ نے یہ خطبہ حضرت عثمانؓ کی طرف سے ترتیب قرآن کے بعد کوفے میں دیا تھا اور بھرے مجمع میں سے کوئی شخص بھی ان کی تردید نہ کر سکا۔

ہمیں اس حقیقت کا علم ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے عہد میں ابن مسعودؓ کو قرآن کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا تھا اس لئے ہم ان کی تنقید کی گہرائی سے واقف ہو سکتے ہیں۔ ابن مسعودؓ درحقیقت لوگوں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ معاملہ صرف قرأت تک محدود نہیں ہے جیسا کہ حضرت عثمانؓ کے بہی خواہ اس کا اظہار کر رہے ہیں۔

اس مطلب کی مزید وضاحت کیلئے ہم ابن مسعودؓ کی دوسری روایات نقل کرتے ہیں۔

ابوداؤد اور نسائی نقل کرتے ہیں کہ ایک دن عبداللہ ابن مسعودؓ نے اپنے خطبے میں کہا: تم لوگ اپنے قرآن چھپا دو، تم لوگ مجھے زید بن ثابت کی قرأت کے مطابق قرآن پڑھنے کا حکم کس طرح سے دے سکتے ہو جبکہ میں نے رسول خداؐ کی زبانی قرآن سنا تھا۔

ابن حجر کہتے ہیں کہ جب یہ حکم صادر ہوا کہ قرآن مجید کو تبدیل کیا جا رہا ہے تو عبداللہ ابن مسعودؓ کو سخت غصہ آیا اور انہوں نے کہا: ''تم میں سے جو قرآن چھپا سکتا ہے وہ چھپا لے۔ میں نے جو کچھ رسول خداؐ سے سنا تھا کیا اسے چھوڑ دوں؟'' دوسری روایت میں ابن مسعودؓ سے مذکور ہے: ''میں تو اپنا قرآن چھپا رہا ہوں اور تم میں سے جو ایسا کر سکتا ہو وہ ضرور کرے۔'' ایک اور روایت میں ابن مسعودؓ سے منقول ہے: ''خدا کی قسم میں اپنا قرآن عثمانؓ کے سپرد نہیں کروں گا۔ یہ قرآن میرے سامنے رسول خداؐ نے پڑھا تھا۔''

ان تمام روایات سے عبداللہ ابن مسعودؓ کا مقصد یہ ہے کہ اصحاب کو چاہئے کہ وہ اپنے قرآن چھپالیں تا کہ حضرت عثمانؓ انہیں نذر آتش نہ کرسکیں۔

علمائے اہلسنت نے عوام کو دھوکہ دینے کے لئے اپنی طرف سے کچھ روایات بنائی ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ ابن مسعودؓ پہلے تو حضرت عثمانؓ کے اس کام کے خلاف تھے لیکن بعد میں انہوں نے حضرت عثمانؓ سے اتفاق کرلیا تھا۔ بعض سنی فقہاء نے کہا کہ ابن مسعودؓ حافظ قرآن نہیں تھے اور اس وقت کئی لوگ ان سے بڑے عالم تھے اسی لئے ابن مسعودؓ کی گفتگو پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

ابن حجر نے کہا: جب حضرت عثمانؓ کا مرتب کردہ قرآن کوفہ پہنچا تو ابن مسعودؓ نے اپنی قرأت کو نہ چھوڑا اور وہ اپنے قرآن کو جلانے پر راضی نہ ہوئے۔ ان کے قرآن کا موجودہ قرآن سے فرق تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ کا جمع کردہ قرآن دوسرے سب نسخوں سے مناسب ترین ہے۔ (فتح الباری، ج۹، ص۳۲)

(ہمیں ابن حجر پر حیرت ہوتی ہے کہ) انہوں نے یہ فیصلہ کیسے کردیا کہ حضرت عثمانؓ کا قرآن باقی تمام نسخوں سے مناسب ترین ہے؟

بخاری لکھتے ہیں: ایک شخص عراق سے حضرت عائشہؓ کے پاس آیا اور اس نے کہا: ام المومنین! آپ اپنا قرآن مجھے دکھائیں۔

بی بی نے پوچھا: کیوں؟

اس نے کہا: میں اس کی نقل تیار کرنا چاہتا ہوں کیونکہ جو قرآن (عراق میں) موجود ہے وہ مرتب نہیں ہے۔

بی بی نے کہا: تو آیات پڑھنے سے تمہیں کیا نقصان ہوتا ہے؟ قرآن مجید کی بہت سی آیات مکہ میں نازل ہوئی تھیں اور اس وقت میں انتہائی کمسن تھی۔ پھر بی بی اپنا قرآن لائیں اور سورتوں کی آیات اسے پڑھ کر سنائیں۔ (بخاری، ج۶/ ۲۲۸، باب تالیف القرآن)

اس روایت کا مقصد ابن مسعودؓ کے مصحف کی اہمیت گھٹانا ہے کیونکہ ایک شخص عراق (ابن مسعودؓ کے علاقے) سے آتا ہے اور عراق میں موجود مصحف کے بارے میں شک کرتا ہے

اور بی بی سے کہتا ہے کہ آپ مجھے اپنا مصحف دکھائیں تا کہ میں اس کی نقل تیار کرسکوں۔

اس روایت میں اشارتاً یہ بتایا گیا ہے کہ ابن مسعودؓ کا قرآن غیر مرتب تھا۔ اگر ہم بخاری کی اس روایت کو مان لیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ بی بی حفصہ کے قرآن کے علاوہ اُس وقت بی بی عائشہ کے پاس بھی ایک قرآن تھا اور اس سے حضرت عثمانؓ پر یہ الزام آتا ہے کہ انہوں نے ترتیب قرآن کے وقت بی بی حفصہ کے علاوہ کسی دوسرے کے قرآن سے استفادہ نہیں کیا تھا اور حد یہ ہے کہ انہوں نے بی بی عائشہؓ کے قرآن پر بھی اعتماد نہیں کیا تھا اور آج تک یہ بات کبھی سننے میں نہیں آئی کہ دوسرے قرآنی نسخوں کے ساتھ بی بی عائشہ کا نسخۂ قرآن بھی جلادیا گیا ہو۔

بخاری کہتے ہیں: ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ کیا پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد کوئی چیز چھوڑ کر بھی گئے؟

انہوں نے کہا: رسول خداؐ دو جلدوں کے بیچ موجود خدا کی کتاب چھوڑ کر گئے۔

محمد بن حنفیہؒ سے یہی سوال پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو جلدوں کے بیچ موجود خدا کی کتاب چھوڑ گئے۔ (صحیح بخاری، ج۶، ص۲۳۴۔ باب من قال لم یترک النبی الا مابین الدفتین)

اس روایت پر ابن حجر نے جو حاشیہ لکھا ہے اسے ہم من وعن آپ کی نذر کرتے ہیں:

"ان روایات کا مقصد یہ نہیں ہے کہ رسول خداؐ قرآن کو دو جلدوں کے بیچ مرتب کر کے اس جہان سے رخصت ہوئے تھے کیونکہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے قرآن جمع کیا تھا پھر حضرت عثمانؓ نے قرآن جمع کیا۔

بخاری کی یہ روایات ان لوگوں کی تردید کرتی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ حفاظ کی موت کی وجہ سے بہت سا قرآن ضائع ہوگیا تھا۔ یہ باتیں روافض کی ساختہ پرداختہ ہیں اور رافضی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کی امامت پر نص فرمائی تھی اور حضرت علیؑ کی جانشینی سب پر ثابت ہوچکی تھی مگر صحابہ نے اسے چھپا لیا تھا۔

ایسے افراد کا جواب یہ ہے کہ ان کا دعویٰ باطل ہے کیونکہ اگر صحابہ کرام حضرت علیؑ

کے فضائل چھپانے والے ہوتے تو آج "انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ" اور اس جیسی دوسری احادیث موجود نہ ہوتیں۔ آج بھی شیعہ ان احادیث سے حضرت علیؑ کی خلافت کا استدلال کرتے ہیں۔ اسی طرح سے صحابہ نے ایسی احادیث کو نہ چھپایا جو اس کی معارض تھیں یا اس کے عموم کی تخصیص کرتی تھیں یا اس کے مطلق کو مقید قرار دیتی تھیں۔

مؤلف کتاب (بخاری) نے روافض کے نظریے کی تردید کے لئے علی ابن ابی طالبؑ کے فرزند محمد حنفیہؒ سے روایت کی ہے اور محمد بن حنفیہؒ ان کے ائمہ میں سے ایک امام ہیں اور روافض اس کی امامت کا دعویٰ کرتے ہیں، اگر ان کے والد سے کوئی چیز مربوط ہوتی تو انہیں زیادہ خبر ہونی چاہئے تھی اور اسی طرح سے دوسری روایت ابن عباسؓ سے لی گئی اور ابن عباسؓ حضرت علیؑ کے چچازاد بھائی تھے اور ابن عباسؓ تمام لوگوں کی بہ نسبت حضرت علیؑ کے زیادہ قریب رہے تھے اور وہ ان کے حالات سے زیادہ باخبر تھے اور حضرت علیؑ سے ایک روایت مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ صرف کتاب خدا ہے اور جو کچھ اس میں لکھا ہوا ہے وہ کتاب خدا ہی ہے۔

حضرت علیؑ کا یہ قول ہمارے موقف کی نفی نہیں کرتا کیونکہ اس سے حضرت علیؑ نے دراصل یہ کہا ہے کہ ان کے پاس جو احکام لکھے ہوئے ہیں انہوں نے وہ احکام رسول خداؐ سے نقل کئے تھے اور اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ ان کے پاس احکام کے دوسرے نانوشتہ مسائل بھی موجود ہیں۔

ابن عباسؓ اور محمد بن حنفیہؒ کے جوابات کا مقصد یہی ہے کہ جس قرآن کی تلاوت کی جارہی ہے اس میں سے مسئلہ امامت کو حذف نہیں کیا گیا۔ اس مطلب کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ ہمارے بہت سے اصحاب اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن مجید کی کچھ آیات نازل ہوئی تھیں پھر ان کی تلاوت منسوخ کردی گئی اور ان کا حکم باقی رکھا گیا جیسا کہ ابن عمرؓ سے آیت رجم منقول ہے: **الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة.** یعنی بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت جب زنا کریں تو ان کو سنگسار کردو۔

اسی طرح سے بیر معونہ کے شہید قاریوں کے متعلق انس بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

نے ان کے متعلق ان کی زبانی یہ آیت نازل فرمائی تھی: **بلغوا عنا قومنا انا قد لقینا ربنا.** یعنی ہماری قوم تک ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ ہم نے اپنے رب سے ملاقات کی ہے۔

ابی بن کعب سے منقول ہے کہ سورۂ احزاب، سورۂ بقرہ جتنی لمبی ہوا کرتی تھی۔

حضرت حذیفہؓ سے منقول ہے کہ اس وقت سورۂ توبہ کا ایک چوتھائی حصہ باقی رہ گیا ہے۔

یہ تمام احادیث صحیح ہیں! ابن الغریس نے ابن عمرؓ سے نقل کیا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ انہیں یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ کوئی شخص دعویٰ کرے کہ اس نے پورے قرآن کو پڑھ لیا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ قرآن کا ایک حصہ موجود نہیں ہے۔ یہ روایت بھی ہمارے موضوع بحث روایت کی معارض نہیں ہے کیونکہ رسول خداؐ کی زندگی میں یہ تمام آیات منسوخ ہوگئی تھیں۔''
(فتح الباری، ج۹، ص۵۴)

ابن حجر کی اس طویل گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ:

۱۔ ابن حجر نے اپنی طویل بحث سے نص کو جھٹلانے کی کوشش کی ہے اور توجیہ و تاویل کر کے لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ وہ عہد نبوی میں قرآن مجید کے مرتب ہونے کا خیال دل سے نکال دیں۔ کیونکہ اگر انہوں نے بخاری کی اس روایت کے تحت یہ مان لیا کہ رسول اکرمؐ دو جلدوں کے بیچ قرآن چھوڑ کر گئے تھے تو اسی سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ کی جمع قرآن کی روایات کو دھچکا لگے گا۔

۲۔ ابن حجر نقل کرتے ہیں کہ مصحف ابوبکر سے پہلے بھی مصحف موجود تھے۔

۳۔ ابن حجر یہ چاہتے ہیں کہ نص کے مفہوم کو کھینچ تان کر حضرت ابوبکرؓ کا کارنامہ بتایا جائے۔ وہ اپنی پوری بحث کے دوران نص کی اتباع پر راضی دکھائی نہیں دیتے۔

۴۔ ابن حجر نے یہ لکھ کر کہ "یہ جواب ان لوگوں کی تردید کرتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حفاظ کی موت سے بہت سا قرآن ضائع ہوگیا۔" خود ہی اپنے قول کی تردید کی ہے۔

اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ مخالفین کا یہ اعتراض لغو ہے کیونکہ قرآن مجید پہلے سے ہی مدون اور مرتب تھا اور حفاظ کی موت سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑا اور ابن حجر کی تضاد بیانی کی انتہا یہ ہے کہ ایک طرف سے تو انہوں نے یہ الفاظ لکھے اور دوسری طرف سے یہ ثابت کرنے کے

لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا کہ حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے قرآن جمع ہوا تھا۔

۵۔ بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسی آیات بھی نازل ہوئی تھیں جو موجودہ قرآن میں نہیں ہیں۔

۶۔ ابن حجر نے جو شیعوں کو رافضی کہہ کر پکارتا ہے لکھا ہے کہ ''شیعہ یہ دعوی کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں امامت علیؑ پر بہت سی آیات موجود تھیں جنہیں صحابہ نے چھپا دیا تھا۔'' حقیت یہ ہے کہ شیعوں نے کبھی ایسا دعویٰ کیا ہی نہیں۔

۷۔ اہلسنت اگر فضائل اہلبیتؑ اور بالخصوص فضائل علیؑ چھپانے والے ہوتے تو حضرت علیؑ کے فضائل کی روایات کو چھپا لیتے اور یوں شیعہ استدلال کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی۔

(یہ ابن حجر کا صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے، اہلسنت سے جہاں تک ممکن ہوا انہوں نے فضائل علیؑ کو چھپایا) اہلسنت نے جن احادیث کو نہیں چھپایا تو بھی تاویل وتوجیہ کے ذریعے سے لوگوں کو ان احادیث کے حقیقی مفہوم کے نزدیک نہ جانے دیا۔

۸۔ ابن عباسؓ اور محمد بن حنفیہؒ کے اقوال کو حجت بنا کر شیعوں کے خلاف پیش کرنے میں کوئی وزن نہیں ہے کیونکہ علمائے اہلسنت اتنے جری ہیں کہ انہوں نے تو حضرت علیؑ کی زبانی روایات تراشنے سے گریز نہیں کیا۔ بھلا ان کے سامنے ابن عباسؓ اور محمد ابن حنفیہؒ کی حیثیت ہی کیا تھی؟

علمائے اہلسنت کی جسارت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ انہوں نے حضرت علیؑ کی زبانی روایات بنا کر شیعیان علیؑ کی مذمت کی اور دشمنان علیؑ کی تعریف کی۔ اسی لئے روایات کی تحقیق ہونی چاہئے۔

۹۔ ابن حجر کی جہالت یہاں سے واضح ہوتی ہے کہ اس نے کہا محمد بن حنفیہؒ شیعوں کا امام ہے، جبکہ شیعوں نے ابن حنفیہؒ کو کبھی اپنا امام نہیں کہا۔

۱۰۔ ابن حجر نے حضرت علیؑ کے فرمان کے مفہوم میں بھی تحریف کی ہے اور اُس نے حضرت علیؑ کے اس فرمان کو نقل کیا ہے ماعندنا الا کتاب اللّٰہ. ہمارے پاس صرف اللہ کی کتاب ہے۔ پھر اس نے کہا کہ اس سے مراد صرف وہ احکام ہیں جو

رسول اکرمؐ سے وارد ہیں۔

ان الفاظ سے ابن حجر نے درحقیقت یہ کہا ہے کہ حضرت علیؑ نے رسول اکرمؐ کی زبان مبارک سے سن کر سارا قرآن نہیں لکھا تھا انہوں نے صرف ''آیات احکام'' کو نقل کیا تھا۔

۱۱۔ ابن حجر نے ابن حنفیہؒ اور ابن عباسؓ کے جوابات کو صرف قرآن مجید کی اس مقدار سے مخصوص کرنے کی کوشش کی جس کی تلاوت کی جا رہی ہے۔ یا اس نے اسے صرف آیات امامت کی نفی تک محدود رکھا۔

اس طرح ابن حجر نے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ محمد ابن حنفیہؒ اور ابن عباسؓ نے اپنے ہاں سے کامل قرآن کی نفی کی تھی۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ رسول اکرمؐ ان کے پاس چند آیات چھوڑ کر رحلت فرما گئے تھے۔

۱۲۔ ابن حجر نے کہا کہ منسوخ شدہ آیات کے متعلق روایات صحیحہ موجود ہیں لیکن یہ صرف اس کا ذاتی دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔

کیا ایک روایت کئی آیات کی ناسخ بن سکتی ہے اور کیا ایسا ممکن بھی ہے؟ اور اگر اسے دوسرے الفاظ میں بیان کریں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کیا احادیث کو قرآن پر فوقیت دی جا سکتی ہے؟

جی ہاں! (مسلک اہلسنت میں یہ سب کچھ جائز ہے) انہوں نے تمام امور کو الٹا کر پیش کیا ہے اور انہوں نے ایسے مسائل بیان کئے ہیں جو نہ تو شریعت کے مطابق ہیں اور نہ ہی عقل ان کی تائید کرتی ہے۔ ان لوگوں کی نظر میں روایات — قرآن پر مقدم ہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ روایت — آیت کو ختم کر سکتی ہے اور روایت — آیت کے حکم کو منسوخ کر سکتی ہے اور روایت — تلاوت آیت کو منسوخ کر کے اس کا حکم باقی رکھ سکتی ہے۔

اہلسنت میں ایسی بہت سی روایات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی بعض سورتوں میں کچھ آیات کی کمی ہے جیسا کہ ابن حجر نے بیان کیا ہے (اس سلسلے میں ہم اپنا موقف واضح کرنا چاہتے ہیں کہ) ایسی تمام روایات ٹھکرانے کے قابل ہیں اور ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ابن حجر نے یہاں ایک نکتے کو فراموش کیا ہے کیونکہ ابن عباسؓ، ابن حنفیہؒ اور حضرت

علیؑ سے سوال کرنے والوں نے پوچھا کہ پیغمبر اکرمؐ اپنے بعد کیا ترکہ چھوڑ کر گئے تھے؟ اور اس کے جواب میں تینوں بزرگوں نے کہا کہ پیغمبر اکرمؐ دو جلدوں کے بیچ قرآن چھوڑ کر گئے تھے۔

اصل میں سائل کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ کیا پیغمبر اکرمؐ قرآن کے علاوہ بھی ان کے پاس کوئی چیز چھوڑ گئے تھے یا نہیں؟

سائل اسی حقیقت کو جاننے کا خواہش مند تھا اور یہ سوال اچانک بھی پیدا نہیں ہوا تھا (اس کے پس منظر میں بہت سے واقعات وحقائق موجود ہیں)

ابن عباسؓ اور ابن حنفیہؒ کے جوابات سے ایک بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے پاس قرآن مجید کے مرتب کردہ نسخے موجود تھے اور دونوں شخصیات کا یہ جواب ابن حجر اور اس کے ہم نوا افراد کی مکمل تردید کرتا ہے جبکہ ابن حجر اتنی روایات کی موجودگی میں ترتیب قرآن کا سہرا حضرت ابوبکرؓ کے سر باندھنے کی سرتوڑ کوشش میں مصروف رہے۔

آخر میں ہم اپنے کرم فرماؤں سے ایک بار پھر یہ پوچھتے ہیں کہ آخر کیا وجہ تھی کہ حضرت عثمانؓ نے قرآن مجید کے اُن نسخوں سے استفادہ کیوں نہ کیا اور حضرت علیؑ کے مصحف کی طرف توجہ کیوں نہ فرمائی؟

ترتیب قرآن

سابقہ بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مصحف عثمانؓ صحابہ کرام کے دوسرے صحیفوں سے جدا ہے۔ تمام اصحاب نے بالعموم اور ابن مسعودؓ نے بالخصوص اس سلسلے میں حضرت عثمانؓ کی مخالفت کی تھی اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ حضرت علیؑ نے بھی مخالفت کی ہو۔ مگر کتب اہلسنت میں ایسی کسی مخالفت کا کہیں تذکرہ موجود نہیں ہے اور اس کی بجائے کتب اہلسنت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ نے حضرت عثمانؓ سے تعاون کیا تھا اور جمع قرآن کے لئے انہوں نے حضرت عثمانؓ کی تعریف کی تھی۔[1]

فطری بات ہے کہ اہلسنت قرآن مجید کے متعلق حضرت علیؑ اور حضرت عثمانؓ کے

۱۔ اہلسنت نے حضرت علیؑ کی زبانی نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر میں عثمانؓ کی جگہ ہوتا تو میں بھی قرآن کے متعلق وہی کچھ کرتا جو عثمانؓ نے کیا ہے۔ دیکھئے تاریخ قرآن۔

درمیان اختلاف کے ذکر کے روادار نہیں ہیں کیونکہ اس میں نہ تو حضرت عثمانؓ کا کوئی فائدہ ہے، نہ ہی ان کے مرتب کردہ قرآن کا کوئی فائدہ ہے، نہ ہی اس طرز حکومت کا کوئی فائدہ ہے جسے رسول اکرمؐ کے بعد عوام پر مسلط کیا گیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ صحابہ کے مصاحف میں سورتوں کی ترتیب کا فرق تھا اسی لئے ہم ذیل میں اس عنوان پر بحث کرنا چاہتے ہیں کہ کیا سورتوں کی ترتیب توقیفی یعنی وحی کے فرمان کے تحت تھی یا اختیاری تھی؟

اس سے قبل ہم حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کر چکے ہیں کہ انہوں نے ایک عراقی کے جواب میں کہا تھا کہ اگر تم ہر آیت کو پڑھو تو اس میں تمہارا کیا نقصان ہے؟

بی بی عائشہؓ کی اس وضاحت میں اشارہ موجود ہے کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی نہیں بلکہ اختیاری ہے۔

ابن حجر نے ابن بطال کا قول نقل کیا ہے اس نے کہا: مجھے کسی ایسے شخص کا علم نہیں ہے جو نماز یا نماز کے علاوہ قرأت قرآن کے لئے سورتوں کی ترتیب کو واجب سمجھتا ہو۔ (فتح الباری، ج۹، ص۳۲۔ باب تالیف القرآن)

ابن حجر کا کہنا ہے کہ سورتوں کی ترتیب اختیاری ہے اور اس کے متعلق رسول اکرمؐ نے کوئی فرمان صادر نہیں کیا تھا۔

یہ قول عموم اہلسنت کا ہے اور قاضی باقلانی نے بھی اس قول کو قبول کرتے ہوئے کہا: سورتوں کی ترتیب واجب نہیں ہے۔ خواہ نماز ہو یا درس وتدریس ہو یا تعلیم قرآن ہو اور مصاحف میں بھی یہی اختلاف تھا اور جب مصحف عثمانؓ لکھا گیا تو اسے موجودہ ترتیب سے جمع کیا گیا۔ (فتح الباری، ج۹، ص۳۲۔ باب تالیف القرآن)

اسی طرح سے قاضی باقلانی سے ایک دوسرا قول بھی منقول ہے کہ اس نے کہا: اس بات کا احتمال ہے کہ رسول اکرمؐ نے قرآن مجید کو اسی ترتیب کے مطابق مرتب کیا ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ صحابہ کا اجتہاد ہو لیکن پہلا احتمال زیادہ قوی ہے۔ (فتح الباری، ج۹، ص۳۲)

ابن حجر لکھتے ہیں: امکان ہے کہ سورتوں کی ایک دوسرے سے ترتیب یا زیادہ تر

سورتوں کی ترتیب توقیفی ہو اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض سورتوں کی ترتیب کچھ اصحاب کے اجتہاد کی مرہون منت ہو۔ (فتح الباری، ج۹، ص۳۴)

احمد بن حنبل، نسائی، ترمذی اور حاکم نے ابن عباسؓ سے نقل کیا کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ سے کہا: سورۂ انفال کا تعلق "مثانی" سے ہے اور سورۂ برأت کا تعلق "مبین" سے ہے۔ اس کے باوجود تم نے دونوں کو ایک دوسرے سے متصل کیوں کیا اور ان کے درمیان سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ختم کر کے سات طولانی سورتوں کی صف میں کیوں لاکھڑا کیا؟

حضرت عثمانؓ نے کہا: رسول اکرمؐ پر بہت سی ایسی سورتیں نازل ہوتی تھیں جن کی آیات کی تعداد مقرر ہوتی تھی۔ جب ان سورتوں میں سے کبھی کوئی آیات نازل ہوتی تھیں تو رسول اکرمؐ لکھنے والوں کو حکم دیتے تھے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں لکھو اور ہجرت مدینہ کے بعد جو سورتیں پہلے پہل نازل ہوئی تھیں ان سورتوں میں سورۂ انفال بھی شامل تھی اور سورۂ برأت قرآن کے آخر میں تھی اور اس کا انداز سورۂ انفال جیسا تھا۔ اس وجہ سے میں نے یہ خیال کیا کہ یہ بھی اسی سورت کا ایک حصہ ہے اور رسول اکرمؐ جب دنیا سے رخصت ہوئے تو انہوں نے اس بارے میں ہمیں کچھ نہیں فرمایا تھا۔ (فتح الباری، ج۹، ص۳۴)

اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے ابن حجر نے لکھا:

یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی تھی اور سورۂ توبہ کے متعلق پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے کوئی وضاحت موجود نہیں تھی اسی لئے حضرت عثمانؓ نے اجتہاد کرتے ہوئے اسے سورۂ انفال کے ساتھ شامل کر دیا تھا۔ (فتح الباری، ج۹، ص۳۵)

اس روایت میں یہ کہا گیا ہے کہ رسول اکرمؐ ہر آیت کے متعلق خود ہدایت دیا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں لکھو۔

اس روایت کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے قرآن مجید اپنی ہی رہنمائی میں مرتب کرادیا تھا اور آپ نے قرآن مجید جمع کرایا اور اسے ترتیب دلایا تھا۔ اس کے بعد آپ کی وفات واقع ہوئی تھی۔ ان حالات میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب رسول اکرمؐ نے اپنی ہی زیرنگرانی قرآن مجید کو مدون و مرتب کرادیا تھا تو حضرت ابوبکرؓ و حضورت عثمانؓ نے

قرآن کی کون سی خدمت کی تھی؟ اور اس جملے کا کیا مفہوم رہ جاتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے اپنی وفات تک سورۂ توبہ کے متعلق کوئی ہدایت جاری نہیں کی تھی اسی لئے میں نے اسے سورۂ انفال کے ساتھ شامل کر دیا؟

اسی سرگردانی کی وجہ سے ابن حجر نے دو متضاد موقف اپنائے کیونکہ ایک طرف سے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ترتیب قرآن توقیفی ہے یعنی خدا کی طرف سے ہے اور رسول اکرمؐ نے ترتیب کے متعلق ہدایات جاری کی تھیں۔ دوسری طرف سے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے اجتہاد سے سورۂ توبہ کو سورۂ انفال کے ساتھ متصل کیا تھا۔

ابن حجر کا یہ موقف ان کے پہلے موقف کے بالکل برعکس ہے اور اس طرح سے انہوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ پر قرآن میں مداخلت کا الزام عائد کیا ہے اور بالواسطہ طور پر یہ کہا ہے کہ انہوں نے اپنے عمل سے رسول اکرمؐ کی مخالفت کی تھی کیونکہ سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے اختیاری نہیں ہے اور جب سورتوں کی ترتیب اختیاری نہیں ہے تو حضرت عثمانؓ نے اپنا اختیار کیوں استعمال کیا تھا اور اپنی طرف سے ترتیب کیوں دی تھی؟

جب ترتیب قرآن توقیفی ہے تو حضرت عثمانؓ کے پاس ترتیب دینے کا کوئی اختیار نہیں رہتا اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کا عمل تحریف قرآن کے زمرے میں شمار کیا جائے گا اور کسی کو ان کے ساتھ تعاون کی جرأت بھی نہیں ہونی چاہئے تھی۔

بخاری لکھتے ہیں کہ حضرت جبرئیل امینؑ ہر سال ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قرآن مجید دہرایا کرتے تھے اور جس سال آنحضرتؐ کی وفات ہوئی تو اس سال انہوں نے آپ کے ساتھ دو مرتبہ قرآن مجید دہرایا تھا۔ (صحیح بخاری، ج۶، ص۲۲۹۔ باب کان جبرئیل یعرض القرآن علی النبی)

بخاری کی یہ روایت اہلسنت کے نظریے کو باطل ثابت کرتی ہے اور یہ روایت ہم سے دو امور میں سے ایک کے انتخاب کا تقاضا کرتی ہے۔

۱۔ یا تو ہم حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ کی حمایت کریں اور مصحف عثمانی کو قبول کریں۔

۲۔ یا پھر قرآن مجید کی ترتیب کو توقیفی سمجھتے ہوئے مذکورہ بزرگوں کی ترتیب کی نفی کریں

اور یوں مصحف عثمانی کو رد کردیں۔

کیونکہ بخاری کی یہ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ جبرئیل امینؑ اور رسول اکرمؐ دونوں قرآن مجید کی آیات کی ترتیب کو بے حد اہمیت دیتے تھے اور آپؐ کی رحلت تک یہ اہمیت قائم رہی۔ اسی لئے کسی دوسرے کو اس میں مداخلت کا حق نہیں پہنچتا کیونکہ قرآن عہد رسولؐ میں ہی کامل ہوچکا تھا اور اس میں کسی طرح کی کمی بیشی کی گنجائش نہیں تھی۔ آج کا انسان حقیقت کا متلاشی ہے مگر علمائے اہلسنت حقیقت کو چھپانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے اپنی زندگی میں ہی قرآن مجید کو مدون اور مرتب کر دیا تھا۔ پھر آپ نے قرآن مجید کا ترتیب شدہ نسخہ اپنے ایک ایسے صحابی کے پاس رکھ دیا تھا جو اس کی حفاظت کی مکمل طاقت رکھتا تھا اور لوگوں تک قرآن مجید پہنچانے کی صلاحیت سے بھی مالا مال تھا۔

مذکورہ صفات حضرت علیؑ کے علاوہ کسی دوسرے صحابی میں موجود نہیں تھیں۔ جیسے ہی میں اس حقیقت کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوا تو اس وقت مجھے اس رشتے کو بھی سمجھنے میں دیر نہ لگی جو آنحضرتؐ نے قرآن وعترت میں قائم کیا تھا۔ قرآن وعترت کا باہمی رابطہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن صرف اہلبیتؑ کے پاس ہے۔ لہذا اگر کسی مسلمان کے ذہن سے عترت کا نظریہ نکل جائے تو اس کے ذہن سے حقیقت قرآن بھی نکل جائے گی اور وہ متضاد روایات کی وجہ سے شکوک وشبہات کے بھنور میں پھنس جائے گا۔

اگر حضرت عثمانؓ کے مرتب کردہ قرآن میں نظریہ اہلبیتؑ موجود ہوتا تو بنی امیہ، اہلبیتؑ کو دور رکھنے اور لوگوں کو اہلبیتؑ سے جدا کرنے اور علوم اہلبیتؑ کے چھپانے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے اور ایسی روایات کا کہیں وجود نہ ہوتا جو قرآن کو پس پشت ڈالنے اور حکام کی غیر مشروط تائید کی ترغیب دیتی ہیں اور آج مسلمانوں اور اہلبیتؑ میں یہ جدائی نظر نہ آتی۔ اگر خط اہلبیتؑ واضح صورت میں موجود ہوتا تو بنی امیہ کی حکومت کو سند جواز فراہم کرنے والے اور ان کی سفاک اور ظالم حکومت کو سہارا دینے والے فقہاء کہیں دکھائی نہ دیتے۔

قرآن مجید کو تفسیر رسولؐ سے علیحدہ کیا گیا، پھر اس کو حضرت عثمانؓ کی دلپسند ترتیب کے مطابق مرتب کیا گیا جس کی وجہ سے قرآن مجید بنی امیہ اور ان کے بعد آنے والے حکام کا

مضبوط سہارا بن گیا۔ لہذا اگر مصحف عثمانی نہ ہوتا تو دنیا میں بنی امیہ کی حکومت کا کہیں نام ونشان تک نہ ہوتا اور اموی نظریہ لوگوں کا حاکم قرار نہیں پاسکتا تھا۔

حضرت عثمانؓ کی طرف سے جمع قرآن کا مقصد صرف یہی تھا کہ کہیں قرآنِ اہلبیتؑ منظر عام پر نہ آجائے اور کہیں صحابہ قرآنِ اہلبیتؑ کی نقول تیار کر کے اسے امت میں پھیلا نہ دیں۔ چنانچہ مسلمانوں کو اہلبیتؑ سے دور رکھنے کے لئے مصحف عثمانی کو منظر عام پر لایا گیا۔

توضیح مترجم (فارسی)

وہ نکتہ جس کا متن میں سمونا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ یہی قرآن، قرآن کامل ہے اور اس میں کسی طرح کی تحریف واقع نہیں ہوئی ہے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کتاب مقدس کی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے: **اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ.**

"بے شک قرآن کو نازل کرنے والے ہم ہیں اور اس کی حفاظت کرنے والے بھی ہم ہیں۔"

قرآن مجید میں کوئی کمی بیشی نہیں ہے اور فاضل مؤلف کا مقصد بھی تفسیر اہلبیتؑ ہی ہے اور وہ تفسیر اہلبیتؑ اس وقت متروک ہوچکی ہے اور رسول اکرمؐ نے اہلبیتؑ کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ قرآن سے جدا نہیں ہوں گے۔ اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ اہلبیتؑ کو بطور مفسر تسلیم کیا جائے کیونکہ **اهل البيت ادرى بما في البيت.** "گھر والے گھر کے متعلق بہتر جانتے ہیں۔"

اگر تحریف دکھائی دیتی ہے تو اہلسنت کی کتابوں میں دکھائی دیتی ہے جن میں سے کچھ روایات آپ نے اس باب میں ملاحظہ فرمائی ہیں۔ اس کے علاوہ کتب اہلسنت میں بہت سی آیات لکھی ہوئی ہیں جن کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ انہیں قرآن مجید سے حذف کیا گیا ہے۔

لیکن شیعہ قرآن مجید کے متعلق یہ عقیدہ نہیں رکھتے۔ قرآن مجید کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی بھی باطل کسی بھی راستے سے قرآن میں ہرگز داخل نہیں ہوسکتا۔ **لاياتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه.**

حرف آخر

سنیت کے دوران جس فکری سرگردانی نے میرا احاطہ کیا ہوا تھا اور وہ سرگردانی مجھ سے اسی عقیدہ پر باقی رہنے کا تقاضا کرتی تھی اور اس دوران میں چاہتا تھا کہ چند ایسے قواعد کا استنباط ہوسکے جن سے مسلمان حق کو آسانی سے پہچان سکیں اور متن نصوص اور شخصیات کی آرا اور دین اور میراث میں فرق کرسکیں۔

چنانچہ بفضلہٖ تعالیٰ میں ان قواعد وضوابط کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا اور کتاب ہذا میں ان قواعد وضوابط پر تفصیلی بحث کرچکا ہوں۔ آخر میں بطور خلاصہ ان قواعد کو بیان کرنا چاہتا ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے مستفید ہوسکیں اور وہ قواعد واصول حسب ذیل ہیں:

۱۔ حق قرآن میں منحصر ہے۔

۲۔ احادیث نبویؐ کو قرآن کے مطابق ہونا چاہئے۔

۳۔ رسول اکرمؐ کا کردار، گفتار اور رفتار ہمیشہ صحیح اور قرآن کے مطابق تھی۔

۴۔ حضرت علیؑ معیار حق ہیں۔

۵۔ ''میراث'' نص کے بعد وجود میں آئی ہے۔

۶۔ نص شخصیات سے بالاتر ہے۔

۷۔ حق کی پہچان نص سے ہوتی ہے۔

۸۔ نص کو عقل کے ذریعے سے قبول کرنا شرعاً واجب ہے۔

۹۔ تمام اصحاب عادل نہیں تھے۔

۱۰۔ قرآن ہی اسلام کی اساس اور بنیاد ہے اور قرآن وہ واحد سرچشمہ ہے جس میں کسی

طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور باطل کسی بھی بہانے سے قرآن میں داخل نہیں ہوسکتا۔

۱۱۔ احادیث نبویؐ کو اسی حق کے ترازو پر تولنا چاہئے۔

۱۲۔ انسان کو یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ رسول اکرمؐ کا کام دین کی تبلیغ اور احکام کا بیان کرنا تھا۔ آپ دین میں اضافہ کرنے اور قرآن کی مخالفت کے مجاز نہیں تھے۔

۱۳۔ حضرت علیؑ اور اہلبیت ایک چنا ہوا گروہ ہے جنہیں امامت اور رسول اکرمؐ کے بعد امت کی رہبری کے لئے چنا گیا ہے۔

۱۴۔ مسلمان کو — دین و میراث — اور نص و شخصیات — کے درمیان فرق کرنا چاہئے اور لوگوں کو حق کے ذریعے پہچاننا چاہئے اور تمام اصحاب کی عدالت و تقدس کا نظریہ باطل ہے۔

یہ تمام امور حق تک پہنچنے کے لئے ایک مقدمے کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس مقدمے کے بغیر مسلمان صحیح راستے پر نہیں چل سکتا اور اس کے بغیر انسان شخصیات کے اقوال کا معتقد ہوجاتا ہے اور ''میراث'' کی زنجیروں میں رہن بستہ ہو کر رہ جاتا ہے اور رائے کو نص پر مقدم سمجھنے لگ جاتا ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت زار اسی گمراہی کی گواہ ہے۔ آج کا مسلمان اسلام کے نام پر پھیلائے جانے والے غیر اسلامی نظریات کے سائے میں زندگی بسر کر رہا ہے اور یہی غلط طرز تفکر مختلف قسم کے باطل نظریات اور گروہوں کی پیدائش کا سبب ہے اور اسی غلط طرز تفکر نے مسلمانوں کی صفوں میں ہمیشہ کے لئے تفرقہ پیدا کیا ہے اور ان ہی غلط نظریات وتصورات کی وجہ سے مسلمان ہر شعبۂ زندگی میں پسماندہ ہو کر رہ گئے ہیں اور اگر آج مسلمانوں کو کج فہم اور نادان سمجھا جاتا ہے تو اس کی وجہ شخصیات کے اقوال کو اہمیت دینا اور نصوص ومتون سے گریز ہے۔

کتابیات

ارشاد الساری لشرح صحیح بخاری. دار احیاء التراث العربی. بیروت لبنان.
تاریخ عمر بن الخطاب (ابن جوزی) دار احیاء علوم الدین. دمشق شام.
صحیح مسلم بشرح النووی. دار احیاء التراث العربی. بیروت لبنان.
الاصابة فی تمییز الصحابه. دار احیاء التراث العربی. بیروت لبنان.
الجامع الصحیح (ترمذی) دار احیاء التراث العربی. بیروت لبنان.
تاریخ الخلفاء (سیوطی). مطبعة الفجالة الجدیدة. قاهره مصر.
شرح العقیدة الواسطیة. دارالهجرة. الریاض العربیه السعودیه.
الدرر الکامنة فی اعیان المائة الثامنة. دارالجیل. بیروت لبنان.
تاریخ مدینة دمشق (ابن عساکر) دارالفکر. بیروت لبنان.
تذکرة الحفاظ. دار احیاء التراث العربی. بیروت لبنان.
تلخیص المستدرک (ذهبی) دارالمعرفة. بیروت لبنان.
صحیح البخاری. دار احیاء التراث العربی. بیروت لبنان.
صحیح مسلم. دار احیاء التراث العربی. بیروت لبنان.
فتح الباری. دار احیاء التراث العربی. بیروت لبنان.
الملل والنحل. منشورات الرضی. قم. طبع دوم ایران.
سنن ابی داؤد. دار احیاء التراث العربی. بیروت لبنان.

تاریخ قرآن. (زنجانی) سازمان تبلیغات اسلامی ایران.
البدایة والنهایة (ابن کثیر) دارالفکر. بیروت لبنان.
شرح العقیدة الطحاویة. دارالفکر. بیروت لبنان.
موطا مالک. دار احیاء التراث العربی بیروت لبنان.
میزان الاعتدال (ذهبی) دارالمعرفة. بیروت لبنان.
وفیات الاعیان (ابن خلکان) دارصادر. بیروت لبنان.
تاریخ الطبری. دار سویدان. بیروت لبنان.
مسند احمد. دارالفکر بیروت لبنان.

کنزالعمال. مؤسسة الرسالة. بیروت لبنان.
مستدرک حاکم. دارالمعرفة. بیروت لبنان.
فتاویٰ ابن تیمیة. العربیه السعودیه.
سنن ابن ماجه. دارالفکر. بیروت لبنان.
تهذیب التهذیب. دارصادر. بیروت لبنان.
خصائص النسائی. مکتبة المعلا. الکویت
السیف والسیاسة. دارالحسام. قاهره مصر.
طبقات ابن سعد. دارصادر. دار بیروت لبنان.

اللہم صل علی محمد و آل محمد

التماس سورۃ الفاتحہ

سیدہ فاطمہ رضوی بنت سید حسن رضوی
سید مظاہر نقوی ابن سید محمد نقوی
سید شہرت بلگرامی ابن سید حسن رضوی
سید الطاف حسین ابن سید محمد علی
سیدہ امِ حبیبہ بیگم و دیگر مرحومین

طالب دعا: سید حسن علی نقوی